قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2024 قیمت ₹25

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

چنار اردو کتاب میلہ 2024

adidas

اردو دنیا

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:10، اکتوبر 2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

کشمیر کتاب میلہ

- چنار اردو کتاب میلہ/ چنار پستک مہوتسو 2024 ادارہ 7

زبان اور زمینی صورت حال

- اردو زبان میں دلوں کو فتح کرنے کی طاقت آج بھی ہے شمیم طارق 14

ادبی مباحث

- مضمون اور اس کا فن سیدہ جعفر 17
- آندھرا پردیش میں دکنی تحقیق اور تدریس ستار ساحر 21
- اردو شاعری میں رامائن اور گیتا کے اساطیر سرفراز جاوید 24
- بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی یاسمین رشیدی 26
- چریہ پد: بودھ سادھوؤں کی شعری روایت سہیل ارشد 31
- تاریخ گوئی: فن، اصول اور روایت عبدالقوی 34

شخصیات

- عبدالرحیم خانخاناں کی تعمیری وادبی خدمات عارف انصاری 38

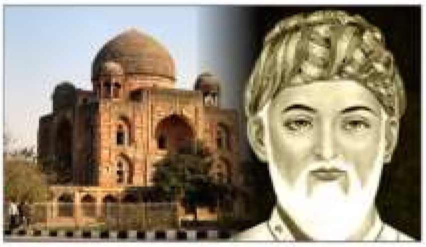

- محمود ایاز کی نظمیہ شاعری منظور احمد دکنی 41
- نیر مسعود کے افسانوں کی انفرادیت آصفہ زینب 43

تاریخ

- تاریخ تمدن ہند محمد مجیب 47

تہذیب

- گپت عہد میں تہذیب وتمدن اور نئی طاقتوں کا عروج سید یحییٰ حسن نقوی 51

دکنیات

- دکنی ہندو اور اردو نصیر الدین ہاشمی 54

سماجیات

- سماجی شعور: تعارف، اہمیت وافادیت عرفان امین گنائی 59

معاشیات

- قدیم بھارت کا عظیم سیاست داں اور ماہر معاشیات: کوٹلیہ مقبول احمد مقبول 61

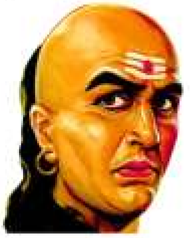

عالمی ادبیات

- ابن قتیبہ کا تصور ادب محمد شہباز عالم 64

نیا آسماں نئے ستارے

- اردو زبان وادب پر فارسی کے اثرات علی زاہد ملک 66

کتابوں کی دنیا

- تعارف وتبصرہ ادارہ 69

خبر نامہ

- اردو دنیا کی خبریں ادارہ 84

ہماری بات

کتابیں ذہنی اور فکری واخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، خاص طور پر نئی نسل کی رہنمائی میں کتابوں کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کتابوں سے جن کا تعلق ہوتا ہے یا جو کتابوں سے رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو ان کی زندگی ہزاروں تجربات اور مشاہدات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جو لوگ کتاب نہیں پڑھتے وہ صرف اپنی زندگی جیتے ہیں۔ مطالعہ کرنے والا نہ صرف متنوع تہذیبوں/ ثقافتوں اور مختلف جہانوں کی سیر کرتا ہے بلکہ اپنے مشاہدات، محسوسات اور مطالعات کی بنیاد پر اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے علم، ہنر اور تربیت ضروری ہے اور ان تینوں چیزوں کے حصول میں کتابیں اہم کردار ادا کرتی ہیں کہ علوم وفنون کا خاصا ذخیرہ کتابوں میں ہی محفوظ ہے۔ اس لیے آج کے زمانے میں کتاب کلچر کو فروغ دینے کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قارئین کی تعداد بڑھانے کی بھی اور یہ تعداد اسی وقت بڑھ سکتی ہے جب ایسے رہنما اصول بروئے کار لائے جائیں جن سے کتب بینی کے ساتھ قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ ممکن ہو۔ نئے قارئین پیدا کرنے اور بڑھانے کے لیے سب سے پہلے تو بچوں، نوجوانوں اور خواتین میں پڑھنے کا ماحول ومزاج بنانا ہوگا، اس کے لیے ان کی نفسیات، ترجیحات، ذوق وشوق اور ضرورتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔ اس میں مصنفین کے ساتھ ساتھ کتابوں کے ناشرین کو بھی محنت کرنی ہوگی اور جائزہ لینا ہوگا کہ قارئین کے مسائل، ان کی ضرورتیں اور دلچسپیاں کیا ہیں؟ جب تک قارئین کی ذہنی اور نفسیاتی سطح کو سامنے رکھ کر کتابیں تحریر نہیں کی جائیں گی، کتابوں سے قارئین کا رشتہ قائم نہیں ہو پائے گا۔ قاری کے مطلوبہ مواد اور ان کی ترغیبات وترجیحات کے پیش نظر کتابوں کی اشاعت ہو تو یقینی طور پر مطالعے کے ذوق کو بھی فروغ ملے گا، مفید اور معلوماتی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں گی۔ آج کے دور میں عام طور پر اردو ناشرین، اشاعتی اخلاقیات کا خیال نہیں رکھتے۔ ناشرین کتب پر تجارتی رویہ حاوی ہو جاتا ہے اور جن کتابوں کی معاشرے کو ضرورت ہے وہ بوجوہ منظر عام پر نہیں آپاتیں۔ جب کہ پرانے زمانے میں کتابوں کے ناشرین، تجارتی مفادات سے بالا تر ہو کر عمدہ اور معیاری کتابوں کی اشاعت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے تھے۔

ڈیجیٹل ایج میں ہماری نئی نسل، کتابوں سے دور ہوتی جارہی ہے، اس لیے آج کے عہد میں نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنے کے لیے ہمیں نئے طریق کار اختیار کرنے پڑیں گے۔ مقامِ شکر ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کتاب کلچر کو فروغ دینے کے لیے مقدور بھر کوشش کررہی ہے۔ گذشتہ دنوں سری نگر میں چنار اردو کتاب میلے کے انعقاد کو اس کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے جس میں بڑی تعداد میں زبان وادب سے محبت کرنے والوں نے شرکت کی خاص طور پر وہاں کے بچوں اور نوجوانوں کا جوش لائق دید تھا۔

کتاب میلہ دراصل صرف کتابوں کی خرید وفروخت کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ Cultural Discourse کا پلیٹ فارم بھی ہے۔ کتابوں کی ایک پوری کہکشاں ہوتی ہے جس میں علوم وفنون، ادبیات ولسانیات اور اہم تاریخی، عمرانیاتی اور تازہ ترین موضوعات سے ہم آہنگ بیش بہا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ان میں سے قارئین کو لعل وگہر اور جواہر ریزوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو بھی ایک ایسی زبان ہے جس میں تمام مفید مطلب موضوعات پر کتابیں دستیاب ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں سائنسی علوم پر بھی اردو داں حلقے کی خاصی توجہ ہے۔ اس لیے نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی سائنسی موضوعات پر کتابیں دستیاب ہیں۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں اردو زبان میں سائنسی اور تکنیکی موضوعات پر کتابیں شائع ہورہی ہیں، یقیناً یہ اردو زبان کے لیے خوش آئند بات ہے۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ ٹائٹل کی خوبصورتی میں میرتقی میر کی تصویر مع ایک مصرع دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو سے مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اداریے میں ڈاکٹر شمس اقبال لکھتے ہیں ''یہ فراموش کاری کا عہد ہے اور معاشرے میں قدرناشاسی کی روش عام ہوچکی ہے۔ ان افکار و اقدار سے ہمارا رشتہ ٹوٹتا جارہا ہے جن سے ہمیں روشنی ملتی رہی ہے۔ مغربی معاشرے کو لاکھ مطعون کیا جائے مگر وہاں ایک خوبی یہ ہے کہ تخلیقی ذہانتوں کی قدر ہوتی ہے اور وہاں کے فنکاروں سے جڑی ہوئی یادوں اور اشیا کو خاص طور پر محفوظ رکھا جاتا ہے۔۔ ناقدری زمانہ کا شکوہ ہر عہد میں عام رہا ہے۔

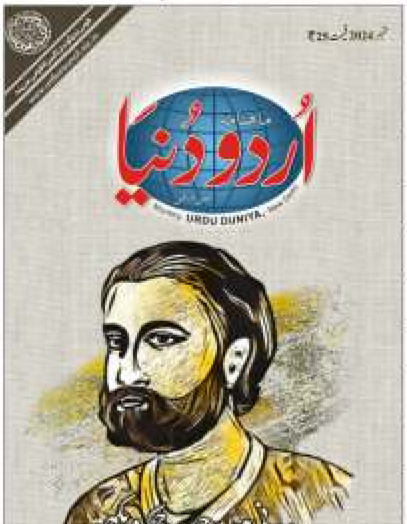

چاہے وہ میر ہوں یا غالب، سودا ہوں یا میر درد، سبھی اپنے عہد میں ناقدری کے شکار رہے ہیں۔'' ناقدری آج کا شیوہ ہے، باکمال فنکاروں کی قدر نہیں ہورہی ہے ... گوشہ گمنامی میں چلے گئے ان کو اجاگر کرنا عوام میں لانا ناگزیر ہے۔

کالم 'ربط والتفات' سے شمارے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ شمارے میں شامل 'آزاد بھارت کا اپنا قانون نظام عدل میں آسانی کا نیا دور' بہت اہم مضمون ہے۔ مضمون نگار لکھتے ہیں ''پہلی بار کسی مرکزی حکومت نے ہندوستانیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تین قوانین جو فوجداری نظام انصاف کے طور پر تھے، ان تینوں قوانین کی بنیادی انگریزی سوچ سے آزادی دلا کر ایک انقلابی اقدام کیا ہے۔ ''نہاں رباب نے دوروزہ سمینار 'چلوتک میر کو سننے' کی تفصیلی رپورٹ پیش کی ہے۔ رپورٹ کو پڑھ مقالہ نگاروں کے موضوعات اوران کی خصوصیات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ 'رنگ میر کے تحت' اس شمارے میں ف س اعجاز کا مضمون 'میر ستم کشتہ' اور سعدیہ صدف کا 'عشق اور رباعیات' نہایت اہم مضامین ہیں۔ ان کے مطالعے سے علم وآگہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بلجیت سنگھ کا مضمون 'پروف اور اس کی تصحیح' ان معنوں میں بہت اہم ہے کہ آج کے بیشتر پروف نگار پروف کی باریکیوں سے ناواقف ہیں، پروف میں مستعمل ضروری نشانات وعلامات کا بھی انھیں علم نہیں ہے۔ اس لیے پروف نگار کی صحیح رہنمائی کے لیے یہ مضمون نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ محمد نعمان خان کا مضمون 'اردو کی پہلی طنز و مزاح نگار خاتون: شفیقہ فرحت' بھی عمدہ مضمون ہے۔ ان کے علاوہ شمارے میں شامل بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2024 کا شمارہ بھی وقت پر موصول ہوا، سرورق پر لال قلعہ اور ترنگا کی خوب صورت تصویر ہے۔ ہماری بات میں مدیر نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے کارناموں اور خدمات پر بہترین خراج تحسین پیش کیا ہے۔ سنتوش کمار جے ہند نے 'وکست بھارت کا تصور @2047 کے تناظر میں' میں ترقی یافتہ ہندوستان کا تصور پیش کیا ہے۔ رغبت شمیم ملک نے 'اردو میں التوئی افسانے کا نقش مدن لال سینا اور صدیاں' میں لکھتے ہیں ''افسانہ مدن سینا اور صدیاں کا عنوان اس کے مرکزی کردار مدن سینا کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ صدیاں کا لاحقہ اس لیے لگایا گیا ہے کہ اس افسانے کا متن زمان و مکان کے حدود وقیود سے بھی ماورا ہے۔ جمشید احمد نے 'اردو غزل کے موضوعات اور تصوف' میں اشعار کے ذریعے تصوف کے تصور کی نشاندہی کی۔ غزالہ فاطمہ کا 'عالمی تناظر میں تانیثی تنقید' اچھا مضمون ہے۔ عبدالرحمن فیصل نے 'شعری متون کی قرأت کا سیمیائی ساختیاتی و بیانیاتی تناظر میں مرزا غالب کی ایک غزل میں غالب کے تین اشعار کی تشریح بیان کی ہے۔ محمد امجد نے 'ابھگیان شکنتلم کے اردو تراجم ایک اجمالی جائزہ' کا تفصیلی احاطہ کیا ہے، اس کے مترجمین میں پہلے مرزا کاظم علی جواں، ساغر نظامی منظوم تراجم میں لکھتے ہیں کالی داس کے کل ادبی اثاثے میں تین ڈرامے وکرم موروشیم، مالویکا اگنی متر،

ابھگیان شکنتلم اور چار طویل نظمیں: رتو سنہار، میگھ دوت، کمار سمبھو اور رگھونش خاص طور پر اہم ہیں۔ محمد نوشاد عالم ندوی نے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی اردو ادب میں خدمات کا تحقیق و تنقید کے حوالے سے افسانوں، ناولوں اور تراجم جیسے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ شمارے میں شامل بقیہ مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2024 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس جریدے کے ہر شمارے میں اداریے میں جو باتیں تحریر کی جاتی ہیں بڑی نفیس اور غور و فکر کی ہوتی ہے جیسے آج کے شمارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمیں اپنے اہل علم و دانش شخصیات کی قدر کرنی چاہیے اور ان کے کارناموں کو نہ صرف سراہنا چاہیے بلکہ ان کا مطالعہ کرکے اپنے علم و شعور کو وسعت بخشنے کی ضرورت بھی ہے۔ سو صفحات کے اس شمارے میں مختلف طرح کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے، یہ سارے مضامین تقریباً متاثر کن ہیں۔ جیسے میر پر لکھے گئے مضامین 'میر ستم کشتہ' (ف س اعجاز)، 'عشق اور رباعیات میر' (سعدیہ صدف)، چلو ٹک میر کو سننے (نہاں رباب) میں میر کے تمام فکری وفنی اختصاص کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح شخصیات کے ذیل میں دیے گئے تینوں مقالات لائق مطالعہ ہیں۔ سماجیات کے ذیل میں شریف الحسن نقوی کا 'قومی یکجہتی' پر جو مقالہ ہے کافی عمدہ ہے جو ہندوستان کے باشندوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہاں رہنے والے میل جول اور محبت سے رہیں۔ یہ کافی عمدہ مضمون ہے جسے تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے، کتابوں کی دنیا میں آٹھ کتابوں پر تبصرے دیے گئے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں ضروری کتب کے انتخاب میں سہولت رہے۔ آخر میں خبرنامہ کے تحت اردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں تاکہ ہم باخبر رہیں۔ امید ہے یہ جریدہ مستقبل میں خوب سے خوب تر کی جانب اپنا ارتقائی سفر طے کرتا رہے گا۔

ڈاکٹر روحی جان، ضلع شوپیاں (جموں و کشمیر)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہندوستان کی دارالحکومت دہلی سے شائع ہونے والا بین الاقوامی ماہنامہ رسالہ 'اردو دنیا' خالص ادبی و تحقیقی رسالہ ہے جس میں ادب کے نئے رجحانات اور افکار پر مضامین شامل ہیں۔ جولائی، اگست 2024 کا شمارہ موصول ہوا جس میں سماجی، تاریخی، نفسیاتی، صحافتی، سماجی، اقتصادی، سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ سے مزین بے حد مفید اور نئی نئی معلومات سے بھرپور ہر شمارہ تنقیدی اور تحقیقی مقالات ہیں۔ ماہ جولائی اور اگست 2024 کے رسالوں کو میں نے بغور پڑھا

جس میں سبھی مقالے دلچسپ اور معلوماتی تھے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مدیر ڈاکٹر شمس اقبال کی سرپرستی میں بڑی آب و تاب کے ساتھ وقت پر منظر عام پر آجاتا ہے۔ میں مبارکباد دینا چاہتا ہوں ڈاکٹر شمس اقبال صاحب اور ان کی پوری ٹیم کو کہ ان کی انتھک محنتوں کے صلے میں ہمارے جیسے قاری اس رسالے سے استفادہ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ہندوستان بھر میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ رسالہ اپنی ترقی کی منزلوں کی طرف پوری آب و تاب کے ساتھ گامزن ہے۔ 100 صفحات کے رسالے کے Print Material کے ساتھ جس میں تمام مقالات اور دیگر مضمون کے ساتھ اردو اور تعلیم کے متعلق قومی اور علاقائی خبریں بھی شامل ہوتی ہیں کا مطالعہ کرکے قاری ایک ہر ماہ کے شمارے سے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے، خاص بات یہ ہے کہ مقالات میں جس وسیع النظری سے کام لیا جاتا ہے وہ تشنہ لب کی پیاس بجھانے میں ہمیشہ معاون ہوتا ہے۔

یوں تو رسالہ جولائی 2024 میں سارے مضامین اچھے ہیں مگر چند تحریریں جو بہترین ادب کی عکاسی کرتی ہیں وہ یہ ہیں: مجروح: فہم و ادراک بہ نام رومان (سہیل کاکوروی)، قرۃ العین حیدر اور ساگا ناول (شہاب عنایت ملک) سلام کی سادگی کو سلام (غضنفر)، شکستہ بتوں کے درمیان سلام بن رزاق (نور الحسنین)، ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا شاعر: نظیر اکبرآبادی (جاں نثار عالم)، مصنوعی ذہانت اور ہمارا شعور (محمد جہانگیر وارثی)، محی الدین قادری زور کی ادبی خدمات (سوشیل کمار)۔

ماہ اگست 2024 کا شمارہ بھی ہمیں جشن آزادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوا حاصل ہوا۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے شمس اقبال صاحب کا اداریہ 'ہماری بات' نظر سے گزرا۔ شمس اقبال صاحب میں خداداد صلاحیت و ذہنیت ان کی شخصیت میں پیوست ہے۔ اس شمارے کے سارے مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں۔

محمد سعید فرخ آبادی، المنی، ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ادارہ

چنار اردو کتاب میلہ/ چنار پستک مہوتسو 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیر اہتمام مشترکہ طور پر سری نگر میں تاریخی اور ثقافتی مرکز چار چنار کے سامنے ڈل جھیل کے کنارے وسیع و عریض شیر کشمیر انٹرنیشنل کنونشن سینٹر میں چنار اردو کتاب میلہ/ چنار پستک مہوتسو2024 کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس میلے کے انعقاد میں ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن سری نگر، آئی سی ایچ آر اور اسرو بھی شامل تھے۔ یہ ایک تاریخ ساز کتاب میلہ تھا جو 17اگست سے 25 اگست 2024 تک چلا۔اس دوران رنگارنگ ادبی و ثقافتی پروگراموں کے ساتھ دلچسپ ادبی مباحثوں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ قومی کونسل نے ادبی اور ثقافتی پروگرام کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کے اشتراک سے کیا۔کشمیر میں پہلا ایسا موقع تھا کہ کسی کتاب میلہ میں اردو، انگریزی، کشمیری، ہندی، ڈوگری اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کے تین سو سے زائد اسٹال لگائے گئے ہوں۔کتاب میلہ کے پہلے ہی دن سے نوجوانوں اور بچوں کا شوق قابل دید تھا ،بڑی تعداد میں شائقین کتب اور اہل علم کا ازدحام دیکھنے کو مل رہا تھا۔ بہت ہی پر امن اور جوش و خروش کے ساتھ کشمیری عوام نے اس چنار اردو کتاب میلہ اور چنار بک فیسٹیول کا استقبال کیا۔ (ادارہ)

کتاب میلہ کا افتتاح

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا کے زیر اشتراک منعقدہ چنار پستک مہوتسو اور چنار اردو کتاب میلے کا افتتاح شیر کشمیر انٹرنیشنل کنونشن سینٹر سری نگر میں منعقد ہوا۔ پروفیسر نیلوفر خان، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی، ڈپٹی کمشنر سری نگر ڈاکٹر بلال محی الدین، ڈائرکٹر این بی ٹی جناب یوراج ملک، پروفیسر ملند سدھاکر مراٹھے چیئرمین این بی ٹی، پروفیسر رگھویندر تنور چیئرمین آئی سی ایچ آر، ڈاکٹر مندیپ کے بھنڈاری، سنجیو ورما جی سکریٹری جی اے ڈی، جموں و کشمیر، جناب یوراج ملک ڈائرکٹر این بی ٹی، اور ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ڈاکٹر شمس اقبال کے ہاتھوں چنار اردو کتاب میلے/چنار پستک مہوتسو کا افتتاح عمل میں آیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر ملند سدھاکر مراٹھے چیئرمین نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے کہا کہ کتاب کی طاقت بہت بڑی طاقت ہوتی ہے ،کتاب دو چار الفاظ کا نام نہیں ہے اس میں ایک مصنف کی پوری زندگی کا نچوڑ شامل ہوتا ہے، پڑھنے والا انسان ہزاروں لوگوں کی زندگی جیتا ہے ہزاروں طرح کے تجربات اس کی نگاہ میں ہوتے ہیں، جو نہیں پڑھتا وہ صرف اپنی زندگی جیتا ہے۔ وچار اور سوچ دنیا کو بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ سرزمین کشمیر ہندوستان ہی نہیں دنیا بھر میں علم و ادب کے مرکز کے طور پر جانی جاتی ہے۔ آرٹ اور کلچر کے اس حسین سنگم چنار کتاب میلے کا انعقاد بہت بڑی نعمت ہے یہاں کے نوجوانوں کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔

کشمیر یونیورسٹی کی پہلی خاتون وائس چانسلر پروفیسر نیلوفر خان نے کہا کہ کشمیر کی شناخت فطری خوبصورتی،

ثقافت، روحانیت اور صوفی ازم کی وجہ سے ہے۔ کشمیر نے موسیقی، ادب اور تہذیب وثقافت میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوسائٹی کی ترقی کے لیے یہاں کے کلچر و ثقافت کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ آج جس میلے کا افتتاح ہو رہا ہے اس کی اشد ضرورت ہے امید ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کے کتاب میلوں کا انعقاد کیا جاتا رہے گا تاکہ یہاں کے بچوں اور نوجوانوں کو سیکھنے، سمجھنے اور کتابوں سے رشتہ جوڑنے کے مزید مواقع ملیں۔ سری نگر کے ڈپٹی کمشنر قلمکار اور شاعر ڈاکٹر بلال محی الدین بھٹ نے کہا کہ آج این بی ٹی اور این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام کتاب میلے کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ میرا خواب پورا ہو رہا ہے۔ یہاں کے نوجوانوں کو اس کتاب میلہ سے مزید حوصلہ ملے گا اور ان کے مستقبل کو تابناک بنانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ کشمیر کی تاریخ میں پہلا ایسا موقع ہے کہ اتنے بڑے کتاب میلے کا انعقاد ہو رہا ہے اور اس میں تین سو سے زائد بک اسٹالس ہیں 125 سے زیادہ پبلشرز ہیں۔

کمشنر سکریٹری جموں وکشمیر جناب سنجیو ورما اور آئی سی ایچ آر کے صدر رگھو یندر تنور وغیرہ نے بھی اس موقع پر کشمیر کی تہذیب وثقافت اور علمی وراثت پر مفصل روشنی ڈالی۔ جناب یوراج ملک ڈائرکٹر این بی ٹی نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر رشی، گیان اور ردیو شاستر کی زمین ہے، کتاب اور کشمیر کا رشتہ بہت گہرا ہے قومی کونسل، ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن سری نگر، آئی سی ایچ آر اور اسرو سبھی اداروں کا اس کتاب میلے کے کامیاب انعقاد میں تعاون کے لیے شکریہ۔

افتتاحی تقریب کے اختتام کے بعد چنار اردو کتاب میلے کے اردو پویلین کا افتتاح مذکورہ بالا حضرات کے ذریعے فیتا کاٹ کر کیا گیا۔ اس موقع پر ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا قومی اردو کونسل اور کشمیر کا رشتہ بہت گہرا رہا ہے قومی کونسل کے کتاب میلے یہاں ہمیشہ کامیاب ہوئے ہیں، ستر سے زائد کونسل کے ڈپلوما اردو، عربی اور کیلی گرافی کے سینٹر کے علاوہ صرف وادی میں نوے کے قریب MDTPCABA کمپیوٹر کورس کے سینٹر ہیں۔

دوسرا دن: 18 اگست 2024

دوسرے دن شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے چنار اردو کتاب میلے کے اردو پویلین میں محفل افسانہ (اطفال) کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ناظم اجلاس ڈاکٹر ریاض توحیدی نے کشمیر میں ادب اطفال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے والے تخلیق کاروں کا تفصیل سے تعارف کرایا اس پروگرام میں رتن سنگھ کنول نے 'منگو کا پچھتاوا'، دیپک کنول نے 'خوبصورت بلا'، مشتاق مہدی نے 'گل احمر' اور ڈاکٹر نظیر مشتاق نے 'ببلو' کے عنوان سے کہانیاں سنائیں۔ کہانی 'منگو کا پچھتاوا' میں سبق دیا گیا کہ کوئی بچہ جب غلطی کرتا ہے تو اسے پچھتانا پڑتا ہے اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے غلط کاموں سے اپنے آپ کو دور رکھا جائے۔ کہانی 'خوب صورت بلا' موبائل پر مرکوز کہانی تھی اس میں موبائل کیسے رحمت وزحمت دونوں ہے اور اس کے مضر اثرات بینائی اور نشو ونما پر کس طرح پڑتے ہیں بتایا گیا۔ کہانی 'گل احمر' اور 'ببلو' میں بچوں کی صحت کے لیے جو چیزیں مضر ہیں ان کی نشاندہی کی گئی اور بتایا گیا کہ بچے کس طرح سماج اور اپنے لیے مفید بن سکتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر عارفہ بشریٰ، پروفیسر عادل امین کاک، ڈاکٹر راشد عزیز، ڈاکٹر اے کرشنا، ڈاکٹر روشن لال، پرویز مانوس وغیرہ بڑی تعداد میں اہل علم طلبا وطالبات موجود رہے۔

تیسرا دن: 19 اگست 2024

چنار اردو کتاب میلے کے تیسرے دن صبح ساڑھے گیارہ بجے سے شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو پویلین میں محفل غزل وموسیقی کا اہتمام کیا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس کشمیر یونیورسٹی کی صائمہ محمود، یاور ایوب، اویس محمود، شاہد شفیق خان، شکیل احمد، عطفر نظیر، داؤد احمد میر، صابر احمد، فاضل الطاف اور ارشاد مجید نے اپنی مسحور کن آواز میں

غزل و موسیقی پروگرام کو خوبصورتی سے پیش کیا جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا، اس موقعے پر انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس کے اساتذہ میں محترمہ ثریا شفق، ڈاکٹر بلال احمد، فیروز احمد اور تجندر پال وغیرہ اور شعبہ اردو کے اساتذہ میں پروفیسر عارفہ بشری اور ڈاکٹر الطاف انجم وغیرہ موجود رہے۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کی صدر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر عارفہ بشری کے کلمات تشکر پر محفل غزل وموسیقی کا اختتام ہوا۔

دوپہر ڈھائی بجے سے اردو پویلین میں اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر وفلاسفی، کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے 'مشاعرہ' کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر رفیق راز نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مبارک لون نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں ستیش ویمل، شفیقہ پروین، اشرف عادل، راشد عزیز، شبنم عشائی اور حسن زریں وغیرہ شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔ آخر میں اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر وفلاسفی کشمیر یونیورسٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے سامعین قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال اور وزارت تعلیم حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس طرح کی تقریبات کی اہمیت سے روشناس کرایا اور آئندہ بھی اس طرح کے انعقادات کی خواہش ظاہر کی۔ محفل غزل و موسیقی اور مشاعرے میں بڑی تعداد میں سامعین موجود رہے۔

چوتھا دن: 20 اگست 2024

چنار اردو کتاب میلہ کے چوتھے دن نگینہ انٹرنیشنل کشمیر کے اشتراک سے افسانہ خوانی اور ان کا تجزیہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں سینئر افسانہ نگار نور شاہ نے بدلے موسم کے رنگ، وحشی سعید نے 'میرا قاتل میرا مسیحا' اور ناصر ضمیر نے افسانے پڑھے جبکہ سہیل سالم، صوفی بشر بشیر اور ڈاکٹر محمد اقبال لون نے ان افسانوں کا تجزیہ کیا۔ اس پروگرام کی نظامت زبیر قریشی نے کی۔ سہیل سالم نے نور شاہ کے افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ نور شاہ کا شمار کشمیر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، ان کے افسانوں میں رومانیت، ماحول اور فطرت کی عکاسی خوب دیکھنے کو ملتی ہے افسانہ بدلے موسم کے رنگ میں ازدواجی رشتے اور عہد کے سنجیدہ مسائل کی عکاسی بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ صوفی بشر بشیر نے وحشی سعید کے افسانہ میرا قاتل میرا مسیحا کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ وحشی

سعید ایسے افسانہ نگار ہیں جس طرح چاہتے ہیں افسانوں کو صفحہ قرطاس پر اتار دیتے ہیں، وحشی سعید کو زبان و بیان پر قدرت ہے۔ مذکورہ افسانے میں روایت کی پاسداری بہت خوبصورتی سے کی گئی ہے ،اختصار وحشی سعید کا طرہ امتیاز ہے۔ پلاٹ، کردار، مکالمہ اور منظرکشی سبھی اعتبار سے یہ افسانہ عمدہ ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبال لون نے ناصر ضمیر کے افسانہ نمک کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ نگار نے کاپی پیسٹ اور سرقہ کے ذریعے لکھاری بننے والے پر طنز کیا ہے۔ تخلیقی عمل میں اخلاقیات کے فقدان پر سوال اٹھایا ہے۔ زبان آسان اور مکالمات عمدہ ہیں۔ کرداروں کے درمیان گہرائی اور معنویت ہے۔ نور شاہ نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام کا انعقاد ہوتے رہنا چاہیے قومی کونسل کا یہ اقدام منفرد اور اہم ہے۔ افسانے کی قرأت اور تجزیے سے نئی نسل کے تخلیق کاروں کو سیکھ کر آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔

اردو پویلین میں دوسرا پروگرام محفل قوالی/صوفیانہ کلام ہوا جسے انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے پیش کیا گیا، اس پروگرام کو انسٹی ٹیوٹ آف میوزک اینڈ فائن آرٹس کشمیر یونیورسٹی کے یاور ایوب، شاہد شفیع خان، توحید احمد، صابر احمد، اویس محمود، داؤد احمد میر، فرحان جبار، ارشاد مجید اور تجندر پال سنگھ وغیرہ نے پیش کیا۔ اس موقعے پر میوزک اینڈ فائن آرٹس کے اساتذہ میں ثریا شفق، فیروز احمد ڈار اور ڈاکٹر بلال احمد ڈار وغیرہ موجود رہے۔ آخر میں شیخ العالم سینٹر فار ملٹی ڈسپلینری اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی کے چیئرمین پروفیسر عادل امین کاک نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

پانچواں دن: 21 اگست 2024

چنار اردو کتاب میلے کے پانچویں دن اردو پویلین میں صبح ساڑھے گیارہ بجے سے شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے 'بچوں کے ذہنی نشو ونما میں قصہ خوانی کے اثرات' کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا اس پروگرام میں پروفیسر عارفہ بشریٰ صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس، کشمیر یونیورسٹی، ڈاکٹر شبیر حسین شبیر، ڈاکٹر مبارک لون اور ڈاکٹر الطاف احمد نظامی وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مقررین نے قصہ خوانی کیا ہوتی ہے اور بچوں کے ذہنی نشو ونما میں قصہ خوانی کے اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں اور بچوں کی تربیت میں یہ کہانیاں کس طرح کا کردار ادا کرتی ہیں ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے اس پروگرام کی نظامت کی۔

اردو پویلین میں دوسرا پروگرام 'سارے جہاں سے اچھا' کے عنوان سے مباحثے کا پروگرام ہوا۔ اس مباحثے میں پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی، ڈاکٹر ستیش ویمل اور ڈاکٹر الطاف انجم نے مباحثے میں حصہ لیا۔

اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر وفلاسفی، کشمیر یونیورسٹی نے کی۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ستیش ویمل نے کہا کہ اقبال کی نظموں میں وطن پرستی کی گونج سنائی دیتی ہے، انھوں نے جس ویدانت کے فلسفے سے فیض حاصل کیا ہے وہ اسی سرزمین کا ہے۔ پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی نے کہا کہ اقبال کے فکرو فلسفے پر ویدانت کے اثرات گہرے ہیں۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے کہا کہ اقبال ادب اور آرٹ کو زندگی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ اس موقع پر مقررین نے سارے جہاں سے اچھا اور حب الوطنی سے متعلق نظموں پر تفصیلی گفتگو کی۔

اس مباحثے کے ناظم ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام ہوا۔

چھٹا دن: 22 اگست 2024

چنار اردو کتاب میلے کے چھٹے دن مرکز برائے فاصلاتی و آنلائن تعلیم، کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے 'ہم اور ہمارا ادبی ورثہ' کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر نذیر آزاد، پروفیسر سجان کور بالی، پروفیسر ناصر مرزا، ڈاکٹر شبیر حسین شبیر اور ڈاکٹر شکیل شفائی وغیرہ بحیثیت مباحث شریک ہوئے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر الطاف انجم نے انجام دیے۔ اس پروگرام میں مقررین نے کلاسیکی ادب، اردو زبان، گنگا جمنی تہذیب اور اردو کی مشترکہ وراثت پر تفصیلی گفتگو کی اور کہا کہ اردو سبھی کی وراثت ہے اس کی پرورش و پرداخت میں تمام مذاہب کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے یہ محبت کی زبان ہے۔

دوپہر دو بجے سے اردو پویلین میں شانتی مانس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام خواتین کے مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں روشن آرا، نسیم اختر، ڈاکٹر مصروفہ قادر، ڈاکٹر حنانہ برجیس حنا، نگہت صاحبہ، رضیہ حیدر، جیا ٹھاکر، انجلی ادا، رخسانہ جبیں اور ڈاکٹر شفیقہ پروین وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ خواتین کے مشاعرے میں بطور مہمان خصوصی کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر نیلوفر خان نے شرکت کی۔ وائس چانسلر صاحبہ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی گراں قدر خدمات کی ستائش کرتے ہوئے اس کی کاوشوں کو سراہا اور اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد میں ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

ساتواں دن: 23 اگست 2024

کتاب میلے کے ساتویں دن 'میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات' کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ مصنفہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، مشہور شاعرہ ڈاکٹر شائستہ یوسف اور لسانیات کے ماہر پروفیسر اعجاز محمد شیخ شریک ہوئے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالباری نے انجام دیے۔ اس موقعے پر مصنفین نے اپنے تخلیقی اور تصنیفی سفر کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا اور اپنی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے اس کے موضوعات، زاویے اور جہات کو بیان کیا۔

آٹھواں دن: 24 اگست 2024

چنار اردو کتاب میلے کے آٹھویں دن بچوں کا مقابلہ کہانی نویسی اور میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات کے عنوان سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ بچوں کا مقابلہ کہانی نویسی شیخ العالم سینٹر فار ملٹی ڈسپلینری اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے کی جب کہ نظامت کے فرائض شیخ العالم سینٹر کے چیرمین پروفیسر عادل امین کاک نے انجام دیے۔ اس مقابلہ کہانی نویسی میں اول پوزیشن انظر تنویر وانی (ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کا)، دوم پوزیشن لیبہ اندرابی (بس کہ دشوار ہے) اور سوم پوزیشن انجلینا زہرا (ایک خط اپنے آپ کو) نے حاصل کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے کہا کہ بچوں کو آگے بڑھانے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے کونسل نے اہم اقدام کیا ہے، بچوں کی سوچ وفکر سمجھنے کے لیے ان سے لکھوانا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی اور ڈاکٹر الطاف انجم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ دوپہر ڈھائی بجے سے میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات پروگرام کا انعقاد ہوا۔ اس پروگرام میں بحیثیت مصنف

ڈاکٹر قاسم خورشید اور چندر بھان خیال نے شرکت کی اس پروگرام میں اظہار خیال کرتے ہوئے مہمان خصوصی مشہور قلمکار اور ادیب پروفیسر زماں آزردہ نے اردو اور کشمیری کے حوالے سے گفتگو کی اور قومی کونسل اور ڈائرکٹر شمس اقبال کے اقدامات کو سراہا۔ آخر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ آج کے مصنفین سے نوجوانوں کو تحریک ملے گی، یہاں کے لوگ اردو سے بہت پیار کرتے ہیں مجھے امید ہے کہ یہ پیار آگے بھی برقرار رہے گا۔

نواں دن: 25 اگست 2024 (تشکر وسپاس نامہ)

چنار اردو کتاب میلے کے آخری دن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایس جے آئی سی سی کے آڈیٹوریم میں تقریب تشکر وسپاس کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے

پروفیسر شاہد اختر قائم مقام چیئر مین نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز، حکومت ہند، مہمان ذی وقار کی حیثیت سے جناب شاہد اقبال چودھری سکریٹری ڈیپارٹمنٹ آف رورل ڈیولپمنٹ اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے جناب یوراج ملک ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے شرکت کی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی پروفیسر شاہد اختر قائم مقام چیئر مین نیشنل کمیشن فار مائناریٹی ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز، حکومت ہند نے کہا کہ کشمیر علم و ادب اور تہذیب کا مرکز رہا ہے، آج بھی اپنی زبان اور تہذیب سے جڑنے کی ضرورت ہے، بین الاقوامی سطح پر زبان کو فروغ دینے میں کشمیر کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے، قومی اردو کونسل اور این بی ٹی نے جس انداز سے کشمیر کو جوڑنے کی کوشش کی ہے وہ قابل تحسین ہے کشمیر میں چنار اردو کتاب میلہ اور چنار بک فیسٹیول کا انعقاد قومی کونسل اور این بی ٹی کی بہت بڑی کامیابی ہے، امید ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی برقرار رہے گا۔

کلمات تشکر و سپاس کہتے ہوئے ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ کشمیر جسے زمین کی جنت کہا جاتا ہے ڈوگری اور کشمیری کے ساتھ اردو سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، اس وادی کا اردو زبان و ادب سے بہت گہرا رشتہ رہا ہے، اردو زبان کو فکری اور لسانی اعتبار سے ثروت مند بنانے میں یہاں کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے. قومی کونسل کی اسکیموں سے یہاں کے نوجوان بچے اور بچیاں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہم اس طرح کے کتاب میلوں کا انعقاد آئندہ بھی کریں گے۔ جناب یوراج ملک ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے کہا کہ اردو زبان

ادبی زبان ہے، بھاشا اور سنسکرتی کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس کتاب میلہ کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ یہاں کے لوگوں نے کردار ادا کیا ہے، یہ رشیوں اور صوفیوں کا مسکن رہا ہے۔ یوراج ملک نے مزید کہا کہ سماج کو بدلنے کے لیے سنسکرتی اور بھاشا سے پیار ہونا چاہیے، کتاب میلہ اسی وراثت کو آگے بڑھانے اور بچانے کے لیے ایک اقدام ہے۔ شکشا کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ نالج (علم)، اسکل (ہنر) اور سنسکار (تہذیب)۔ جتنے زیادہ رنگ چنار کے ہیں اس سے زیادہ آپ کے ادب میں ہے، چنار صرف پتہ نہیں یہ تہذیب ہے۔ سماج کو بدلنے کے لیے کتابوں سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت ہے۔ مہمان ذی وقار شاہد اقبال چودھری سکریٹری ڈپارٹمنٹ آف رورل ڈیولپمنٹ، جموں و کشمیر نے کہا کہ اسکل اور ہنر کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے اس لیے نوجوانوں کو اسکل اور ہنر سے بھی جوڑنے کی ضرورت ہے۔ میں پہلی بار اتنا کامیاب پروگرام اور کتاب میلہ دیکھ رہا ہوں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور این بی ٹی اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔ چنار اردو کتاب میلے کے آخری دن تقریب تشکر و سپاس میں بیسٹ کلیکشن کا انعام نامک پبلیکیشن کی ڈائرکٹر انجم عامر خان کو اور بیسٹ ڈسپلے کا انعام افضل لون مالک ملت پبلی کیشنز، سری نگر کو دیا گیا۔

تقریب تشکر و سپاس کا اختتام ڈاکٹر نصیب علی اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شکریے اور نیشنل اینتھم پر ہوا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عبدالباری نے کی۔ پروگرام کے خصوصی شرکا میں پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، پروفیسر اعجاز محمد شیخ اور پروفیسر عارفہ بشریٰ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

شمیم طارق

اردو زبان میں دلوں کو فتح کرنے کی طاقت آج بھی ہے

شمیم طارق

شمیم طارق کوممبئی میں رہتے ہوئے 52 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر پیدائش شہر دلبراں بنارس کی ہے۔ وہ شاعر، کالم نگار، نقاد، محقق اور بہت دلکش طرز تحریر کے مالک ہیں۔ ان کا کالم ملک کے مختلف علاقوں اور طبقوں میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ کسی یونیورسٹی کے اردو شعبے سے ان کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا مگر وہ ملک کی بڑی یونیورسیٹیوں میں بلائے اور بڑی رغبت سے سنے جاتے ہیں۔ان کی تعلیم کامرس کی ہے مگر اردو شعبوں میں اس اعتراف کے ساتھ کہ وہ بڑے ادیب ہیں، اکثر کہا جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ادبی موضوعات پر ان کی تقریر اچھی ہے یا تحریر و تصنیف۔

مختلف اور متنوع موضوعات پر ان کی 22 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بعض کتابوں کے تو کئی اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ ان کی حالیہ تصنیف 'نئی صدی نیا ادب' ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ گزشتہ چالیس پچاس برس میں اردو میں کن نئے موضوعات پر لکھا گیا اور جن موضوعات پر ایک زمانے سے لکھا جاتا رہا ہے، ان میں کیا ندرت و وسعت پیدا کی گئی ہے۔وہ حکومت ہند کی وزارت ثقافت کے سینئر فیلو رہ چکے ہیں۔ 'تصوف اور بھکتی' ان کی مقبول تصنیف ہے جس کے چار ایڈیشن اردو میں شائع ہو چکے ہیں اور انگریزی ایڈیشن زیر طبع ہے۔ 2015 میں اس کتاب کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ غالب اور تحریک آزادی، صوفیہ کی شعری بصیرت میں سری کرشن، تاثر اور تجزیہ، تقابل اور تناظر ان کی اہم کتابیں ہیں۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' پر انہوں نے بالترتیب سوالوں کے جواب دیے ہیں۔ سوالنامے کی روشنی میں ان کے جوابات پڑھے جائیں:

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: زبان اور بولیوں کی موت کی کئی وجوہ ہیں۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کسی زبان کو ایک طبقہ 'ان کا' اور ایک طبقہ صرف 'اپنا سمجھنے' لگتا ہے یا عوام کی روزمرہ کی زندگی سے زبانوں اور بولیوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ مرجاتی ہیں۔ ایک زبان کو جب دوسری خاص طور سے ارباب اقتدار اور اکثریت کی زبان کی 'شیلی' سمجھ لیا جاتا ہے تب بھی یہی ہوتا ہے۔ زبانوں اور بولیوں کا تعلق معاشرے سے ہے، معاشرے سے ان کا تعلق باقی نہ رہے تو ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو پانی سے باہر مچھلی کا۔

س: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کا معاشرے سے جڑا رہنا اور زندہ زبانوں اور نفع بخش علوم کے الفاظ کا قبول کرتے رہنا ضروری ہے۔ اپنی شرط پر دوسری زبانوں کے الفاظ قبول نہ کرنے سے زبانیں سمٹنے اور مرنے لگتی ہیں۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

ج: ہر زبان کی صورت گری کسی خاص تہذیب وثقافت کے ہی حوالے سے ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو انگریزی میں Big Pig کا اور اردو میں ۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی

کا تصور نہ ہوتا۔ روسی، فرانسیسی، انگریزی اور ہندوستان کی مختلف بولیوں کے ادب اور انداز بیان میں بھی اتنا فرق نہ ہوتا۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی ہاں! ایک زبان کا مرنا ایک تہذیب کا مرنا ہے۔ کسی بھی زبان یا بولی کے ختم ہونے سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ زبان ہی ہے جو ثقافت ومعاشرت کے ہر پہلو کو محفوظ رکھتی ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: جی ہاں خواندگی کی شرح میں کمی یا سماجی وسائنسی علوم میں دوری کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں اُمّی شعرا کی ایک روایت ہے، دوسری زبانوں کے بولنے والوں میں بھی Oral Tradition کی اہمیت ہے مگر بدلتے معاشرے اور مقبول ہوتے نئے

نئے موضوعات کا حق ادا کرنا بہتر خواندگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر مصنوعی ذہانت (AI) اور ڈیپ فیک فائدہ بخش بھی ہو سکتے ہیں اور نقصان دہ بھی مگر دونوں صورتوں میں یہ خواندگی کے ساتھ ہی مشروط ہیں۔ اب تو خواندگی میں (Computer Literacy) بھی شامل ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان میں جو کچھ ہے وہ سب کچھ اردو میں ہے۔ اردو تحریر و تقریر میں اس کا اظہار بھی کیا جاتا رہا ہے۔ بعض ناواقف یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اردو رسم الخط بدیسی ہے مگر وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اردو رسم الخط میں بعض حروف دوسری یا بدیسی زبانوں کے ضرور ہیں مگر ان کو اس درجہ 'ہندوستانیایا' جا چکا ہے کہ اب وہ ہندوستان میں ہی بولے اور سمجھے جا سکتے ہیں مثلاً حرف ب عربی میں ہے مگر بھ کی آواز صرف اردو میں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو بھابھی، بھاردواج، بھارگو... کیسے بولا جاتا۔ فارسی کا مرغ اردو میں مرغا اور مرغی بن گیا ہے ورنہ انڈا کہاں سے آتا؟ موجودہ دور میں اردو زبان کو ایک طرف تو ان سے خطرہ ہے جو اس کو اور اس کے رسم الخط کو ہندوستانی ہی تسلیم نہیں کرتے اور دوسری طرف ان سے بھی خطرہ ہے جو اردو شعبوں سے دور رہ کر اردو کی خدمت کرنے والوں کو حلیف نہیں حریف سمجھتے اور ان کے خلاف طرح طرح ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ اردو کو ایک خطرہ ان سے بھی ہے جو مدارس، عصری دانش کدوں اور روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہونے والی اردو کو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

> زبان کے سفر اور دنیا میں ادبی رجحانات کے مقبول و نامقبول ہونے کے بارے میں معلومات تو ضروری ہے اس لیے کلاسیکیت اور جدیدیت کے بارے میں جانکاری بھی بے فیض نہیں ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

ج: اردو کے مستقبل کا انحصار اردو بولنے والوں کے مستقبل اور غیرت پر ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بے حسی اور بے غیرتی یا تمام الزامات دوسروں کے سر منڈھ کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی روش نے بھی اردو کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔

سب سے بڑی ضرورت تو یہ ہے کہ لفظوں کے تخلیقی استعمال سے معنی میں رونما ہونے والے فرق کو سمجھا جائے۔ غالب، شبلی، آزاد، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی اور ظ انصاری. یا پھر مشتاق یوسفی 'خامہ بگوش' کی نثر کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ واقعہ اور سانحہ کے فرق کو ذہن میں رکھا جائے۔ اچھی زبان بولنے اور لکھنے والوں کی مجلسوں میں شرکت کی جائے ایسے لوگوں کو مدعو کیا جائے جو زبان کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے صاف وسلیس زبان بولتے اور لکھتے ہیں۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: زبان کے سفر اور دنیا میں ادبی رجحانات کے مقبول و نامقبول ہونے کے بارے میں معلومات تو ضروری ہے اس لیے کلاسیکیت اور جدیدیت کے بارے میں جانکاری بھی بے فیض نہیں ہے۔ اس سے زبان کے بارے میں بھی علم ہوتا ہے کہ کلاسیکی ادب میں لفظ کو کس طرح استعمال کیا جاتا تھا اور جدیدیت نے ان میں کیا تغیرات پیدا کیے یا غلط العام اور غلط العوام میں کیا فرق ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی تعداد کتنی ہے؟

ج: میں بھی (مہاراشٹر) سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہاں پرائمری سے ڈاکٹریٹ تک کی اردو تعلیم کا انتظام ہے۔ امید ہے کہ حکومت کی نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اردو میں تکنیکی اور پیشہ ورانہ کورسیز بھی شروع کیے جائیں گے مگر میں اردو اسکولوں اور اردو شعبوں کے معیار میں بہتری چاہتا ہوں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون کون سے اخبارات و رسائل آتے ہیں؟

ج: لائبریریاں تو بہت تھیں۔ پہلے ان لائبریریوں سے اردو کو 'ٹاٹ باہر' کیا گیا پھر اردو لائبریریاں بند ہونا شروع ہوئیں۔ اس کے لیے حکومت اور میونسپل کارپوریشن

> ایک زبان کا مرنا ایک تہذیب کا مرنا ہے۔ کسی بھی زبان یا بولی کے ختم ہونے سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ زبان ہی ہے جو ثقافت و معاشرت کے ہر پہلو کو محفوظ رکھتی ہے۔

ہی ذمے دار نہیں ہے۔ ملی اداروں میں بھی اردو کے گلے پر کند چھری رکھی گئی۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں، جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی اور قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: کالی داس گپتا رضا، علی سردار جعفری، ظ انصاری... وغیرہ کے علمی ادبی کاموں کا کم زیادہ اعتراف ہوا مگر ڈاکٹر صفدر آہ، مانک ٹالا... وغیرہ کو نظرانداز کیا جاتا رہا۔ اس خاکسار شمیم طارق کو تو کوئی نہیں پوچھتا۔ ادیبوں کے مقدر اور مرتبے کا فیصلہ وہ کر رہے ہیں جن کے نامہ اعمال میں سازش، سفارش، گزارش اور خوشامد کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں۔ اردو زبان وادب میں دلوں کو فتح کرنے کی طاقت آج بھی ہے مگر سازش کرنے والوں نے اس زبان کی زمینی صورت حال کو بگاڑا ہے۔

س : آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: گھر، محلے، شہر میں اچھے اردو پروگرام کیے جانے چاہئیں۔ ایک واقعہ میں سناؤں جس ادارے میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے میں کام کرتا تھا، مہاراشٹر کے گورنر صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے انگریزی میں تقریر کی۔ بچوں نے اردو میں گیت پیش کیے۔ گیت سن کر وہ اردو بولنے لگے۔ انھوں نے پوچھا ایسے اردو پروگرام ٹی وی پر کیوں نہیں پیش کیے جاتے۔ اسی ادارے میں ایک سالانہ پروگرام ہوتا تھا۔ ایک صاحب اور ان کی بیگم نے پروگرام دیکھا تو اپنی بچی کو لے کر آئے کہ اس کو نویں یا دسویں کلاس میں داخلہ دیجیے، حالانکہ وہ کسی دوسرے

اسکول کی نویں یا دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟

ج: اردو کی کتابیں نہیں بکتی تھیں مگر جب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے میلہ لگانا اور کتابوں سے بھری گاڑی گھمانا شروع کیا تو کتابیں فروخت ہونے لگیں۔ 3 دن، 7 دن یا 11 دن کے کیمپ لگائے جائیں تو اردو رسم الخط کو بڑے طبقے میں مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ ہر عمر اور صلاحیت کے لوگ اردو رسم الخط سیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی سیکھ سکتے ہیں جو اردو اور اردو رسم الخط نہیں جانتے مگر اردو کی ادبی تقریبات کی صدارت کرتے ہیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

ج: ہندوستان کی علاقائی زبانیں اردو کے معاملے میں فراخ دل ہیں۔ بنگلہ، مراٹھی، کنڑ، تیلگو، تمل کے بارے میں تو ہمیں علم ہے کہ یہ زبانیں اردو کے الفاظ کو استعمال کرتی ہیں۔ اردو رسم الخط سیکھنے میں بھی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ موجودہ ہندی کئی ریاستوں میں بولی جاتی ہے پہلے اردو ہندی میں بلاوجہ کی رقابت پیدا کر دی گئی تھی۔ اب یہ رقابت رفاقت میں بدلتی جا رہی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے اردو اور ہندی شعبوں نے مل کر 'اردو اور ہندی کی ساجھی وراثت' کے عنوان پر دو روزہ سمینار منعقد کیا تھا۔ یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو جانتے ہیں؟

ج: بیٹی، بیٹا، بہو، پوتیاں سب انگریزی میڈیم کی ہیں مگر سب اردو بولتی ہیں۔ بیٹے کو اردو رسم الخط پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے مگر وہ بھی اردو ہی بولتا ہے۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاء اللہ میرے مرنے کے بعد بھی بچے اردو سے اپنا رشتہ باقی رکھیں گے۔ اردو میرے گھر میں بولی بھی جائے گی اور پڑھی بھی جائے گی۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟

ج: غیر اردو داں حلقے میں اردو کو متعارف کرانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انہیں یہ تاثر دیں کہ اردو ہندوستانی زبان ہے۔ اردو ہندوستان کی اکھنڈتا کی قائل ہے۔ یہ انتشار کا نہیں اتحاد کا درس دیتی ہے۔ اس کے پروگرام ایسے ہوں کہ لوگ ان میں بار بار شریک ہونے کی خواہش ظاہر کریں۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

ج: اچھے پروگرام ہوں گے تو امداد کرنے والے سامنے آئیں گے۔ ایسے افراد اور تنظیمیں ہیں جو پروگرام میں مدد دیتے ہیں مگر اب ہم شاید امداد حاصل کرنے کے بھی اہل نہیں رہ گئے ہیں جو شہرت پسند امداد دیتے ہیں وہ اسٹیج پر قبضہ کرتے ہیں اور اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔

ہندوستان کی علاقائی زبانیں اردو کے معاملے میں فراخ دل ہیں۔ بنگلہ، مراٹھی، کنڑ، تیلگو، تمل کے بارے میں تو ہمیں علم ہے کہ یہ زبانیں اردو کے الفاظ کو استعمال کرتی ہیں۔

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: نوودے ودیالوں، سینٹرل اور کانوینٹ اسکولوں میں اردو معقول تعلیم کے انتظام کو ترس رہی ہے۔ اگر کہیں ہے بھی تو اس کو معقول اور معیاری بنائے جانے کی ضرورت ہے۔

زبان کے ارتقا اور اشاعت و مقبولیت میں اپنے پرائے کی تمیز کی ہی نہیں جانی چاہیے۔ یہ تمیز کر کے گروہ بندی تو کی جا سکتی ہے، کوئی تعمیری مقصد نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ میں اردو میں لکھتا ہوں، کیا برا کرتا ہوں! جو لکھتا ہوں وہ پسند ہی کیا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے کئی ایسے ادبی کام کیے ہیں جو دوسروں نے بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ نیک نیتی، محنت و تربیت اور فیض رسانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اسی لیے نقصان اٹھا کر بھی میں اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ جن کی سرشت میں 'شر' ہے، وہ شوشے چھوڑتے رہتے ہیں مگر منہ کی بھی کھاتے ہیں۔ شکر ہے کہ میں ان میں نہیں جو لاکھ ڈیڑھ تنخواہ یا لاکھ پچاس ہزار پنشن لیتے رہنے کے باوجود کچھ نہیں کر سکے۔ آج ان کی حیثیت نشان عبرت کی ہے۔

ہندوستان میں اردو کو جو نقصان پہنچا ہے یا پہنچ رہا ہے اس کے پس پردہ تعصب، لسانی پالیسی اور زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیل پر تو ہماری نظر ہے مگر ہم اردو والے اپنی کوتاہیوں پر کبھی نظر نہیں کرتے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو شعبوں میں اردو کے فروغ کی عملی تدابیر پر شاید ہی کبھی غور کیا جاتا ہے۔ آج عالم یہ ہے کہ ایک طبقے یا جماعت کو یہ احساس بلکہ دعویٰ تو ہے کہ وہ اردو میں ڈگری یافتہ ہے مگر بیشتر کو یہ احساس نہیں ہے کہ اردو میں ڈگری یافتہ ہونے کے باوجود وہ اسمٰعیل میرٹھی کی یا پریم چند کی یا فکر تونسوی کی طرح زبان لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہیں۔ عام لوگ 'مصلّٰی' س سے اور قبرستان میں قبروں کے کتبے دیوناگری میں لکھنے لگے ہیں۔ 'ریختہ' والوں نے یہ احساس دلایا کہ اردو بولنے اور سیکھنے کی خواہش یا اردو کا گلیمر ان میں بھی ہے جو اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتے مگر اردو کے دو چار برگزیدہ استاذ اور تخلیق کار کے علاوہ بیشتر اسی کوشش میں رہے کہ اردو زبان، تہذیب، ادب اور روایت کو ان کے حوالے سے سمجھا جائے حالانکہ ان کا املا، جملہ غلط ہے اور وہ من جملہ بھی غلط ہیں۔ اچھی صحبتیں اور مجلسیں اجڑ گئیں، معیاری تقریبات کم ہی منعقد ہوتی ہیں جہاں کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔ ایسے میں معاشرے سے اردو زبان و ادب کا تعلق کیسے برقرار رہے گا؟ معاشرے سے زبان و ادب کا تعلق برقرار نہ رہ سکے تو برا نتیجہ ہی برآمد ہوتا ہے۔ اردو کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کو عوام نے زندہ رکھا ہے۔ نقصان پہنچایا ہے تو ان خود پسندوں نے جن کا کھلے عام یا ڈھکے چھپے دعویٰ ہے کہ اردو ان سے ہے وہ اردو سے نہیں۔

■

Shamim Tariq
Flat No: 27, 4th Floor, Marzban
Mansion Byculla
fruit Market
Mumbai- 400024 (MS)

سیدہ جعفر

مضمون اور اس کا فن

مضمون کا آغاز

مضمون یا ''اسے'' (Essay) اپنی اصطلاحی شکل اوراپنے لفظی پیکر کے اعتبار سے مغرب کی دین ہے اور مغرب میں نثر کی ایک ممیز ادبی صنف تصور کیا جاتا ہے۔ فرانس میں مانٹیں Montaigne (1571) نے اس کا آغاز کیا تھا۔ اس صنف کی صورت گری اور تشکیل ونشوونما کے مختلف محرکات رہے ہیں۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیت اور ہیئت اجتماعی کے مختلف شعبوں کی روز افزوں گہما گہمی نے طویل ادبی کارناموں کے مطالعے کی فرصت چھین لی۔ 'فرصت کاروبار شوق' کی کمی نے 'ذوق نظارہ جمال' کے نئے معیار اور نئے سانچوں کو متعارف کروایا۔ میقاتی رسالے اور اخبارات کی ترویج نے 'اسے' یا مضمون کی مانگ بڑھادی۔ قاری اب طویل وبسیط کارناموں کے بجائے اسے ادب پاروں کا متمنی تھا جن میں ایجاز واختصار، ادبی ذوق کی تسکین کے سامان، فکرانگیزی اور زندگی کی مزاج شناسی موجود ہو اور مضمون یا اسے میں ان کی پذیرائی کے امکانات موجود تھے جس نے اس ادبی صنف کو مقبولیت عطا کی اور صنفی اہمیت تسلیم کروائی۔

مانٹیں (Montaigne)، Miechael De Montaigne (1533-1592) نے پہلے پہل اسے نئے قسم کی تحریریں پیش کیں وہ عالمی انشائیہ کا موجد ہے۔ سیاسی زندگی سے سبکدوش ہونے کے بعد اس نے اپنے تجربات اور تاثرات نوٹس (Notes) کی شکل میں قلمبند کرنے شروع کیے۔ جس وقت مانٹیں یہ نوٹس لکھ رہا تھا اسے یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ادبیات عام میں نثر کی ایک نئی صنف متعارف کروا رہا ہے۔ مانٹیں نے اپنے ان نوٹس کو 'اے سیز' (Essays) کے نام سے شائع کروایا اور یہ اتنے مقبول ہوئے کہ یورپ اور انگلستان میں ان کے چرچے ہونے لگے۔ اور مانتیں کے تتبع میں انگریزی اور دوسری زبانوں سے 'اسے' لکھے جانے لگے۔

مضمون کی اصطلاح

'اسے' کی اصطلاح اب ایک متعین صنف ادب کے لیے استعمال ہوتی ہے اس کا ماخذ ایک فرانسیسی لفظ Assay ہے جس کے معنی سعی اور کوشش کے ہیں۔ یہ قدیم فرانسیسی لفظ Essai سے ماخوذ ہے جس کا لاطینی ماخذ Exgagium (تولنا) ہے Exagere کوشش کرنا اور جانچنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(دی کنگ سائز آکسفورڈ ڈکشنری آف کرنٹ انگلش، ص 386)

انگریزی میں یہ لفظ املا کے تغیر کے ساتھ فرانسیسی ہی سے لیا گیا ہے چاسر Chacer نے لفظ Assay استعمال کیا ہے لیکن تجربے اور جائزے کے معنی ہیں۔ گالنز کے پاس یہ لفظ کوشش اور جدوجہد کے معنی میں استعمال ہوا ہے لفظ 'اسے' بطور فعل بھی برتا گیا ہے اور اس لفظ کے معنی تجربہ کرنے کے ہیں۔ شیکسپیئر کی تخلیقات میں یہ لفظ Assay کی صورت میں فعل کے طور پر آیا ہے۔

اصطلاح کا استعمال

ابتدائی دور میں اسے کی اصطلاح اسے مضامین کے لیے استعمال ہوتی تھی جو بقول ارل آف برکن ہیڈ (Earl of Birken Head) اس اصطلاح کے 'مستحق' نہ تھے یعنی جن پر پوری طرح اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا جان لاک (John Lock) نے 1690 میں اس اصطلاح کو اپنی ضخیم فلسفیانہ کتاب کے لیے تجویز کیا تھا اوراس کا نام 'این اسے کنسرنگ ہیومن انڈراسٹانڈنگ' (An Essay Concerning Human Understanding) رکھا۔ لیکن قاری کو شبہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اٹھارہ سالہ گہرے مطالعے کے نتائج کو محض ایک جائزہ کہا تھا یا سنجیدہ مسائل میں الجھے رہنے والے ذہن کے لیے تفریح کی چیز سمجھ کر اس کے لیے یہ نام منتخب کیا تھا کیونکہ اسی سال اس نے دو سیاسی رسالے تصنیف کیے اور ان رسالوں کا نام اس نے 'ٹری ٹائز آن سیول گورنمنٹ' (Trestise On Civil Government) رکھا۔ اٹھارویں صدی کے اکثر مصنفین نے جان لاک کی پیش کردہ مثال کی تقلید کی اور 'ایس اے' کے نام پر اسے نثر پارے کا استعمال کیا جس میں کوئی قصہ بیان نہ کیا گیا ہے۔ جان ڈرائی ڈن (John Dryden) نے ادبی جمالیات (Literary Aesthtics) پر لکھے ہوئے سلسلے کے لیے یہ نام تجویز کیا۔ پوپ (Pope) نے معاشرت پر تنقید کے مجمع کو ''این اسے آن مین'' (An essay on Man) کہا۔

مضمون بطور صنف ادب

مضمون یا اسّے کسی خاص موضوع کے بارے میں انشاپرداز کے خیالات اور جذبات کے ردعمل کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا ادب پارہ ہوتا ہے جس میں بیک وقت فکر انگیزی خیال کی اعتمادی تاثرات کی دلفریب ترجمانی اسلوب کا نکھار اور تصور کی لطافت سب ہی عناصر سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ مضمون ہمارے ذہن کو ایک خاص ذوق آگہی بخشتا اور ہمارے جذبات میں ایک انبساط پرور تازگی اور تابناکی پیدا کرتا ہے۔ خواہ اس کا موضوع 'آرائش خم کاکل' ہو یا 'اندیشہ ہائے دور دراز' کی قبیل کا۔ مضمون کی صنف میں بڑی لچکداری اور اس کے موضوعات میں خاصی گہرائی اور وسعت ہے۔ اس صنف ادب کے وسیلے سے بہت سے کام لیے گئے ہیں۔ کبھی یہ صنف سماجی اور ذہنی بیداری کے حربے کے طور پر استعمال ہوئی ہے تو کبھی اصلاحی اور افادی مقصد کی اشاعت کے لیے۔ کبھی انسانی جذبات کی حسین اور رنگین مرقع کشی کے لیے۔ مضمون یا اسّے کے ذریعے سے مزاح اور ظرافت کی پھلجڑیاں بھی چھوڑی گئی ہیں اور طنز کے تیر بھی برسائے گئے ہیں لیکن ہر صورت میں مضمون کی صنف سے اس کا یہ مقصد وابستہ رہا ہے کہ وہ انسانی جذبات اور خیالات کی عکاسی کرے۔

مضمون کی ماہیت

مضمون کی ماہیت اس کی تکنک اور اس کے فنی خد وخال کے بارے میں بھی مختلف ادیبوں اور نقادوں نے مختلف تصورات اور اصول پیش کیے ہیں۔ جی ای ہڈسن (G.E Hudson) اپنی کتاب انگلش لٹریچر (English Literature) میں اسّے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''اسّے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی مقصد کے باہم جوڑ دیے گئے ہوں۔ اسّے قصداً سوچا سمجھا اور آسان لیکن مربوط اصولوں کی مدد سے مناسب انداز میں اس شخص، چیز یا خیال کے متعلق ایک جائزہ ہوتا ہے جو مضمون نگار کو دلچسپ اور اہم معلوم ہو''۔

(جی ای ہڈسن۔ انگلش لٹریچر، باب چہارم، ص227)

اوپر کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہڈسن کے خیال میں مضمون یا اسّے کو ایک خاص مقصد کی نمائندگی کرنی چاہیے۔ اور یہ کہ اس کے کچھ مربوط اور منظم اصول بھی ہوں جن کی روشنی میں وہ کسی خاص شخص چیز یا خیال کا جائزہ لے سکے لیکن ایچ واکر (Hugh Walker) اس تصور سے اختلاف کرتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب انگلش ایسز اینڈ ایسیسٹس (English Essays and Essayists) میں لکھا ہے کہ اسّے (مضمون) ایک ایسی صنف ہوتی ہے جو باقاعدہ اور سخت اصولوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک آزاد قسم کی تحریر ہوتی ہے۔ واکر نے اپنے اس خیال کی تائید میں ڈاکٹر جانسن کا قول بھی نقل کیا ہے۔ لکھتا ہے:

''اسّے (مضمون) کیا ہے اس سوال کے متعلق دو تصورات ہیں ایک تو یہ کہ وہ مختصر مضمون ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسّے آزاد تحریر ہوتی ہے۔ موخرالذکر ڈاکٹر جانسن کا تصور ہے جو نہ صرف ایک عظیم انشاپرداز بلکہ خود ایک ممتاز ایسیسٹ بھی تھا۔ اس نے اسّے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ 'اسّے' ذہن کی آزاد پیداوار اور ایک غیر تحلیل شدہ چیز ہوتی ہے نہ کہ باقاعدہ اور باضابطہ تحریر۔''

اسّے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی مقصد کے باہم جوڑ دیے گئے ہوں۔ اسّے قصداً سوچا سمجھا اور آسان لیکن مربوط اصولوں کی مدد سے مناسب انداز میں اس شخص، چیز یا خیال کے متعلق ایک جائزہ ہوتا ہے جو مضمون نگار کو دلچسپ اور اہم معلوم ہو۔

(ایچ واکر۔ انگلش ایسیز اینڈ ایسیسٹس۔ باب اول، ص1)

مضمون کی تعریف

''آکسفورڈ ڈکشنری نے ان دونوں تعریفوں کو جوڑ کر اسّے کی فنی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا گیا کہ اسّے معقول طول کی ایک ایسی تصویر ہوتی ہے جس میں تکمیل کا احساس تشنہ رہ جائے'' یعنی یہ کہ کسی خاص موضوع پر انشاپرداز کے جذبات اور تاثرات 'اسّے' کو ظاہر کرتا ہے۔ اشیا کی نوعیت کے متعلق فیصلے صادر کرنا اور کوئی قطعی رائے دینا 'اسّے' کے فرائض میں داخل نہیں۔'' (دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری، ص327)

مرے (Mure) بھی اسی خیال کا حامی ہے۔ نقادوں اور انشاپردازوں نے اسّے کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ان تعریفوں میں اتنا اختلاف اور ایسی رنگارنگی ہے کہ 'کثرت تعبیر' نے اسّے کو 'خواب پریشاں' بنا دیا ہے۔

''ارل آف برکن ہیڈ (Earl of Birken Head) نے آکسفورڈ ڈکشنری واکر اور جی ای ہڈسن کی تعریفوں کے برخلاف ہنڈرڈ بسٹ انگلش ایسیز میں (Hundred Best English Essaya) یہ بتایا ہے کہ اسّے آرٹ کا ایک ایسا طریقہ عمل ہے جو محض اس لیے ہوتا ہے کہ انشاپردازی اپنی یادگار باقی رکھے اور اس عمل میں ایسیسٹ کو ایسی ہی مسرت حاصل ہوتی ہے جیسی کسی دوسرے شخص کو اس کے باغ گھوڑوں اور دوستوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔'' (باب اول، ص1)

ارل آف برکن ہیڈ نے اسّے کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صنف کا مقصد محض مسرت بخشنا اور دلچسپی عطا کرنا ہے۔ مصنفین اور نقادوں نے اسّے کی تعریف کے بارے میں اتنے متنوع خیالات کا اظہار کیا ہے کہ بقول ہنری ہڈسن (Henry Hudson) اگر ہم ان کے ذریعے سے اسّے کی صنف کو سمجھنے کی کوشش کریں تو تصورات کے اس اختلاف اور انتشار میں اسّے کی ماہیت گم ہوتی نظر آتی ہے۔

(ولیم ہنری ہڈسن۔ انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر، ص331)

اس کا سبب ہڈسن نے یہ بتایا ہے کہ اسّے کے مواد اس کے موضوعات اس کے مقاصد اور اسالیب میں اتنی ہمہ گیری اور بوقلمونی ہے کہ نقاد کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ کہ چند اصولوں اور ضوابط میں اس کے وسیع تصور کا احاطہ کر سکے۔

(انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر، ص331)

اپنی کتاب انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر (Introduction to the Study ofLiterature) میں ہڈسن نے اسّے کی صنف کے بارے میں اپنے اس تصور کی وضاحت کی ہے۔ ادب میں شاید ہی کوئی صنف اتنی متنوع اقدار کی حامل اور مابہ النزاع ہوگی جتنی کہ اسّے کی صنف ہے۔ (Usage) نے تو یہاں

تک کہہ دیا ہے کہ اسّے کے لیے نثر کی بھی قید نہیں۔

(ایچ واکر: انگلش ایسیز اینڈ ایسٹس، باب اول، ص 3)

یہ خیال غالباً اس لیے ظاہر کیا گیا ہے کہ انگریزی ادب میں لفظ اسّے نثر سے پہلے نظم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ انگریزی کے اولین مضمون نگار بیکن (Bacon) کے مضامین سے پہلے اسّے کا لفظ نظم کے لیے استعمال ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ہم اسّے آف اے پرنٹس ان دی ڈی وائن آرٹ آف پوئٹرک (Essay of a Prentice in the Devine Art of Poetric) کو لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اسّے کا لفظ نظموں کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ اٹھارھویں صدی میں اسّے آن کرٹی ٹیسیزم (Essay on Criticism) اور انیسویں صدی میں اسّے آن مین (Essay on Man) اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

''بعض نقادوں کے خیال میں اسّے یا مضمون ایک نہایت سہل اور سطحی صنف ادب ہے۔ کریبل (Crable) کہتا ہے کہ اسّے لکھنا ان مصنفین کے لیے موزوں ہے جن کے پاس گہری معلومات اور ادب کا ذاتی جوہر موجود نہیں ہوتا۔

(ولیم ہنری ہڈسن۔ این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف لٹریچر، ص 34)

کریبل کے برخلاف سان بیو (San Bue) اسّے کو ادب کی مشکل ترین صنف سمجھتا ہے اور اسّے نہایت محو کن اور خوشگوار اور ادب پارہ تصور کرتا ہے۔ اس کے خیال میں اسّے کچھ سطحیت برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک اور نقاد اسمتھ (Smith) نے ارل آف برکن ہیڈ کی طرح اسّے کے خالص ادب ہونے پر زور دیا ہے۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے زیادہ ایڈمنڈ گوس (Edmund Gosse) کی یہ تعریف جامع اور قابل قبول معلوم ہوتی ہے جس میں اس نے ان تمام تصورات کا نچوڑ اور حاصل پیش کردیا ہے۔ لکھتا ہے۔ ''اسّے معقول طریقے کا ایک نثری خاکہ ہوتا ہے جس میں قواعد اور ضوابط کی پابندی سے آزاد ہو کر سرسری انداز میں کسی شئے یا موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے ذاتی خیالات اور احساسات کو دلنشیں پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔''

(اعجاز حسن: نئے ادبی رجحانات، ص 247)

مضمون کا طول

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانکیا میں اسّے اور اس کے

اسّے معقول طریقے کا ایک نثری خاکہ ہوتا ہے جس میں قواعد اور ضوابط کی پابندی سے آزاد ہو کر سرسری انداز میں کسی شئے یا موضوع پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے ذاتی خیالات اور احساسات کو دلنشیں پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔

طول کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ اوسط طول کا کمپوزیشن ہوتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا۔ انسائیکلوپیڈیا ایڈیشن 14، جلد 8، ص 716)

ایچ واکر (Hugh Walker) کا طول مختصر ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب میں طویل انشائیے لکھے گئے ہیں جیسے جان لاک (John Locke) کا اسّے کنسرننگ ہیومن انڈر اسٹینڈنگ (An Essay Concerning Human Understanding) لیکن جی ای ہڈسن (G.E Hudson) لکھتا ہے کہ یہ دونوں تصانیف اسّے کے طول کی سرحدوں سے آگے بڑھ گئی ہیں۔ جس طرح اسّے کی تعریف کے بارے میں ادیبوں اور نقادوں میں اختلاف رائے ہے اسی طرح اسّے کے طول کے متعلق بھی نقاد متفق نہیں ہیں۔ اسّے کی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے انگلش لٹریچر میں ای وی ڈان (E.V Don) لکھتا ہے کہ اسّے کا موڈ اور اس کا موضوع اس کے طول کا تعین کرتا ہے۔ اس نے طویل اسّے میں فرانسس بیکن (Francis Bacon 1561-1626) کے اسّے آف اڈورسٹی (Essay of Adversity) کا حوالہ دیا ہے جو چار سو الفاظ پر مشتمل ہے۔ اور اس نے ڈی کوئنسی (De Quency) کے اسّے مرڈر ایز اے فائن آرٹ (Murder As A Fine Art) کا تذکرہ کیا ہے جو 24 ہزار الفاظ میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ بتانا چاہا ہے کہ اسّے کے طول کو ہم اصول اور قوانین کے ذریعہ سے مقرر نہیں کرسکتے۔ بلکہ اسّے کا مواد اور اس خاص موضوع پر مضمون نگار کے روشنی ڈالنے کا انداز اس کے طول کو گھٹاتا اور بڑھاتا رہتا ہے۔ (ای وی ڈان: انگلش لٹریچر، باب 5، ص 167)

مضمون کا موضوع

اسّے کی تعریف اور اس کے طول کی بحث کے برخلاف مضمون یا اسّے کے موضوع کے متعلق نقادوں اور انشا پردازوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بڑی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ ڈبلیو ایچ ہڈسن اسّے کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ اسّے کا موضوع غیر محدود ہوتا ہے۔ ایچ واکر (H.Walker) نے بھی اسّے کے موضوع کو غیر محدود اور وسیع بنایا ہے اور لکھا ہے۔ ''ستاروں سے لے کر خاک کے ذروں اور امیبا سے لے کر انسان تک کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جو کسی اسّے کا موضوع بحث نہ بن سکتا ہو''۔ (A loose salley of mind unirregular undigested piece) نے بتایا ہے اس کو عدم تکمیل کا احساس اسّے یا مضمون کے موضوع پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ مضمون نگار مواد اور عنوان کے انتخاب میں آزاد ہوتا ہے اور وہ چھوٹی یا عظیم سے عظیم حقیقت کو اپنے مضمون میں پیش کرسکتا ہے اس طرح دنیا کی کوئی بھی چیز مضمون کا موضوع بن سکتی ہے۔

اسمتھ کا خیال ہے کہ:

''دنیا ہر طرف موضوعات برسا رہی ہے صرف انسان کو ہم آہنگ ہونے کی دیر ہے۔''

(اعجاز حسین: نئے ادبی رجحانات، ص 248)

مضمون کی قسمیں

مضمون یا اسّے کی مختلف قسموں اور اس کی جماعت بندی کے طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے ارک مک کالون Eric Mc Collon لکھتا ہے۔

اسّے کی کئی قسمیں ہیں جن میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم یہ قسمیں ہیں:

1- **ادبی مضامین**: اس میں انگریزی کے تمام عظیم ترین اسّے لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہیں۔ بیکن، ایڈیسن، لیمپ، ہیزلٹ اور لی ہنٹ کے مضامین سے لے کر حالیہ انشا پردازوں رابرٹ لینڈ، جی کے چسٹرٹن

اور میکس بیولر کے مضامین تک شامل ہیں۔ ادبی انشائیہ نگار اس صنف کو اپنے ذاتی خیالات اور فلسفہ حیات سمجھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

2. **تنقیدی مضامین** : اس عنوان کے تحت اشیا اور موضوعات کے مطالعے آسکتے ہیں جیسے مکالمے کا مضمون جو لارڈ کلائیو پر لکھا گیا ہے۔

(ارک میک کالون۔ اے ریفرنس کورس آن اسے۔ رپورٹ اینڈ پری رائٹنگ، ص26)

آگے چل کر ارک مک کالون نے صحافتی مضامین، سائنٹفک مضامین واقعاتی اور تاریخی مضامین وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے مضامین کی جو تقسیم کی ہے اس میں مضمون کی تمام اہم قسمیں آگئی ہیں۔ مضمون میں چونکہ سماجی، سیاسی، تاریخی اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اس لحاظ سے انھیں ارک مک کالون نے زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ مرتب مقالہ نے باب آٹھ اور نو میں مضامین کی اسی طرح تقسیم کی ہے Hugh Walker نے اس قسم کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کو ایک زمرے میں رکھا ہے۔ اس طرح واکر نے مضامین کی صرف دو قسمیں بتائی ہیں۔ موخر الذکر کو وہ 'بہترین' Par excellence 'پارا کسی لنس' کہتا ہے اور اول الذکر کو 'عام' موضوعات سے متعلق تعبیر کرتا ہے۔

مضمون کی خصوصیات

ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اسے یا مضمون کو دوسری تحریروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ اسے یا مضمون کے اقتضا اور اس کی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے Virginia woolf ورجینیا وولف لکھتی ہیں:

''اسے میں جو اصول کارفرما دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسرت میں اضافہ کرے اسے کو اسی مقصد کی تکمیل کرنی چاہیے۔ اسے اپنے پہلے لفظ ہی سے ہم پر ایسا جادو کرے جو اس کے آخری لفظ ہی پر ٹوٹے۔''

(ورجینیا وولف۔ ماڈرن اسے (مضمون) کامن ریڈر، ص267)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دلچسپی پیدا کرنا اور قائم کرنا اسے کا پہلا فرض ہے۔ مختلف اصناف ادب میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے مختلف عناصر سے کام لیا جاتا ہے۔ افسانہ اور ناول میں کہانی، نظم میں غنائیت اور اسے میں دلچسپی۔ دلچسپی کا فقدان اسے کی موت ہے۔ مضمون نگار دلچسپی قائم رکھنے کے لیے مختلف وسیلوں اور مختلف طریقوں سے کام لیتا ہے۔ کہیں اسلوب بیان کی دلکشی، کہیں خیالات و جذبات کی ندرت اور کہیں مزاح اور طنز کے ذریعے سے وہ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھتا ہے۔

اسے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ادیب کی شخصیت اس کے مذاق، جذبات اور تاثرات اور اس کے نظریہ حیات کی ترجمانی کرے اور اسے کے آئینے میں مضمون نگار کی ذات اس کے فن شعور اور ادبی مزاج

انشائیہ نگاران سب کو جتنے بڑے
انداز میں جتنی زیادہ دلکشی سے
جتنے زیادہ موثر اسلوب میں جتنے
زیادہ نئے پن کے ساتھ کہے گا وہ
اتنا ہی بڑا انشائیہ نگار کہلائے گا۔

کا عکس نمایاں طور پر دکھائی دے۔ اسے کی ان ہی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مانتیں Montiagne نے جو اسے کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے لکھا ہے ''میں اسے میں اپنی تصویر کھینچتا ہوں'' اس بات کو پریچڈ Prichard 'شخصیت کا اظہار' کہتا ہے۔ شخصیت کے اظہار کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے اس سے کسی فن کار کی ذات بے نقاب ہوتی ہے۔ پریچڈ اپنی کتاب گریٹ ایسیز آف آل نیشنز Great Essays of All Nations میں لکھتا ہے:

''اسے اپنی اس خصوصیت میں شاعری سے مشابہ ہے۔ (ایف ایچ پریچڈ۔ گریٹ ایسیز آف آل نیشنس، ص4)

ڈبلیو ہڈسن کا کہنا ہے کہ اسے لازمی طور پر شخصی جذبات و خیالات کا اظہار ہوتا ہے اس کی دانست میں مضمون یا اسے کا مرکزی تصور یہ ہے کہ وہ بحث کے دوران مضمون نگار کے ذہن اور اس کے کردار کو راست طور پر نمایاں کردے۔ الیگزنڈر اسمتھ Alexender Smits نے بھی اسے میں داخلیت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ورجینیا وولف بھی ہڈسن اور اسمتھ کی ہم خیال ہے۔

مضمون، مقالہ اور انشائیہ کا فرق

انگریزی ادب میں اسے رسمی اور غیر رسمی یعنی فارمل اور ان فارمل ہوتا ہے۔ موخر الذکر کو Parexcellence کا نام دیا گیا ہے۔ اردو میں مقالہ، مضمون انشائیہ اپنے ادبی مزاج اور بعض وقت موضوع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممیز کیے گئے ہیں۔ وزیر آغا لکھتے ہیں کہ انشائیہ اس نثری صنف کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازگی اور نئے انداز فکر کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخلیقی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم آگے آکر نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وزیر آغا نے انشائیہ کے خدوخال میں ورجینیا وولف لیوئس رابرٹ لینڈ اور بریسٹلے گارڈ وغیرہ کو انگریزی کے نمائندہ انشائیہ نگار بتاتے ہوئے انشائیہ اور مقالے کا فرق اس طرح واضح کیا ہے کہ مقالے کی نسبت انشائیے کا ڈھانچہ کہیں زیادہ لچکیلا elastical ہوتا ہے اس میں مقالے کی سنگلاخ کیفیت موجود نہیں ہوتی۔

(ایف ایچ پریچڈ گریٹ ایسیز آف آل نیشن، ص4)

اکبر حمیدی انشائیے کے بارے میں اپنی کتاب 'جدید اردو انشائیے' میں لکھتے ہیں۔ انشائیہ میں پند و عظمت اور رشد و ہدایت کا رنگ غالب نہیں ہوتا۔ موزے ننگ کے الفاظ میں 'ادب کو پوسٹر نہیں بننا چاہیے'۔ ادب میں سب سے زیادہ اہمیت اس لطف و مسرت کو حاصل ہوتی ہے جو ہم کسی ادب کے ذریعے اکتساب کرتے ہیں اور جس میں مقصدیت جاری و ساری ہوتی ہے۔ آگے چل کر تحریر کیا ہے:

''انشائیہ نگاران سب کو جتنے بڑے انداز میں جتنی زیادہ دلکشی سے جتنے زیادہ موثر اسلوب میں جتنے زیادہ نئے پن کے ساتھ کہے گا وہ اتنا ہی بڑا انشائیہ نگار کہلائے گا۔''

(اکبر حمیدی: جدید اردو انشائیہ ص9، اکادمی ادبیات پاکستان 1991)

■

ماخذ: اردو ادب میں مضمون کا ارتقا، **مصنفہ:** سیدہ جعفر، **پہلی اشاعت:** 2019، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ستار ساحر

آندھرا پردیش میں دکنی تحقیق اور تدریس

روایت اور معاصر صورت حال

اردو ادب کے وزن و وقار، اعتبار اور رنگ و نکھار کا شاندار قصر دکنی شعر و ادب کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے۔ ہمارے جن بزرگوں نے دکنی ادب سے دلچسپی لی، ان کا زاویہ تحقیقی رہا اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ انہی کی مسلسل محنتوں اور کاوشوں کے نتیجے میں آج دکنیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ تاہم یہ بات بھی کافی اہمیت رکھتی ہے کہ دکنی شعر و ادب کا تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ ابھی حال حال کی بات ہے، حق تو یہ ہے کہ ابھی حق ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ دکنیات کا تجزیاتی مطالعہ اور دیگر پہلوؤں سے جائزہ جس قدر گیرائی اور گہرائی کا حامل ہوگا۔ دکنی شعر و ادب کی اہمیت فزوں تر ہوتی جائے گی۔

دکن میں نویں صدی ہجری ہی سے بزرگانِ دین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ان کے تحریر کردہ چھوٹے چھوٹے مذہبی رسائل اور نظمیں دکنی زبان کے اولین نمونے قرار پائے۔ ایسے بزرگوں میں جنھوں نے نویں، دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں دکن کا رخ کیا، بالخصوص حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، شیخ بہاء الدین باجنؒ، میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، سید میراں حسینیؒ، شاہ علی جیوگام دھنی وغیرہ قابل ذکر ہیں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اور میراں جی شمس العشاقؒ کے خانوادوں نے خانقاہی تعلیم اور مذہبی فکر کو دکنی زبان میں عام کیا۔ اس کام کو ان بزرگوں کی اولاد و خلفا اور مریدوں نے بھی آگے بڑھایا اس طرح دکنی زبان میں تصوف، اخلاقیات اور دینی علوم کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہوگیا جس کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہ سرمایہ دکنی نظم و نثر کی شکل میں ملتا ہے جو دکنی زبان کے فروغ کا باعث بنا۔

خانوادۂ شہ میریہ، آندھرا پردیش کا عالم و فاضل گھرانہ ہے۔ شہ میری اولیا ایک طرف مشہور زمانہ صوفی حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت کی اولاد سے ہیں تو دوسری طرف حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان سے نسبی رشتہ رکھتے ہیں۔ حضرت سید جمال الدین بخاری ملتان سے ہندوستان آئے اور گلبرگہ پہنچ کر آپ نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی پڑپوتی سے عقد کیا۔ حضرت سید جمال الدین بخاری کے پوتے

دکنیات کا تجزیاتی مطالعہ اور دیگر پہلوؤں سے جائزہ جس قدر گیرائی اور گہرائی کا حامل ہوگا۔ دکنی شعر و ادب کی اہمیت فزوں تر ہوتی جائے گی۔

سید کمال الدین بخاری اول گلبرگہ سے بیجاپور ہوتے ہوئے آندھرپردیش کے شہر کرنول سے گزر کر کڈپہ پہنچے اور یہاں سے رایچوٹی کا رخ کیا اور وہیں پر مستقل قیام فرمایا۔ آپ کا وصال گرم کنڈہ (ظفر آباد) میں ہوا اور آپ کا مزار گرم کنڈہ میں مرجع خلائق ہے۔ خانوادۂ شہ میریہ حضرت سید جمال الدین بادشاہ بخاری، رایچوٹی کے بڑے فرزند حضرت شاہ میر بادشاہ بخاری (اول) تلپول، کدری تعلقہ کے اسم گرامی سے منسوب ہے جن کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف 'دکن میں اردو' میں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس دور کے صوفی اور شاعر شاہ میر ہیں۔ آپ کا نام سید محمد حسین تھا۔ حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت بخاری کی اولاد میں شامل تھے۔ 1018 ہجری میں تولد ہوئے یعنی آپ کا بچپن بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا آخری دور ہے کئی انقلاب آپ کی نظر سے گزرے 1186 ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کو اپنے والد سے بیعت اور خلافت حاصل تھی آپ کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ایک سو پانچ سال کی عمر ہوئی۔ آپ کا مزار تلپول، ضلع اننت پور (آندھرا) میں واقع ہے۔ 5 جمادی الثانی کو ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

شاہ میر کی نظم و نثر کی کئی ایک تصانیف ہمدست ہوتی ہیں جن میں سے اسرار التوحید، رسالۂ عینیت و غیریت، رسالۂ قادریہ، عقائدِ صوفیہ اور دیوان قابل تذکرہ ہیں۔'' (ص:377)

'اسرار التوحید' دکنی اردو میں علم تصوف کی مختصر اور جامع کتاب ہے۔ ان کی ایک اور تصنیف 'انتباہ الطالبین' بھی ہے۔

حضرت شاہ کمال (ثانی، جامی دکن) کے دیوان 'مخزن العرفان' کو اسی خانوادہ کے جواں سال سجادہ

نشین سید شاہ میر قادری شہ میری نے 2010 میں مع فرہنگ ترتیب دیا ہے جو 680 صفحات پر مشتمل ہے۔

گرم کنڈہ (تاریخی نام ظفر آباد) ضلع اننا میا، آندھرا پردیش کے ایک اردو استاد شاعر و محقق ڈاکٹر تقی اللہ خان تقی نے بعنوان 'حضرت شاہ کمال (جامیِ دکن) کے دیوان مخزن العرفان کا ادبی، لسانی اور تحقیقی مطالعہ، 2018 میں جامعہ سری وینکٹیشورا، تروپتی میں ڈاکٹر محمد نثار احمد کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کر کے ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے میں موصوف نے 'مخزن العرفان' کی ادبی اہمیت و افادیت واضح کی ہے۔

قاری جی۔ ہدایت اللہ لطیفی رشادی نے خانوادۂ شہ میریہ کے صوفی شاعر 'حضرت شاہ کمالؒ (جامیِ دکن): حیات اور کارنامے' عنوان سے پروفیسر سید عبدالستار ساحر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ 2019 میں سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی میں داخل کیا۔ جس پر انھیں جامعہ نے پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔ پانچ ابواب پر مشتمل اس مقالے میں انھوں نے جامیِ دکن کی حمد، مناجات، نعوت، سلام، مراثی، مثنویات، قصائد، رباعیات، غزلیات و دیگر کلام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ خاص کر ان کی تصانیف کی فہرست سازی کرتے ہوئے ان کے دیوان مخزن العرفان سے متعلق یہ رائے پیش کی ہے کہ یہ دکنی اردو میں ہے علم و ادب اور فن کے اعتبار سے اسے دکنی ادب کا ایک عظیم شہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔

شاہ کمال کا ابتدائی زمانہ ولی دکنی کا آخری زمانہ تھا اور آپ کے معاصر و قریب العہد سراج دکنی، سید محمد خاکی، عارف الدین خان عاجز، عبدالولی عزلت، شاہ قدرت اللہ بلیغ اورنگ آبادی اور غلام علی آزاد بلگرامی رہے ہیں۔

شہر کڈپہ (آندھرا پردیش) کے متوطن ڈاکٹر راہی فدائی کی تحقیقی و تنقیدی تصانیف ادبی اہمیت کی حامل ہیں مثلاً باقیات ایک جہاں، اکتساب نظر، مسلکِ باقیات، کڈپہ میں اردو، جوئے شیر، مدرسۂ باقیات الصالحات کے علمی و ادبی کارنامے، ویلور تاریخ کے آئینے میں، قلم رو فکر اور علاقہ کڈپہ کے نایاب تاریخی کتبے وغیرہ۔

'اکتساب نظر' تحقیقی مضامین کا انتہائی قابل قدر مجموعہ ہے۔ جس میں ہاشمی بیجاپوری کی مثنوی، یوسف زلیخا، کا ایک نو دریافت مخطوطہ' وشارم میں اردو، اختر کڈپوی ان کی مثنوی در مدح ٹیپو سلطان اور جنگ آزادی اور علمائے جنوب مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

'قلم رو فکر' میں موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ ''فرہنگ آنند راج کے مؤلف آنند راج نہیں بلکہ منشی محمد پاشاہ متوطن وجیا نگرم ہیں، جنھوں نے اپنے حکمران مہاراجہ آنند گجپتی راج کے نام اسے منسوب کیا۔ مولانا نے نصرتی کے ایک اور فارسی قصیدے کو دریافت کر کے ہماری زبان شمارہ اکتوبر 1995 میں شائع کیا۔

'کڈپہ میں اردو' راہی فدائی کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ جس میں موصوف نے شہر کڈپہ کی تین سو سالہ ادبی تاریخ کو سمیٹ کر اس کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن 1992 میں شائع ہوا تھا، اور دوسرا 2012 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ موصوف نے اپنی تحقیقی بصیرت کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ قدیم ترین اردو دکنی تصنیف محمد ابن رضا کی مثنوی 'قصیدہ بردہ' ہے وہ لکھتے ہیں:

دکنی میں قدیم اردو کی تصانیف کا سراغ لگا کر جس طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کے ماضی میں تقریباً 200 برس کا بے نظیر اضافہ کیا۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے 'کڈپہ میں اردو' لکھ کر علاقائی ادب بلکہ دکنی ادب کی تاریخ میں بڑا پائیدار اور بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

''دنیا کی مختلف زبانوں میں اس قصیدے کے ترجمے ہوئے مگر اس کو دکنی زبان میں ترجمہ کرنے کا شرف محمد ابن رضا کو عطا ہوا۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق قصیدہ بردہ کا یہی اولین اردو ترجمہ ہے تاحال اس کے صرف دو نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک کتب خانۂ سالار جنگ، حیدرآباد کا مخزونہ ہے اور دوسرا انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔''

(کڈپہ میں اردو، ص 15,16)

'قصیدۂ بردہ شریف' کے دکنی اشعار اور کڈپہ کی اہم تاریخی مسجدوں کے کتبوں پر ترقیم فارسی اشعار کی روشنی میں موصوف نے محمد ابن رضا کے اصل نام، تخلص اور قصیدہ کے سنہ تصنیف وغیرہ سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں جو تحقیق کے میدان میں مولانا کی لگن اور ان کے انہماک پر دال ہے۔

نواب عبدالحمید خان میانہ (کڈپہ) کے درباری شاعر محمد حیدر المتخلص بہ ابن جعفر نے اپنے شاگرد رشید عبدالکریم عرف کرمو میاں کی فرمائش پر ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' (1066ھ) میں 341 اشعار کا اضافہ کیا تھا مولانا کے الفاظ میں ابن جعفر نے ابن نشاطی کے اختتامی شعر۔

عدالت کار کہ، اپنی سیس پر تاج
فراغت سوں کرتا رہا راج

کے بعد بطور تکملہ تین سو اکتالیس اشعار میں شادی بیاہ کی تفصیل جیسے مقامی رسم و رواج تہذیب و تمدن اس وقت کے زیورات، اشیائے خورد و نوش' رنگا رنگ ملبوسات وغیرہ کی مکمل تصویر بڑی عمدگی اور نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کی ہے۔ ابن جعفر کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فنی چابکدستی اور کمال سادگی نمایاں ہے۔'' (ص۔24,25)

دکنی میں قدیم اردو کی تصانیف کا سراغ لگا کر جس طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اردو کے ماضی میں تقریباً 200 برس کا بے نظیر اضافہ کیا۔ ڈاکٹر راہی فدائی نے 'کڈپہ میں اردو' لکھ کر علاقائی ادب بلکہ دکنی ادب کی تاریخ میں بڑا پائیدار اور بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید پاشاہ کوثر کا تعلق شہر کرنول، آندھرا پردیش سے ہے موصوف کو ابتداً سے ہی دکنیات سے کافی دلچسپی رہی ہے۔ ان کی ایک اہم تصنیف 'دکنی کلیات حضرت شاہ فی الحال قادریؒ کی تنقیدی تدوین

ہے۔ موصوف نے کلیات کی تدوین سے متعلق کتب خانۂ سالار جنگ، کتب خانۂ ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانۂ آصفیہ، حیدرآباد کے علاوہ حضرت سید اقبال پاشاہ قادری کے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کیا ہے دراصل اسی کتب خانے میں انھیں حضرت فی الحال قادری کی فارسی مثنویات 'نکات العارفین' اور 'مراق السالکین' دستیاب ہوئیں اور دوسرے ذرائع سے ممکنہ معلومات حاصل کر کے اور مخطوطات سے مدد لے کر انھوں نے کلیات کی تدوین کی۔ وحید کوثر نے شاہ فی الحال قادری کے صوفیانہ خیالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے دکنی میں ان کے دیوان اور مثنویوں، بودنامہ (اول)، بودنامہ (دوم) اور ارشاد نامہ کے بارے میں بتلایا کہ یہ مثنویاں حضرت فی الحال کے صوفیانہ رجحانات کا اظہار ہیں۔ وحید کوثر اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین کے مجموعے 'اسلوب وافکار' (2017) میں رقمطراز ہیں:

''شاہ فی الحال کا دور آصف جاہی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس لحاظ سے شاہ فی الحال جدید دکنی کے پہلے دور کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ماحول میں جو عام بول چال کی زبان تھی اس پر دکنی اثرات کا ابھی غلبہ بنا ہوا تھا گھروں اور بازاروں میں اس کا چلن عام تھا۔'' (ص۔28)

'شعر اور شعور' (2018) وجدی سے بیسر تک، (2011) کلیاتِ تصوف (2015)، شاہ فی الفور قادری جان عارفان (2018) اور تین جلدوں پر مشتمل مثنوی جنگ ابرار (2022) جو 600 صفحات پر مشتمل ہے۔ وحید کوثر کی گراں قدر تصانیف ہیں۔ 'جنگ ابرار' گویا دکنی اردو کی آخری طویل رزمیہ مثنوی ہے اس کے مصنف سید محی الدین حسینی قادری محی ہیں یہ مثنوی دس ہزار چھ سو ستائیس (10,627) دکنی اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں صرف 27 عربی اشعار بھی ہیں۔ اس طرح کل 10654 اشعار ہیں اور اس کا صرف ایک نسخہ اس وقت سید صادق پاشاہ حسینی القادری کی تحویل میں ہے۔ مثنوی کی بحر متقارب مثمن مقصور یعنی فعولن فعولن فعولن فعل' مثنوی کی مقررہ 7 بحروں میں سے ایک ہے۔

اردو زبان اور شعر وادب کے پیش نظر آندھراپردیش کے ایک اہم اور معروف شہر تروپتی کو ایک سنگلاخ زمین کہنا چاہیے لیکن یہاں کی ایک موقر سری وینکٹیشورا یونیورسٹی میں 1959 میں شعبہ اردو کا قیام نعمت غیر مترقبہ کے مصداق ہے۔ شعبۂ اردو سے پی ایچ۔ ڈی سند یافتہ طلبہ و طالبات اور ان کے عنوانات کی فہرست کافی طویل اور وزن و وقار کی حامل ہے تاہم دکنی تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے بیشتر اہم موضوعات پر تحقیقی مقالوں کو پیش کرنے اور ان میں بعض مقالوں کی کتابی شکل میں اشاعت حیرت انگیز ہے۔ خانوادۂ شہ میریہ سے متعلق تحقیقی مقالوں کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر شہزادی بیگم نے 1995 میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی نگرانی میں 'اردو مثنوی کا ارتقا: دبستانِ گولکنڈہ میں' تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن نے برصغیر کے مشہور ومعروف نقاد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی رہنمائی میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان 'جدید دکنی شاعری' 1996 میں سری وینکٹیشورا یونیورسٹی، تروپتی میں داخل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے میں جدید دکنی کے ممتاز شاعروں علی صائب میاں، سلیمان خطیب، سرور ڈنڈا، گلی نلگنڈوی کی شاعری پر نقد وتبصرہ کیا گیا ہے علاوہ ازیں موصوف نے اپنے مقالے میں دیگر جدید دکنی شعرا جیسے زعیم صاحب میاں، نذیر دہقانی، اعجاز حسین کھٹا' بگڑ رائچوری، گلیم میدکی، معین نظامی، صبغت اللہ بمباٹ، حمایت اللہ، اشرف خوندمیری، ڈھکن رائچوری، حفیظ خان اور قیسی قمر نگری کی حیات اور جدید دکنی شاعری کے بارے میں اہم معلومات ان کی شاعری کے نمونوں اور امتیازات کے ساتھ فراہم کی ہیں۔

ڈاکٹر سی ممتاز بیگم نے 2002 میں ڈاکٹر سید عبدالستار ساحر کی زیر سرپرستی 'دکنی مثنویوں میں کردار نگاری' عنوان کے تحت اپنا تحقیقی مقالہ جامعہ سری وینکٹیشورا میں داخل کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

یہ مقالہ دکن میں صنف مثنوی اور اس کے ایک خاص پہلو کا بسیط منظر نامہ ہے۔ جس کی اشاعت سے دکنی شعر وادب میں قابل ذکر اضافہ ہوسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید ریاض بخاری نے 2014 میں پروفیسر سید عبدالستار ساحر کی نگرانی میں بعنوان 'خانوادۂ شہ میریہ کی ادبی خدمات' تحقیقی مقالہ سری وینکٹیشورا یونیورسٹی میں پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

اس مقالے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شہ میری اولیا کے دکنی کلام کے ساتھ ساتھ ان کی دکنی نثر کے بیشتر نمونے شائقین دکنی شعر و ادب کے مطالعے کے لیے دستیاب ہیں۔

آندھراپردیش میں کل 13 جامعات (تکنیکی اور سائنسی سے قطع نظر) ہیں، ان میں سے چار جامعات میں ایم اے اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور صرف جامعہ سری وینکٹیشورا میں تحقیق کی سہولت ہے۔ اس کی وجہ باقی تین جامعات میں مستقل اساتذہ کی غیر موجودگی ہے، شعبۂ اردو جامعہ سری وینکٹیشورا کا قیام 1959 میں عمل میں آیا تھا اور دیگر جامعات ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول، یوگی ویمنا یونیورسٹی، کڈپہ اور آچاریہ ناگارجنا یونیورسٹی، گنٹور میں اردو شعبہ جات کا آغاز بالترتیب 2016، 2017، اور 2023 میں ہوا۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ مذکورہ چاروں جامعات کے نصاب میں دکنیات کا پرچہ شامل ہے اور دکنی شعر وادب کی تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

کرنول اور گنٹور کی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں قدیم دکنی کے ساتھ ساتھ جدید دکنی شعر وادب بھی نصاب کا اہم حصہ ہے۔ جس کو عصر حاضر کی دکنی زبان کی نمائندگی کہا جاسکتا ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے موجودہ ریاست آندھراپردیش کا ساحلی علاقہ اردو شعر و ادب کے فروغ اور اردو تہذیب نیز تصنیفی وتالیفی اعتبار سے خطہ رائل سیما سے نسبتاً بہت کم زرخیز کہا جاسکتا ہے یہاں ادبی سرگرمیاں حال حال کی بات ہے تاہم خطہ رائل سیما سے دکنی تحقیق اور تدریس کی روایت اور معاصر صورت حال کا ایک دلکش منظر نامہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے بالخصوص کرنول اور کڈپہ کے حوالے سے دکنی تحقیق وتدریس کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ریاست آندھراپردیش کے ادیبوں، شاعروں، اساتذہ اور ماہرین تعلیم نیز محبان شعر وادب نے دکنی شعر وادب کے تحفظ اور اس کی اہمیت وافادیت کی وضاحت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے اور وقتاً فوقتاً دکنیات سے متعلق عنوانات پر سمیناروں، کانفرنسوں اور مذاکروں سے اردو کے بنیادی ادب کو مضبوط ومستحکم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا پرخلوص اہتمام کیا ہے۔

■

Prof. Sattar Sahir
Ex. Head Dept of Urdu
Jamia Sri Venkateshwar
Tirupathi- 517502 (AP)
ssahir717@gmail.com

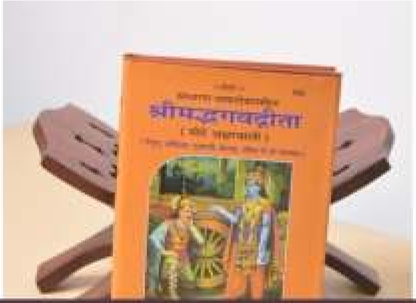

سرفراز جاوید

اردو شاعری میں رامائن اور گیتا کے اساطیر

ہندوستان کے بیشتر زبان وادب پر سنسکرت کا اثر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس سے انکار وانحراف ممکن نہیں۔ اردو، ہندی زبان نے لسانیاتی میلان اور ادبی ضرورتوں کے باعث سنسکرت بھاشا سے بے حد اثرات قبول کیے ہیں۔ اردو ہندی، لسانیات کی رو سے انتہائی یکسانیت کی حامل ہیں، کیونکہ جب ہم اردو ہندی زبان کے مشکل الفاظ کے معنی ومفہوم کی وضاحت سہل زبان میں کرتے ہیں تو ان کے امتیازات مفقود ہوجاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے اردو نے عربی، فارسی اور ہندی نے سنسکرت زبان کی لفظیات اور رسم الخط سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ مگر دونوں زبانوں نے فعلی مادوں، فعلی ترکیبوں، فعلیہ لاحقوں، حروف جار اور شخصی و غیر شخصی ضمائر وغیرہ کو بعینہٖ طور پر ہنوز رائج رکھا ہے۔ ان دونوں زبان میں امتیازی فرق رسم الخط، لفظیات اور معمولی طور پر ابجدی صوتیات کا ہے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اردو کو ہندی اور ہندوی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس سے کئی صدی قبل کبیر داس، ملک محمد جائسی اور تلسی داس وغیرہ جس زبان میں شاعری کرتے تھے، وہ بھاشا اور بھاکا کہلاتی تھی۔ تاریخِ لسانیات کے سیاق میں اردو ہندی کھڑی بولی کا روپ ہیں۔ ماہر لسانیات کی تحقیق کی رو سے یہ بات ثابت ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ اردو پر بیرونی زبانوں کے اثرات زیادہ ہیں مگر ہندی نے خالص ہندوستانی اور عوامی زبان کو اپنے سانچے میں ڈھالا ہے۔

اردو شاعری میں سنسکرت ادب کے اثرات ہندی کے بالمقابل کم مرتب ہوئے ہیں۔ شمالی ہند میں جنوبی ہند کے بالمقابل اردو پر مزید کم اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اردو شاعری کی معروف صنف غزل نے سنسکرت ادب سے براہ راست کم، مگر ہندی کے ذریعے ضرور اثرات لیے ہیں۔ ہاں ہمارے بزرگ اردو ادیبوں نے براہ راست سنسکرت کے بیشتر اہم علمی وادبی سرمایے کا اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً اتھروید کا نوبت رائے شوخ نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ رامائن سے متعلق اردو منظوم تراجم کی فہرست ڈاکٹر محمد عزیز اور مظفر حنفی نے رقم کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر تراجم موجود بتائے جاتے ہیں۔ مزید رامائن کے ضمنی واقعات کے تراجم بھی موجود ہیں۔ جیسے برج نرائن چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' ظفر علی خاں کی 'ایک رشی کے داغ جگر کی کہانی' تلوک چند محروم کی 'سیتاہرن' اور شاد عارفی کی 'دسہرا اشنان' وغیرہ۔ گیتا کے تراجم میں 'کشن گیتا، ارجن گیتا' کے نام سے گیارہ صدی ہجری میں سید مبین نے، 'نغمۂ الہام' کے نام سے یوگی راج نظر، 'نسیم عرفان' کے نام سے منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی... بہت سے حضرات نے کیے ہیں۔

ہندو رسم وروایت کی رو سے پرشوتم رام وشنوجی کے ساتویں اوتار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں رام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑے احترام وعقیدت میں نظمیں لکھی گئیں ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالی 'حب وطن' نظم میں رام کے بن باس کا ذکر کرتے ہیں۔ تو انسان کے فطری جذبہ واحساس کا بیان غربت کے پس منظر میں کیا خوب کرتے ہیں۔

قدر اے دل وطن میں رہنے کی
پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رام چندر کو بن باس
اور نکلا وطن سے ہو کے اداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر
پر چلا ساتھ لے کے داغ جگر
پانو اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف
اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ وسال
پر نہ بھولا اجدھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا
دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا
آتی تھی جب اجدھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال
گویا ایک ایک جگ تھا اک سال

علامہ اقبال نے دنیا کی اہم دانشور شخصیتوں کے احترام میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ رام کے تعلق سے علامہ کا حسن عقیدت ملاحظہ کیجیے۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوش محبت میں فرد تھا

مولانا ظفر علی خاں ہندوستان کی تہذیبی شناخت، راجہ رام، سیتا اور لکشمن کی شان عظمت کے باعث سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے تاثرات کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

نہ تو ناقوس سے ہے اور نہ اقسام سے ہے
ہند کی گرمیِ ہنگامہ ترے نام سے ہے

ساغر نظامی نے والہانہ وطن پرستی اور صلح کل طبیعت کے

باعث ہندوستان اور رام کو مثالی انداز میں شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

ہند کے مرکز سے نکلی شاہ راہ زندگی
سب سے پہلی ہے یہی تفسیر گاہ زندگی
ہندیوں کو فیضِ قدرت سے ہوا عرفانِ نفس
جامِ ہندی میں چھلک اٹھی مئے ایقانِ نفس
ہندیوں کے دل میں باقی ہے محبت رام کی
مٹ نہیں سکتی قیامت تک محبت رام کی
زندگی کی روح تھا روحانیت کی شان تھا
وہ مجسم روپ میں انسان کے عرفان تھا

نظیر اکبرآبادی ہندوستانی مشترکہ تہذیبی روایت کے بڑے شاعر ہیں۔انھوں نے اپنے کلام میں باہمی رواداری کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ وہ کرشن جی کی پیدائش و بچپن، حیات و زیست اور بانسری کے تعلق سے کیا خوب تاثرات قلم بند کرتے ہیں۔

تھا نیک مہینہ بھادوں کا اور دن بدھ گنتی آٹھن کی
پھر آدھی رات ہوئی جس دم اور ہوا نچھتر روہن کی
سب ساعت نیک مہورت سے واں جنمے آکر کرشن جی
اس مندر کی اندھیاری میں جو اور اجالی آن بھری
اب دیوے بولیں دیوکی جی مت ڈر بھومن میں کھیر کرو
اس بار اس کو تم گوکل میں لے پہنچو اور مت دیر کرو

نظیر اکبرآبادی کا کرشن جی سے خلوص وعقیدت کا یہ عالم ہے کہ وہ بانسری کے سر کی لے میں اس قدر محو اور بے خود ہو جاتے ہیں۔

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری
کیا کیا پریم میت بھری اس میں دھن بھری
لے اس میں رادھے نام کی ہر دم بھری بھری
لہرائی دھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا بانسری

حیدرآباد کے مہاراجہ کشن پرساد شاد نے مثنوی 'جلوۂ کرشن' تخلیق کی ہے، جس میں انھوں نے کرشن جی کی مکمل حیات کو اجمالی طور پر قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں ان سے والہانہ عقیدت اور محبت کا خوب اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے مثنوی میں مولود کرشن کو 'صبح صادق' کے عنوان سے کیا خوب سراہا ہے۔

ہشیار کہ شیر کی ہے آمد   عالم کے دلیر کی ہے آمد
بنیادِ ستم کا ڈھانے والا   احکام خدا سنانے والا
پیدا ہوا پیشوا مبارک ہو   پورا ہوا مدعا مبارک ہو
اک چادرِ نور تن گئی وہ   اب کنس کی انجمن گئی وہ

مولانا حسرت موہانی اسلامی شعار پرستی کے باوجود کرشن نگری میں دھونی رمانے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

تن من دھن سب وار کے حسرت
متھرا نگر چل دھونی رمائی

تلوک چند محروم کو قوم، وطن اور مذہب سے بڑی محبت تھی۔ وہ کرشن کی بانسری سے بڑا والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے نظم 'بانسری کی کوک' میں کیا خوب بیان کیا ہے۔

لعل معجز نما سے بجنی   اے لو وہ شام نے لگا دی
پیدا ہوا اک نفس سے اعجاز   اب اس سے زیادہ کون سا ساز
ہر ایک ترانہ دلربا ہے   جنگل نغموں سے گونج رہا ہے

مرزا جعفر علی خاں اثر نے گیتا کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے عظیم مقاصد کو قلب وجگر میں بسا لیا تھا۔ انھوں نے کرشن کی وحدت ایمانی کی تعلیم کو والہانہ محبت کے ساتھ اردو اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ ان کے نزدیک کرشن کی مرلی سے فضاؤں کو محبت سے سرشار کرنے والے نغمے پھوٹتے ہیں۔ جو خوابیدہ روحوں کو بیدار اور سنوارنے والے ہیں۔

ترا نام پیارا، ترا بول بالا
تری پریت سمرن تری یاد مالا
ہوا من کے درپن میں تجھ سے اجالا
وہ دیوکی کی آنکھوں کا تارا دلارا
کمل نین امرت ہے جس کا اسارا
سری کرشن موہن، منوہر کنہیاں
بہاری مراری مدھر مرلی والا

حفیظ جالندھری کو بھی گوپال کرشن سے بڑا شغف تھا۔

ترقی پسند شاعر شہاب جعفری کو سری کرشن سے بڑی والہانہ عقیدت تھی۔ انھوں نے کرشن لیلا کو بطور علامت اپنی شاعری میں برتا ہے۔ وہ اپنے بھجن میں راجستھان کی ایک رانی 'میرا' کو سری کرشن سے ہوئے عشق کی واردات کا بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ دیوانگی کی حالت میں کرشن کی یاد میں گھوما کرتی تھی۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اردو شاعری میں فارسی روایت کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ فارسی روایت کے اثرات کم ہوئے بعد ازاں اردو نے سنسکرت اور ہندی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات قبول کیے اور ہنوز استفادہ کر رہی ہے۔ اردو شعرا رامائن اور مہابھارت کے اساطیری کرداروں کو اپنے کلام میں برت رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت ادب کی تلمیحات یعنی ہندوی تہذیب کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اردو زبان و ادب میں برتا جا رہا ہے۔ اردو شاعر رامائن اور مہابھارت کے اہم کرداروں سے بخوبی واقف ہیں۔ اردو شاعروں نے عام ہندوئی تہذیب کے مطابق رام اور سیتا کو نیکی اور راون کے کردار کو بدی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف غزل بھی اچھوتی نہیں ہے۔

جاں نثار اختر حیات و زیست کے حصار میں خود اپنی امیدوں کے اجڑ جانے پر رام کے بن باس جیسا محسوس کرتے ہیں۔

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

رفیعہ شبنم عابدی زندگی کی حقیقت کے عملی پہلوؤں کو سمجھتے ہوئے کس خوب صورتی سے رام اور سیتا کے کردار کے ذریعے خیالی دنیا سے گریز کا مشورہ دے رہی ہیں۔

تم کوئی رام نہیں میں بھی نہیں ہوں سیتا
پھر یہ بن باس اٹھانے کی ضرورت کیسی

رفعت سروش بڑے حوصلے کے ساتھ بن باس مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فرشتوں کو تری جنت مبارک
مرے حصے میں تو بن باس لکھ دے

اثر غوری راجہ رام کے بن باس کے مدنظر غزل کے شعر میں کیا خوب حوصلہ دکھاتے ہیں۔

کوئی سچائی دل کے پاس رکھ دو
بدن میں رام کا بن باس لکھ دو

اردو زبان و ادب پر سنسکرت زبان و ادب کے گہرے اثرات ہیں، جو روز افزوں ہیں۔ مگر اب یہ اثرات ہندی کے توسط سے اردو پر مرتب ہو رہے ہیں۔ قدیم دور میں اس کے زیادہ اثرات دکنی اردو ادب پر نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شمالی ہند کے قدیم اردو ادب پر کم اثرات نظر آتے ہیں، کیونکہ آبرو، حاتم، میر، سودا، خواجہ میر درد، ذوق، مومن اور غالب کے کلام میں سنسکرت کے اثرات قدرے مفقود ہیں مگر بعد کے اردو شعرا کے یہاں بالواسطہ طور پر یہ اثرات وقت کے ساتھ بڑھتے ہیں۔

■

Dr. Sarfaraz Javed
R-155, Third Floor, Gali No: 6
Sir Syed Road, Jogabai Ext
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.:9971895740
javedsarfaraz@yahoo.com

یاسمین رشیدی

بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی

بیتال پچیسی کو 1803/1805 میں مظہر علی خاں ولا نے اردو میں منتقل کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ کہانیاں راجا جے سنگھ سوائی، جے نگر کی فرمائش پر سورت تام کیشور نے سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل کی تھی۔ ڈاکٹر گیان چند جین[1] نے ان کا نام سورتی مشر لکھا ہے جبکہ گوہر نوشاہی نے صورت نام کیشور[2] اور جمیل جالبی نے سورت تام کیشور بتایا ہے:

ولا نے لکھا ہے کہ 'بیتال پچیسی' کو راجا جے سنگھ سوائی کے کہنے سے سورت تام کیشور نے سنسکرت سے برج بھاشا میں کہا۔[3]

یہ کہانیاں سنسکرت کی کلاسیکی روایت کتھا سرت ساگر (1063-1081) (سوم دیو) اور برھت کتھا (گناڈھیہ) پراکرت میں لکھی گئی) کا ایک سلسلہ/ حصہ کہی جا سکتی ہیں۔ گیان چند جین نے اپنی کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' میں بارھویں اور چودھویں صدی کے درمیان بیتال پچیسی کے مرتب ہونے کی بات لکھی ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے اس قصہ کے شمیندر اور سوم دیو کی کتابوں میں شامل ہونے کا امکان بھی ظاہر کیا ہے۔ جبکہ سنگھاسن بتیسی کا زمانہ تصنیف انھوں نے تیرھویں صدی یا اس کے بعد کا زمانہ بتایا ہے:

قصوں کا ایک عظیم مخزن گناڈھیہ کی برہت کتھا تھی جو پشاچی پراکرت میں لکھی گئی۔ یہ 500ء سے بعد کی نہیں۔ اب یہ ناپید ہے۔ اس کا آخری یعنی آٹھواں حصہ سنسکرت تراجم کے ذریعے محفوظ رہ گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا بدھ سوامی کا برہت کتھا اشلوک سنگرہ ہے جو آٹھویں نویں صدی عیسوی کا ہو سکتا ہے۔ گیارھویں صدی میں شمیندر نے برہت کتھا منجری کے نام سے مختصر منظوم ترجمہ کیا۔ 1063-1081 کے بیچ سوم دیو نے اپنی مشہور زمانہ کتاب کتھا سرت ساگر لکھی۔ بارھویں اور چودھویں صدی کے درمیان بیتال پچیسی مرتب ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے یہ شمیندر اور سوم دیو کی کتابوں میں بھی شامل تھی۔ تیرھویں صدی میں یا اس کے بعد سنگھاسن بتیسی تصنیف ہوئی۔[4]

گیان چند نے اپنی اس کتاب میں 'طوطا کہانی' کی چوبیسویں کہانی کا ذکر کیا ہے جو کم و بیش ذرا سے فرق کے ساتھ بیتال پچیسی کی ایک کہانی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے بیتال پچیسی کو لوک کہانیوں کے زمرے میں رکھا ہے۔ یہ لوک کہانیاں ادبی روایت میں نہ صرف اہم مقام رکھتی ہیں بلکہ ادب میں ہندوستان کے اس کلچر کی ترجمانی کرتی ہیں جو اس کی مخصوص شناخت سے عبارت ہے۔ ان کہانیوں میں ہندوستان کی مٹی بولتی ہے، ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہ کہانیاں قدیم ہندوستان کے تمدن کا بیانیہ ہیں۔

کہانیوں کی روایت ہندوستان میں بہت پرانی ہے۔ تحریر کردہ کہانیوں سے الگ کہانی سننے اور سنانے کی روایت بھی کافی پرانی ہے۔ علاقائی زبانوں میں مشہور قصے اس لوک روایت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں جس کی بوقلمونی کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ عوامی روایت کی نظیر یہ کہانیاں اپنی اصل میں اس تہذیب کی پروردہ ہیں جس کے لیے ہندوستان جانا جاتا ہے۔ بوقلمونی جس کی تہذیبی خصوصیات میں داخل ہے۔ عوامی قصے، سنسکرت کی کتھا روایت، عربی فارسی کہانیوں کے اثرات، ہندوستانی کہانیوں نے ہر اثر کو آتم سات کیا۔ اسے اپنے رنگ میں ڈھالا اور ایک نیا قالب عطا کیا۔

کچھ کہانیاں ہندوستانی مٹی میں پیدا ہوئیں تو کچھ نے یہاں کی مٹی میں کھیل کر اپنے خدوخال پائے ہیں۔ ان طبع زاد قصوں کہانیوں میں وہ روایات بھی داخل نظر آتی ہیں جو خالص ہندوستانی نہیں بلکہ ہندوستانی روایت سے مل کر ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے، جس میں ہندوستانی روایت بھی ہے اور اس کا مخصوص رنگ بھی۔

تمام انسانی علم ان کہانیوں پر منحصر ہے، جنھیں ماضی کے تجربات کے گرد تشکیل دیا جاتا ہے اور نئے تجربات کی تفہیم و تعبیر پرانی کہانیوں کے معنوی سیاق میں کی جاتی ہے۔[5]

بیتال پچیسی میں 25 کہانیاں ہیں جو بیتال (لاش/

بھوت) راجا بکرماجیت کو سناتا ہے۔ بیتال اپنی ہر کہانی کے آخر میں بکرماجیت سے ایک سوال پوچھتا ہے۔ جس کا جواب بکرماجیت کی سوجھ بوجھ اور علم و دانش سے عبارت ہے۔ یہ کہانیاں ہندوستانی مٹی میں سانس لیتی ہیں۔ نصائح اور اخلاقی درس ہر کہانی میں موجود ہے۔ برسوں کے انسانی تجربات و مشاہدات کو پیش کرتی یہ کہانیاں زندگی اور اس کے رمز کا بیانیہ کہی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر پندرھویں کہانی میں راجکمار کہتا ہے:

''برکش چھایا کرتے ہیں دوسروں کے اوپر اور آپ دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔ پھولتے پھلتے ہیں پرائے واسطے۔ بھلے لوگوں اور برکشوں کا یہی دھرم ہے۔ جو یہ دیہہ غیر کے کام نہ آوے تو اس شریر سے کیا پروجن ہے۔ مثل مشہور ہے کہ جوں جوں چندن کو گھستے ہیں، توں توں دونی سگندھ دیتا ہے۔''

اکیسویں کہانی میں ایک مثال کچھ یوں ہے کہ ''بدھ بنا بدّیا کسی کام کی نہیں۔ بلکہ بدیا سے بدّھ بڑھ کر ہے اور بدّھ ہین اسی طرح مرتے ہیں جیسے سنگھ کے جلانے والے موئے۔'' اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ عقل کے بنا علم کسی کام کا نہیں ہوتا۔ علم وحکمت کی اسی طرح کی کئی باتیں ان کہانیوں میں موجود ہیں۔ ایک کہانی میں اچھے لوگوں کی پہچان یوں بیان کی گئی ہے:

اتم لوگ جو ہیں سو پران جانے سے بھی اپنا سُبھاؤ نہیں چھوڑتے۔ انھیں کسی نے بھلا کہا تو کیا اور بُرا کہا تو کیا۔ دولت رہی تو کیا جو نہ رہی تو کیا۔ ابھی مرے تو کیا اور پھر مرے تو کیا۔ جو لوگ نیاؤ کی ریت سے چلتے ہیں کچھ ہو اور راہ پر پاؤں نہیں دھرتے۔ غرض جس کی شریر میں اپکار نہ ہو اس کا جینا نرپھل ہے۔ 6

قدیم ہندوستانی سماج بیتال کی کہانیوں میں نمایاں ہے۔ کہاوتیں اور محاورے بھی اپنے مخصوص سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیتال پچیسی کی کہانیاں قدیم ہندوستانی سماج اور ہندوستانی تہذیب وتمدن کی کہانیاں ہیں۔ سولھویں کہانی میں دھوماوتی کی خوبصورتی کا بیان دیکھیے:

حسن ایسا گویا اندھیرے گھر کا اجالا۔ آنکھیں مرگ کی سی، چوٹی ناگنی سی۔ بھویں کمان کی سی۔ ناک طوطے کی سی۔ بتیسی موتی کی سی لڑی۔ ہونٹھ کندوری کے مانند، گلا کپوتھ کا سا، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں کول کنول کے سے، چندر مکھی چمپک برنی، ہنس گتی، کوکل بینی۔ جس کے روپ کو دیکھ اندر کی اپسرا بھی لجائے۔ 7

ہندوستانی پس منظر میں لکھی یہ کہانیاں زندگی کے مختلف رنگوں کو پیش کرتی ہیں.قدیم ہندوستانی سماج کے راجا مہاراجا کے ساتھ ساتھ عوام کی زندگی اور سماج کا عکس بھی ان کہانیوں میں موجود ہے.ہندو تہذیب و معاشرت کا مخصوص رنگ ان کہانیوں میں نمایاں ہے. اس کے علاوہ قصہ در قصہ کی تکنیک بیتال پچیسی کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے.تمام کہانیاں بیتال سناتا ہے. آخر میں راجا کی بہادری اور سوجھ بوجھ سے خوش ہوکر راجاکو جوگی کی حقیقت اور اسے مارنے کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے.

ہندو دیومالا اور تہذیب و ثقافت کا مخصوص رنگ ان کہانیوں میں موجود ہے۔ اخلاقی درس سے پُر یہ کہانیاں ایک ایسے معاشرے میں سانس لیتی ہیں جہاں ہر شخص کسی مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتا ہے اور سماج نے اس طبقے کی خصوصیات طے کر رکھی ہیں۔ ایک مثال دیکھیے:

راجہ نے کہا جیموت باہن ذات کا چھتری ہے۔ اسے جی دینے کا ابھیاس ہو رہا ہے۔ اس سے اسے جان دینی کچھ کٹھن نہ معلوم دی۔ 8

یعنی چھتری کے لیے اپنی جان دینا کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ یہ خوبی ان کے گروہ سے وابستہ ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ خوبیاں کسی اور میں نہیں ہو سکتیں۔ پندرھویں کہانی میں سنکھ چوڑ کا کردار مثال کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ہر فرد اپنے گروہ/طبقے کے مطابق مختلف خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔ مثلاً راجا کو کیسا ہونا چاہیے، راج دھرم کیا ہے، عورت، مرد، سیوک کا دھرم کیا ہونا چاہیے۔ جہاں سیوا کے دھرم کو یوگ دھرم سے بھی مشکل قرار دیا گیا ہے وہیں انجن سوامی کی سیوا کو برا بھی کہا گیا ہے۔ غرض کہ ہر شخص کی خصوصیات سماج/شاستروں نے طے کر رکھی ہے اور اس پر کھرا نہ اترنے کی صورت میں وہ لعن طعن کا مستحق ہے۔ برا کرنے والوں کا برا انجام اور اچھا کرنے والوں کا اچھا انجام گویا ان کہانیوں کا اخلاقی درس ہے۔

ہندوستانی پس منظر میں لکھی یہ کہانیاں زندگی کے مختلف رنگوں کو پیش کرتی ہیں۔ قدیم ہندوستانی سماج کے راجا مہاراجا کے ساتھ ساتھ عوام کی زندگی اور سماج کا عکس بھی ان کہانیوں میں موجود ہے۔ ہندو تہذیب و معاشرت کا مخصوص رنگ ان کہانیوں میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ قصہ در قصہ کی تکنیک بیتال پچیسی کی کہانیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تمام کہانیاں بیتال سناتا ہے۔ آخر میں راجا کی بہادری اور سوجھ بوجھ سے خوش ہوکر راجا کو جوگی کی حقیقت اور اسے مارنے کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے۔

بیتال پچیسی کا ابن آدم کا کیا ہوا ترجمہ مظہر علی خاں ولا کے نول کشور پریس سے شائع شدہ نسخے، وقار عظیم کے ترتیب کردہ نسخے اور گوہر نوشاہی (مرتبہ) والے نسخے سے کافی مختلف ہے۔ کئی جگہ کہانی اور واقعہ میں تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی کہانی کو ہی لے لیں۔ ابن آدم والے ترجمے میں کہانی کے آخر میں پدماوتی کے والدین کی موت کا ذکر ہے اور بیتال کا سوال بھی اسی پر مبنی ہے۔ جبکہ باقی نسخے میں پدماوتی کے والدین کی موت کا ذکر نہیں ہے۔ اور والدین بھی ابن آدم والے ترجمے سے الگ ہیں۔ گوہر نوشاہی، وقار عظیم والا نسخہ نول کشور پریس والے نسخے سے قریب ہے لیکن ابن آدم والے ترجمے میں کم و بیش ہر کہانی تبدیل نظر آتی ہے۔ مترجم کے مطابق:

مراٹھی زبان کے مذکورہ بالا نسخے، ایک ہندی و انگریزی نسخے اور چند تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کرکے میں نے ان قصوں کو حالیہ اردو زبان کا حسین پیرہن عطا کرنے کی سعی کی ہے۔ 9

ممکن ہے مراٹھی زبان میں انھیں یہ کہانیاں اسی صورت میں ملی ہوں۔ زبان و بیان کی بات کریں تو 'اردووانے' کے عمل میں کہانیوں کا پس منظر قدیم ہندوستانی تہذیب جو بیتال پچیسی کی کہانیوں کی خصوصیت ہے، فوت ہوگئی ہے۔ علم وحکمت کی وہ باتیں جو برسوں کے

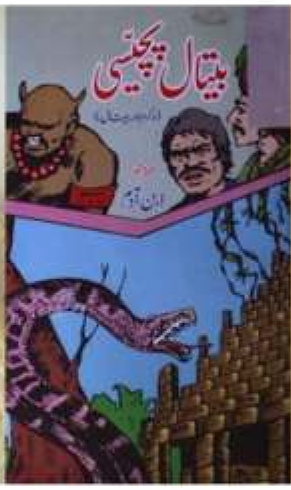

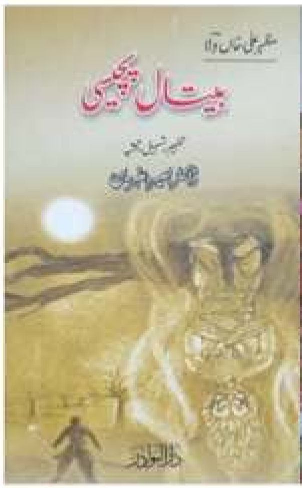

انسانی تجربے کے بعد سماج میں رواج پاتی ہیں، جن سے انسان کے تجربے اور علم وحکمت کا پتہ چلتا ہے، اور جو بیتال پچیسی کی کہانیوں کی ایک نمائندہ خصوصیت کہی جاسکتی ہیں، انھیں بھی ابن آدم نے اپنے ترجمے سے باہر رکھا ہے۔ یہ ترجمہ مظہر خاں ولا والی بیتال پچیسی سے بہت دور نظر آتا ہے اور شاید اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے چکر میں اپنی شناخت سے ہی محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو:

اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی فضا ثقیل اردو کی تاب نہیں لاسکتی۔ کیوں کہ ان میں سنسکرت عہد کی تہذیب کا بیان ہے جس کے لیے آسان زبان ہی زیادہ مناسب ہے، ایسی زبان جس میں نہ زیادہ عربی فارسی ہو نہ اجنبی سنسکرت۔ 10

بیتال پچیسی کے اسلوب بیان کے بارے میں جمیل جالبی رقمطراز ہیں:

''بیتال پچیسی'' اردو زبان میں ہندوستانی کلچر کے اردو روپ، اپنے طرز ادا، لفظیات، تشبیہات، استعارے اور تلمیحات کی وجہ سے منفرد ہے۔ یہاں نہ صرف ہندو اور مسلم کلچر بلکہ اردو اور ہندی زبانیں خلوص وفراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے سے گلے مل رہی ہیں۔ اس سے اسلوب بیان کا ایک نیا امکان ابھرتا ہے...... 'مادھونل' اور 'بیتال پچیسی' جس زبان میں لکھی گئی ہے وہ ایسی ہی زبان میں پیش کی جانی چاہیے تھی۔ 11

شاید یہی وجہ ہے کہ ابن آدم کے ترجمہ میں کہانیوں کے اعتبار سے فضا اور اسلوب بیان ان۔ فٹ معلوم ہوتے ہیں۔ رہی سہی کسر کہانیوں کے درمیان ان کے فوٹ نوٹ نے پوری کر دی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کہانی میں کسی دیوی کی پوجا کا ذکر ہے تو وہاں ان کا فوٹ نوٹ ملے گا کہ: اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اسی طرح کے کئی نوٹ ترجمے میں موجود ہیں۔ چند مثالیں:

1 اسلامی عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد انسان دنیا میں نہیں آتا بلکہ عالم برزخ میں رہتا ہے۔

2 مردہ جسم میں داخل ہو کر کوئی روح مردہ جسم کو زندہ نہیں کر سکتی۔

3 غیر اللہ کے لیے قربانی شرک ہے۔

4 اسلام میں شراب حرام ہے۔

5 صرف سلیمان علیہ السلام ہی کو اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سمجھنے کا علم عطا کیا تھا۔

حالانکہ کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''اس ترجمے سے کسی مذہب وعقیدے کی تبلیغ قطعی مقصود نہیں بلکہ تفریح مہیا کرنا ہے۔''12 جبکہ ان کے نوٹس کا بیانیہ ان کی اس بات کے برعکس ہے۔ کسی ادبی نوعیت کی کتاب میں اس طرح کے نوٹ شامل کر کے اسے مذہبی رنگ دینے کی کوشش کرنا کم از کم میری سمجھ سے پرے ہے۔

سنگھاسن بتیسی کی بات کریں تو بیتال پچیسی کی طرح ہی یہ کہانیاں بھی سنسکرت اور برج بھاشا کے راستے اردو میں آئیں۔ جسے للولال اور کاظم علی جوان نے اردو کا جامہ پہنایا۔ سہیل بخاری لکھتے ہیں:

اس کی بنیاد سنسکرت کے ایک قصے پر رکھی گئی ہے۔ 1631ء میں عہد شاہ جہانی میں سندرداس کوی نے اس قصے کو سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل کیا تھا۔ برج بھاشا کے نسخے سے للو لال جی اور کاظم علی جوان نے مل کر 1804 میں اردو میں ترجمہ کیا۔ 13

پرکاش مونس نے سنگھاسن بتیسی کے تین سنسکرت نسخوں کا ذکر کیا ہے جن کے مصنف نا معلوم ہیں۔ انھوں نے 1633 میں ان کہانیوں کے سنسکرت سے برج بھاشا میں منتقل ہونے کی بات کہی ہے۔

سنسکرت سنگھاسن بتیسی کو سندرداس کوی نے 1633ء کے لگ بھگ برج بھاشا کا جامہ پہنایا۔ سندرداس گوالیار کا برہمن تھا اور شاہ جہاں کے دربار میں باریاب تھا۔ 14

سنگھاسن بتیسی کی پہلی کہانی کچھ اسی انداز میں سیکھ دیتی ہے کہ قسمت کا لکھا مٹتا ہے نہ ٹلتا ہے۔ اس لیے انسان کو کسی بھی حالت میں گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے کہ اوپر والا جب چاہے اس گھمنڈ کو پاش پاش کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے راجا مہاراجا بھی اس سے نہیں بچ پائے۔ بنیادی طور پر یہ کہانیاں حکایات کہی جاسکتی ہیں۔ جس میں زندگی اور اس کے متعلقات کا بیان ملتا ہے۔ زندگی کو کس طرح جئیں کہ رہتی دنیا تک اور مرنے کے بعد بھی لوگ یاد کریں۔

سنگھاسن بتیسی کا مرکزی کردار راجا بھوج اور راجہ بکرم کو کہا جاسکتا ہے۔ بنیادی کہانی کچھ یوں ہے کہ راجا بھوج جب سنگھاسن پر بیٹھنا چاہتا ہے اس کے چاروں اطراف موجود پتلیاں اسے ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور ہر پتلی اسے بکرماجیت کے مختلف کارناموں کی ایک کہانی سناتی ہے۔ متعدد کوششوں اور 32 کہانیاں سننے کے بعد بھی راجا بھوج سنگھاسن پر نہیں بیٹھ پاتا اور آخر کار مجبور ہو کر سنگھاسن دوبارہ وہیں گڑوا دیتا ہے جہاں سے نکالا گیا تھا۔ اور راج کاج چھوڑ کر بیراگ لے لیتا ہے۔

راجا بکرم کا کردار ہندوستانی لوک کہانیوں میں ایک آدرش کردار ہے۔ جس کا راج اور انصاف دور دور تک مشہور تھا۔ سنگھاسن بتیسی کی دوسری کہانی دراصل بیتال پچیسی کی بنیادی کہانی ہے۔ سنگھاسن بتیسی کے کچھ قصے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بیتال پچیسی میں بھی ملتے ہیں۔ یہاں بھی راجا بکرم ہیرو کی بھومیکا میں موجود ہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ کہانیاں اس لوک روایت کا حصہ ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس کی معنویت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دنیا کے مکر وفریب کو جس طور پر راجا بھرتری نے محسوس کیا تھا اور اپنا راج تج کر جنگل کی راہ لی۔ وہ اب بھی قائم ہے۔ دنیا شاید اب بھی ایسی ہی ہے۔ جس پر اس دنیا کی حقیقت کھل جائے وہ جنگل کی ہی راہ لے۔

بیتال پچیسی کے بنیادی قصے کا مختصراً ذکر سنگھاسن بتیسی کی ایک کہانی میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں بیتال

کا ذکر صرف ایک لاش کے طور پر ہوا ہے جو سرس کے درخت سے لٹکی ہوئی ہے جسے بکرماجیت جوگی کی لاش کے ساتھ دیوی کو بھینٹ چڑھاتا ہے۔

سنگھاسن بتیسی کے تمام قصے راجا بکرماجیت کی شجاعت اور سخاوت کے مختلف واقعات ہیں۔ جو اس سنگھاسن کے چاروں طرف موجود پتلیاں راجا بھوج کو سناتی ہیں۔ جس پر راجا بکرم بیٹھا کرتا تھا اور جو اس کے راج کی بھوتیا کی ایک مثال کہی جاسکتی ہے۔

راجہ بکرم کو یہ تخت راجا باہوبل نے دیا تھا۔ اور باہوبل کو راجا اندر نے۔ اس سنگھاسن میں جڑے جواہرات بکرم کے راج اور خود اس کے اندر موجود خوبیوں کا بیانیہ کہے جاسکتے ہیں۔ تخت کے ہر طرف بیٹھی ہوئی آٹھ پتلیاں راجا بکرم کی خصوصیت کہی جاسکتی ہے کہ ہر پتلی راجا بھوج کو راجا بکرم سے جڑا ایک ایسا واقعہ سناتی ہے جس میں راجا بکرم کے اوصاف کا بیان ہوتا ہے۔

ہر پتلی کے ہاتھ میں کنول کے پھول کا ہونا ہندوستانی اساطیر میں کنول کے پھول کی اہمیت اور معنویت کو واضح کرتا ہے۔ کنول کا پھول ہندو دیومالا میں خوبصورتی، خوشحالی اور زرخیزی کی علامت مانا جاتا ہے۔ پتلیوں کی خوبصورتی کا بیانیہ بھی ہندوستانی نسائی جمالیات کی طرف اشارہ ہے:

پتلیاں بن کر ایسی کھڑی ہوئیں کہ گویا ابھی بولتی ہیں۔ آنکھیں ہرن کی سی، کمر چیتے کی سی، پاؤں کا یہ انداز جیسے ہنس کی چال جنھوں نے صورت ان کی دیکھی اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں جگہ دی۔ 15

پتلیوں کا راجا بھوج کا راجا بکرم سے موازنہ کرنا اور انھیں تخت پر بیٹھنے کے لائق قرار نہ دینا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ کلجگ میں راجا بکرم جیسی صفات والا کوئی نہیں۔ جیسا کہ کہانی میں ذکر ہوا ہے کہ 'راجا بکرماجیت کی برابری 'اندر' بھی نہیں کرسکتا'۔

اس تخت پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو بکرماجیت کے جیسی خوبیاں رکھتا ہو۔ زیادہ تر واقعات راجا بکرم کے سخی، فیاض ہونے کی کہانی سناتے ہیں، جو دان دکشنا میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مشکلات سے حاصل کی گئی چیزیں بھی یوں دان میں دے دیتا ہے جیسے وہ اس نے دینے کے لیے ہی حاصل کی تھی۔ مشکلیں زندگی کا حصہ ہیں۔ جو ان کے ساتھ جینا جانتا ہو دراصل وہی زندگی کو صحیح معنوں میں جیتا ہے۔ ہر رشتہ ایک موہ مایا ہے۔ جو انسان کو باندھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دولت، دوست، احباب یہ سب وہ بندھن ہیں جو انسان کو موہ مایا میں لپیٹ کر کے صحیح راہ سے بھٹکا سکتے ہیں۔ لیکن جو اس مایا کو توڑ کر زندگی اور اس کے معنی کو سمجھتا ہے دراصل وہی اس تخت پر بیٹھنے کے قابل ہے۔

بکرماجیت کا کردار ایک مثالی کردار ہے جو ہر طرح کے اوصاف کا مجموعہ ہے۔ ایسے کردار قدیم قصے کہانیوں میں شاید اس لیے جنم لیتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں ان کا ہونا مشکل ہے۔ انسان کی ادھوری خواہشات کسی نہ کسی روپ میں سامنے آتی ہی ہیں۔

ہر پتلی کا ایک نام ہونا اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ راجا بکرم کی ہر خوبی یکتا ہے۔ جیسے ہر فرد دوسرے سے مختلف ہوتا ہے حالانکہ سب کے دو آنکھیں، دو کان، ایک ناک اور ایک منھ ہی ہوتے ہیں۔ راجا بکرماجیت کی ہر خوبی ایک فرد کی خوبی کے مماثل ہے اور ایک فرد کی تشکیل میں مختلف خوبیاں کا ملنا بعید از قیاس نہیں۔

''جو شخص اپنا غصہ نہ مار سکے اس کا یہی حشر ہوتا ہے اور غصہ کرنے کے بعد وہ بہت پچھتاتا ہے۔'' اس طرح کی کئی باتیں لوک کہانیوں کا حصہ ہیں۔ ہم آج بھی زندگی کی انھیں قدروں کو سن کر، پڑھ کر، محسوس کر کے بڑے ہوتے ہیں۔ گویا ان کہانیوں کی معنویت میں کوئی کمی نہیں آئی کہ آج بھی زندگی ان قدروں سے خالی نظر آتی ہے۔ اور ایسی کہانیوں کی ضرورت آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ اب وہ دادی، نانی کی کہانیوں کا چلن کم ہوگیا ہے کہ شہر کی بھاگتی دوڑتی زندگی نے ہماری کہانیوں کو بھی لیل لیا ہے۔

سنگھاسن بتیسی کے تمام قصے راجا بکرماجیت کی شجاعت اور سخاوت کے مختلف واقعات ہیں۔ جو اس سنگھاسن کے چاروں طرف موجود پتلیاں راجا بھوج کو سناتی ہیں۔ جس پر راجا بکرم بیٹھا کرتا تھا اور جو اس کے راج کی بھوتیا کی ایک مثال کہی جاسکتی ہے۔

ان کہانیوں میں عوامی محاوروں کا بھی خوب استعمال ہوا ہے۔ جس سے عوامی زندگی کی ایک تصویر قاری کے سامنے آتی ہے۔

منشی نول کشور پریس سے شائع شدہ سنگھاسن بتیسی کے دو اردو ترجمے میری نظر سے گزرے۔ دونوں میں کئی جگہ پر تبدیلی نظر آتی ہے۔ پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کی تالیف کردہ کاپی میں واقعات میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے۔ یوں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے کچھ اشعار اور الفاظ کا غیر ضروری استعمال کر کے نثر تبدیل کرنے کی کوشش میں کئی ایسی چیزیں چھوٹ گئی ہیں جن کا ذکر متن میں ہونا چاہیے تھا۔ بطور مثال دسویں کہانی میں جس راج کنیا کا ذکر ہوا ہے جس کا بیان پہلے کیا جاچکا ہے اس کا راجا کو اس بات کے لیے شکریہ ادا کرنا کہ اس کی وجہ سے اس کی شادی ہوئی اور وہ اپنے باپ کی اس شرط سے چھوٹی۔ اس کا بیان مجنوں گورکھپوری والی کاپی میں سرے سے غائب ہے۔ اس طرح کی کئی تبدیلیاں ہیں۔ زبان کو سلیس بنانے

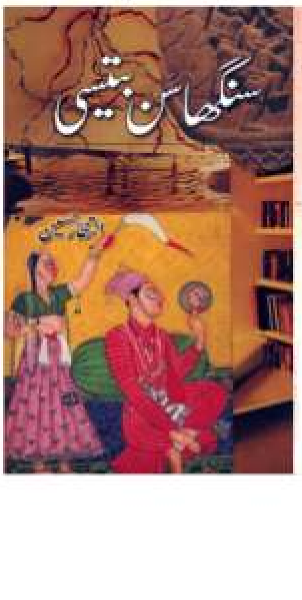

کے نام پر کی گئی یہ تبدیلیاں کہیں کہیں کھٹکتی ہیں۔ مثال کے طور پر 'رتی' کی جگہ لفظ 'ستانا' استعمال کرنا۔ میری ناقص فہم میں تو ستانا اور رتی دو مختلف لفظ ہیں، جن کے معنی بھی کافی مختلف ہیں۔ لیکن رتی کی جگہ رتی استعمال کرنے میں کیا قباحت ہے؟ جبکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے بھی 'رتی' لفظ کا استعمال ہی درست معلوم ہو۔

سنگھاسن بتیسی میں انسان کے جانور میں بدلنے کے قصے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ سنگھاسن بتیسی کے قصوں میں ہندوستانی اساطیر کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔ شیو، پاروتی اور دوسرے دیوتاؤں کا ذکر کئی بار آتا ہے۔ انسان اور دیوتا کا رشتہ آدم وحوا کی تخلیق جتنا پرانا ہے۔ انسان دیوتا کو پوجتا ہے اور دیوتا انسان کا ہی ایک روپ ہے۔ قدیم زمانے میں بادشاہوں کو دیوتا ماننے کا عقیدہ اس کی طرف ایک اشارہ ہے۔ یہ عقیدہ تھا کہ بادشاہوں کو وہ طاقت حاصل ہے جس کے بنا پر وہ اپنی رعایا کو پالتا پوستا ہے۔ یہ طاقت عام انسان کو حاصل نہ تھی۔ عام آدمی کی اپنے بادشاہ سے اسی قسم کی توقعات وابستہ تھیں جو انسان کو دیوتاؤں سے ہوتی ہے۔ راجا بکرم کا کردار اسی عقیدے کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے۔ ان سے مدد مانگنے آنے والے لوگوں کی یہ توقع کہ راجا بکرم ان کے سارے دکھ دور کر دے گا اس کی مثال ہے۔ متن میں کئی دفعہ راجا بکرم کو 'اندر' سے بھی بڑا دانی کہا گیا ہے ایک ایسا راجا جس کا مقابلہ خود اندر بھی نہیں کر سکتا جو خود King of the Gods کہلاتا ہے۔

اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ بکرماجیت کا کردار کس قدر گنی اور گیانی تھا۔ اس کے دان پن کا بیانیہ سنگھاسن بتیسی میں ہے جبکہ اس کی سوجھ بوجھ کے واقعات (کچھ جوابات کو چھوڑ کر) بیتال پچیسی میں بیتال کو دیے گئے جوابات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ہر تہذیب میں اخلاقی کہانیاں اور پندونصائح کی کتھائیں جنم لیتی رہی ہیں۔ راجا بکرم کے مختلف واقعات بیان کرتی یہ پتلیاں جو دراصل ست یگ سے کلجگ میں آئیں ہیں۔ ان کے بقول اس یگ میں راجا بکرم جیسا کوئی نہیں اس لیے جب جب راجا بھوج اس تخت پر بیٹھنے جاتا ہے وہ سامنے آ کر اس کا راستہ روکتی ہیں۔ گویا یہ تخت ست یگ کی اچھائیوں کا پرتیک کہا جا سکتا ہے۔ کہانیوں کے توسط سے جو درس دیا گیا ہے وہ کم وبیش آج بھی اسی صورت میں زندہ ہے۔ مرنے

> بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی قدیم ہندوستانی رسم ورواج کی عمدہ عکاسی ہی نہیں کرتی ہیں، بلکہ اخلاقی درس کے باب میں بھی اس کی اپنی سی اہمیت ہے۔

کے بعد کوئی کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جاتا بلکہ اس کے اچھے کام ہی دنیا میں یاد کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے خیال آج بھی اخلاقی کہانیوں میں زندہ ہیں۔ اور ہمیں بچپن میں پڑھائے جاتے ہیں۔ پتلیوں کے ذریعے سے اخلاقی درس دینا جو بے جان ہوتی ہیں۔ گویا انسان کو غیرت دلانا ہے۔ بے زبان جانوروں کے ذریعے سنائی گئی کہانیاں بھی اسی زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ بکرماجیت کے اوصاف بے زبان پتلیوں کے ذریعے سے کہلانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس تخت پر کسی اور کا بیٹھنا ناممکن ہے کیونکہ کوئی اور ان اوصاف کا اہل نہیں جو راجا بکرم میں تھی۔ آدمی کو غیرت دلانے اور سبق حاصل کرنے کے لیے شاید اس سے بہتر کوئی خیال نہ ہو۔ شاید اسی لیے راجا بھوج کو روکنے کے لیے پتلیوں کا بول اٹھنا معنی خیز بھی ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے 'دنیا افسانہ ہے' اور ہم سب اس افسانے کے مختلف کردار۔

قصہ مختصر یہ کہ بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی قدیم ہندوستانی رسم ورواج کی عمدہ عکاسی ہی نہیں کرتی ہیں، بلکہ اخلاقی درس کے باب میں بھی اس کی اپنی سی اہمیت ہے۔ گیان چندجین ان متون کو ہندوتہذیب کے نام پر قبول کرتے ہیں:

> اردو میں ہندوتہذیب کے نمونے بہت کم ہیں۔ بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی جیسی کتابیں شوکت پارینہ کی ایک جھلک دکھاتی ہیں۔ ان سے ہند قدیم کی شادابی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ کہانیوں میں کسی قسم کے غم روزگار کا ذکر نہیں شاید یہ عصر کی شادابی نہیں بلکہ مصنف کی مستی، غفلت اور فراری ذہنیت کا نتیجہ ہو۔16

بلاشبہ گیان چندجین کی باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس نوع کے متن کو پڑھتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ یہاں آداب معاشرت میں شامل قدریں، جنسی تعصبات، صنفی امتیازات اور سب سے بڑھ کر پدرسری نظام کے بیانیہ کی تمام تر سیاسی تدبیریں یوں ہی نہیں ہیں، ان کی اپنی منطق ہے اور اس منطق کو توڑنا اور انسان کو اس کے مرتبے کے ساتھ دیکھنے کا رویہ ہی عصری قرات کو بامعنی بنا سکتا ہے۔ گویا کہ کوئی بھی سادہ اور اکہری قرات گمراہ کن ہو سکتی ہے، اس لیے کسی بھی متن کو اس کی سیاسیات سے الگ کر کے پڑھنا ادبی مطالعات کی ترجیحات کا حصہ نہیں ہو سکتی۔

حواشی

1. گیان چند جین: اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: 1987، ص: 370
2. گوہر نوشاہی (مرتبہ): بیتال پچیسی از مظہر علی خاں ولا، مجلس ترقی ادب، لاہور: 1965، ص: 17
3. ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی: 2007، ص: 515
4. گیان چند جین: اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: 1987، ص: 38
5. ناصر عباس نیر: مابعد نوآبادیات، اردو کے تناظر میں، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، 2013، ص: 57
6. مظہر علی خاں ولا: بیتال پچیسی، نول کشور پریس، 1939، لکھنؤ، ص: 23
7. پروفیسر سید وقار عظیم (ترتیب نو): بیتال پچیسی، (ترجمہ) مظہر علی خاں ولا، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی: 1987، ص: 63
8. مظہر علی خاں ولا: بیتال پچیسی، نول کشور پریس، لکھنؤ: 1937، ص: 47
9. ابن آدم (مترجم): بیتال پچیسی، رحمانی پبلی کیشنز، مہاراشٹر: 2013، ص: 7
10. گیان چند جین: اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: 1987، ص: 383
11. ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی: 2007، ص: 515، 521
12. ابن آدم (مترجم): بیتال پچیسی، رحمانی پبلکیشنز، مہاراشٹر: 2013، ص: 7
13. ڈاکٹر سہیل بخاری: اردو داستان (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد: 1987، ص: 134
14. ڈاکٹر پرکاش مونس: اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: 1978، ص: 372
15. سنگھاسن بتیسی، نول کشور پریس، لکھنؤ: 1953، ص: 5
16. گیان چند جین: اردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ: 1987، ص: 383

■

Dr. Yasmeen Rashidi
Assistant Professor, T.P College, BNMU,
Madhepura - 852113 (Bihar)
rashidiyasmeen@gmail.com

چریہ پد

بودھ سادھوؤں کی شعری روایت

سہیل ارشد

چریہ پد بودھ سادھوؤں کے صوفیانہ نغمے ہیں جن میں بودھ مذہب کے مہایان فرقے کے فلسفۂ نجات کو شعری پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ بودھ سادھوان نغموں کو مذہبی تقریبات میں گاتے تھے۔ ان گیتوں میں تشبیہوں، استعاروں اور بودھ مذہب کی مخصوص اصطلاحوں کا فنکارانہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے مذہبی موضوعات پر لکھے گئے یہ گیت ادبی فن پاروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان گیتوں میں ایک خاص اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے جسے سندھیا بھاشا کہا جاتا ہے۔ ان گیتوں میں مرتاضوں کے لیے رہنما اصول اور طریقۂ ریاضت کا بیان ہے۔ تمثیلوں کا استعمال ان گیتوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی وجہ سے چریہ گیتوں میں معنی کی دو سطحیں ملتی ہیں۔ ظاہری اور داخلی۔ یہاں دو چریہ پدوں کا اردو ترجمہ پیش ہے۔

(1)

نصف شب کو کنول کھلا
بتّیس یوگینیوں کا تن بدمست ہو گیا
اودھوتی مارگ میں چاند اترا
مرشد کی رہنمائی میں سہج کا فلسفہ کہتا ہوں
چاند بہتا ہوا نروان میں داخل ہوا
کملینی کمل بہاؤ میں ہے
ورام آنند خالص اور انوکھا
وہی بدھ ہو گیا جو اسے سمجھا
بھُسکو کہتا ہے میں ملن میں سمجھا
مہاسکھ کے کھیل میں ہی سہجانند ہے

(شاعر: بھُسکو پاد)

(2)

جہاں اونچے پربت ہیں وہیں شبری حسینہ رہتی ہے
وہ مور کے پنکھ اور گنجا پھول کی مالا پہنتی ہے
وحشی شبر، پاگل شبر، شور نہ کر فریاد نہ کر
(میں) تیری گھر والی، نام سہج سندری
مختلف پھول اس پیڑ پر کھلے ہیں اور پیڑ آکاش چھوتا ہے
شبری تنہا اس دشت میں پھرتی ہے
کان کی بالی پہنتی ہے یہ وجر دھاری
تین دھاتوں کی کھاٹ بچھائی گئی، شبر نے مہاسکھ کا سیج سجایا
عاشق شبر اور شبری نیرامنی نے عشق میں شب بسر کی
دل پان کا پتہ ہے مہاسکھ کا کافور کھاتا ہے
وہ شونیہ نیرامنی کو حلق میں لے کر مہاسکھ میں شب بسر کرتا ہے
مرشد کی ہدایت کو کمان بناؤ اور اپنے من کو تیر
اور ایک ہی وار میں نروان کو چھید ڈالو
بدمست شبر پہاڑ کی چوٹی پر گم، ڈھونڈو گے کیسے

(شاعر: شبر پاد)

ان گیتوں کی دریافت بنگلہ زبان کے ادیب و محقق پنڈت ہر پرساد شاستری نے 1907 میں کی۔ انھیں نیپال کی شاہی لائبریری سے دوسرے مخطوطوں کے ساتھ پچاس چریہ پدوں کا ایک مخطوطہ ملا۔ وہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ کے شعبۂ مخطوطات سے وابستہ تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں نیپال اور تبت میں بودھ مذہب سے متعلق سنسکرت مخطوطے اور کتابیں دریافت ہوئیں۔ پنڈت ہر پرساد شاستری کو بنگلہ ادب کی کم مائیگی اور تنگ دامانی کا احساس تھا۔ اس احساس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب 'بودھ گان و دوہا' کے دیباچے میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس دور میں ہر چہار طرف بنگلہ اسکول قائم کیے جا رہے تھے اور لوگ ودیا ساگر مہاشہ کی ورن پریچے، چرتاولی اور کتھا مالا پڑھ کر بنگلہ سیکھ رہے تھے اس دور میں وہ یہی سمجھتے تھے کہ ودیا ساگر مہاشہ ہی بنگلہ زبان کے جنم داتا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ صرف انگریزی کے ترجمے پڑھتے تھے۔ ان کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ بنگلہ زبان کا اپنا ادب بھی ہے اور اس کی اپنی ایک تاریخ بھی ہے۔ اس کے بعد یہ بھی سننے میں آیا کہ ودیا ساگر مہاشہ کی آمد سے قبل رام موہن رائے اور گروے گروے بھٹاچاریہ نے بھی بنگلہ ادب کی بہت خدمت کی اور ان خدمات کی دستاویز بھی موجود ہے۔ اسی سلسلے میں رام گتی نیائے رتن مہاشہ کی تصنیف 'بنگلہ زبان کی تاریخ' بھی شائع ہوئی۔ اس میں کاشی رام داس، کیرتی باس، کوی کنکن جیسے بنگلہ کے کئی قدیم شعرا کا تذکرہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنگلہ زبان میں تین سو سال قبل کچھ نظمیں لکھی گئی تھیں۔ وہ بھی کچھ خاص اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔ وہ زیادہ تر

سنسکرت سے ترجمہ شدہ تھیں۔ رام گتی نیائے رتن کی دیکھا دیکھی اور بھی دو چار بنگلہ ادب کی تواریخ منظرِ عام پر آئیں لیکن وہ سب نیائے رتن مہاشہ کے ہی بنائے ہوئے سانچے میں ڈھلی تھیں۔ ان سب تاریخی حقائق کے باوجود اسّی فی صد افراد کا تصور یہی تھا کہ بنگلہ ایک جدید زبان ہے۔ اس لیے اس میں تمام طرح کے خیالات کا اظہار نہیں ہوسکتا۔ اس میں ترجمے کے علاوہ کچھ نہیں چل سکتا۔ غور وفکر کرکے کوئی نیا موضوع اس میں پیش نہیں کیا جاسکتا اور اگر لکھا بھی جائے تو نئی بات پیش کرنے کے لیے نئی عبارت آرائی کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے اسے یا تو انگریزی یا پھر سنسکرت کے سانچے میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ بہت دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔"

(بودھ گان وو دوہا از پنڈت ہر پرساد شاستری، بنگیہ ساہتیہ پریشد، کلکتہ 2021)

لہٰذا، وہ بنگلہ زبان کی قدیم کتابوں اور مخطوطوں کی تلاش وجستجو میں لگے رہتے تھے۔ نیپال اور تبت میں بودھ مذہب سے متعلق سنسکرت مخطوطوں کی دریافت سے ان کے دل میں یہ امید بندھی کہ نیپال اور تبت میں بنگلہ زبان کی کتابیں اور مخطوطے بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا، انھوں نے اپنے معاونین کو بنگلہ زبان وادب کی قدیم کتابوں اور مخطوطوں کے حصول کی اہمیت بتائی اور خود 1897 اور 1898 میں نیپال گئے۔ وہاں انھیں دربار لائبریری سے کئی سنسکرت مخطوطے ملے۔ 1907 میں وہ تیسری بار نیپال گئے اور اس بار انھیں بودھ مذہب وادب سے متعلق چار مخطوطے ملے۔ وہ چار مخطوطے تھے سراہا پاد کا دوہا کوش، کرشنا چاریہ پاکا مہاپاد کا دوہا کوش، چریہ اچریہ بنچکا اور ڈاکا رنب (ڈاکارنب کا معنی بحرِ حکمت ہے، یہ اپ بھرنش میں بودھ تنتر کی کتاب ہے) پنڈت ہر پرساد شاستری نے ان چاروں مخطوطوں کی زبان کو قدیم بنگلہ زبان قرار دیا اور 1916 میں بنگیہ ساہتیہ پریشد کے زیرِ اہتمام 'ہزار برس میں قدیم بنگلہ زبان میں بودھ گان وو دوہا' کے نام سے ایک ساتھ شائع کیا۔ چریہ اچریہ ٹیکا کو انھوں نے چریہ اچریہ ونشچے کا نام دیا جب کہ یہ نام مخطوطے میں کہیں درج نہیں تھا۔ یہی چریہ اچریہ ٹیکا پچاس چریہ پدوں کا مخطوطہ تھا۔

چریہ پدوں کے اس مخطوطے کے سرورق پر ناگری رسم خط میں 'چریہ اچریہ ٹیکا' لکھا ہوا تھا اور اس پر سرخ روشنائی سے تاریخ 741 بھادسمبت لکھی ہوئی تھی جس سے عیسوی سنہ 1620-21 نکلتا ہے۔ اس سے قیاس لگایا گیا کہ نیپال کی شاہی لائبریری میں اس مخطوطے کو 1620 یا 1621 میں محفوظ کیا گیا تھا۔ مخطوطے کا اندراج نمبر 402 تھا۔ چریہ پدوں کے اس مخطوطے میں اصلاً پچاس چریہ پد تھے لیکن اس کے کچھ صفحات غائب تھے۔ اس لیے چریہ پد22 کا نصف متن، چریہ پد24، چریہ پد 25 اور چریہ پد 48 کا پورا متن دستیاب نہیں تھا۔ بعد کے دور میں بنگلہ زبان کے محقق پربودھ چندر باگچی نے اسی مخطوطے کا تبتی ترجمہ دریافت کیا جس میں ان چاروں چریہ گیتوں کا بھی تبتی ترجمہ موجود تھا۔ لہٰذا، ان ترجموں کی مدد سے ان چاروں نایاب چریہ گیتوں کا بنگلہ متن تیار کرلیا گیا۔

پنڈت ہر پرساد شاستری نے چریہ گیتوں کا جو مخطوطہ نیپال سے دریافت کیا تھا اس میں ہر چریہ پد کے ساتھ اس کی سنسکرت شرح بھی دی ہوئی تھی لیکن مخطوطے پر سنسکرت کے شارح کا نام موجود نہیں تھا۔ پربودھ چندر باگچی کے ذریعے دریافت شدہ تبتی ترجمے اور شرح کے مخطوطے پر ان کے شارح کا نام مُنی دت درج تھا۔ منی دت کی حیات کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کا دورِ حیات تیرھویں صدی عیسوی تھا۔ ان کی سنسکرت شرح میں اس دور کی مختلف کتابوں کے اقتباسات اور مشہور شاعروں کے اشعار کی موجودگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے ایک بڑے عالم تھے اور بودھ مذہب اور اس کے فلسفے کا گہرا علم رکھتے تھے۔ نیز فنِ شاعری پر بھی ان کی گرفت مضبوط تھی۔

پربودھ چندر باگچی کے ذریعے دریافت شدہ مخطوطے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بودھ سِدھوں نے مختلف ادوار میں تخلیق کیے گئے ایک سو نمائندہ چریہ گیتوں کا انتخاب ترتیب دیا تھا۔ اس انتخاب کو چریہ گیتی کوش کہا گیا۔ بودھ مذہب کے عالم اور استاد اچاریہ منی دت نے ان ایک سو چریہ گیتوں میں سے پچاس گیتوں کا انتخاب کرکے ان کی سنسکرت شرح اپنے شاگردوں کی درسی ضروریات کے تحت لکھی تھی۔ انھوں نے اپنی سنسکرت شرح کا نام 'نرمل گرا' رکھا تھا۔

پربودھ چندر باگچی کے ذریعے دریافت شدہ مخطوطے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بودھ سدھوں نے مختلف ادوار میں تخلیق کیے گئے ایک سو نمائندہ چریہ گیتوں کا انتخاب ترتیب دیا تھا۔ اس انتخاب کو چریہ گیتی کوش کہا گیا۔ بودھ مذہب کے عالم اور استاد اچاریہ منی دت نے ان ایک سو چریہ گیتوں میں سے پچاس گیتوں کا انتخاب کر کے ان کی سنسکرت شرح اپنے شاگردوں کی درسی ضروریات کے تحت لکھی تھی۔ انھوں نے اپنی سنسکرت شرح کا نام 'نرمل گِرا' رکھا تھا۔

یہ چریہ گیت اور اس کی سنسکرت شرح بودھ دھرم کے طالب علموں میں بہت مقبول تھی۔ اس لیے بعد کے دور میں طلبہ کی سہولت کے لیے چریہ پدوں اور ان کی سنسکرت شرحوں کو ملا کر ایک مخطوطہ تیار کیا گیا اور اس کی متعدد نقلیں تیار کرلی گئیں۔ ان مخطوطوں کو چریہ گیتی کوش ورتّی کہا گیا۔ ان مخطوطوں میں ہر چریہ گیت کے ساتھ اس کی سنسکرت شرح دی ہوئی تھی۔ پنڈت ہر پرساد شاستری نے جو مخطوطہ دریافت کیا تھا وہ اسی چریہ گیتی کوش ورتّی کی ایک نقل تھا۔ مگر پنڈت ہر پرساد شاستری نے اس مخطوطے کا نام اپنی طرف سے چریہ اچریہ ونشچے رکھا جب کہ مخطوطے پر اس کا نام چریہ اچریہ ٹیکا لکھا ہوا تھا۔

چریہ پدوں میں جو اسلوب وانداز بیان استعمال کیا گیا ہے اسے اچاریہ مُنی دت نے سندھیا بھاشا کی اصطلاح عطا کی۔ جس طرح سندھیا (شام) کے دھندلکے میں اشیا صاف طور پر نظر نہیں آتیں اسی طرح ان چریہ پدوں کا معنی ومفہوم ایک عام قاری پر پوری طرح واضح نہیں ہوتا۔ اس زبان و اسلوب کی وجہ سے چریہ گیتوں میں گہرائی، معنویت، تہہ داری اور تحیّر کا عنصر پیدا ہو گیا ہے اور چریہ گیت صرف مذہبی گیت نہیں رہ گئے ہیں بلکہ انھوں نے اعلیٰ ادبی فن پاروں کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔

ہندی اور بنگلہ کے محققین نے ان چریہ پدوں کا دورِ تخلیق آٹھویں صدی سے بارہویں صدی عیسوی قرار دیا ہے۔ چریہ پدوں کی زبان بنگلہ، میتھلی، اُڑیا اور آسامی کی ابتدائی شکل ہے۔ بنگلہ زبان کے ماہرین نے چاروں مخطوطوں کی زبان کے لسانیاتی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سراہا پاد کا دوہا کوش، کانہا پاد کا دوہا کوش اور

ڈاکٹر رب قدیم بنگلہ زبان میں نہیں بلکہ اپ بھرنش میں ہیں اور صرف چریہ پدوں کا مخلوطہ قدیم بنگلہ زبان میں ہے۔ بہر حال، چریہ پدوں میں کسی بھی ایک ہندستانی زبان کی واضح صورت نہ ہونے کی وجہ سے مختلف ہندستانی زبانوں کے ماہرینِ لسانیات نے انھیں اپنی زبان کا اوّلین ادبی سرمایہ قرار دیا۔ مثال کے طور پر میتھلی زبان کے ادیب ومحقق جے کانت مشرا نے چریہ پدوں کو میتھلی زبان کی اولین شعری تخلیق قرار دیا جب کہ راہل سنکر تائن اور دھرم ویر بھارتی نے چریہ پدوں کی زبان کو ہندی قرار دیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ میتھلی زبان کے عظیم ادیب جیوتر یشور ٹھاکر نے 1324 میں تصنیف کردہ اپنی کتاب 'ورن رتناکر' میں ابہٹ بولی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابہٹ بولی چند اپ بھرنش اور جدید ہندستانی زبانوں بنگلہ، اڑیا، میتھلی اور اسمیا کی ابتدائی مخلوط شکل ہے۔ ابہٹ کی خصوصیات میں الفاظ کے وسط یا آخر میں نون غنہ اور 'س' کی جگہ 'ہ' کی آواز کا استعمال ہے۔ چریہ پدوں کی زبان میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ بنگلہ زبان کے ماہر لسانیات اور محقق سنیتی کمار چٹرجی نے چریہ پدوں کی زبان اور اس کے رسمِ خط کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے کے بعد اسے قدیم بنگلہ زبان قرار دیا ہے۔ ان گیتوں میں قدیم بنگلہ زبان کے عناصر اور اس کی نحوی ساخت نمایاں ہیں۔ نیز ان میں مستعمل کچھ محاورے آج بھی بنگلہ زبان کا حصہ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اس قدیم بنگلہ زبان میں شورسینی اپ بھرنش کا اثر نمایاں ہے۔ تاڑ کے پتوں کا یہ مخلوطہ جس رسمِ خط میں لکھا ہوا ہے وہ جدید بنگلہ خط سے بہت حد تک مشابہ ہے۔ اس رسمِ خط کو کوٹل لپی کہتے تھے جو ہندستان کے مشرقی خطے بشمول نیپال میں ساتویں صدی سے بارہویں صدی کے درمیان رائج تھا۔ کوٹل رسمِ خط کو ہندی، بنگلہ اور اسمیا کی ابتدائی شکل مانا جاتا ہے۔

چریہ پدوں کے مخلوطے پر ناگری رسمِ خط میں 'چریہ اچریہ ٹیکا' لکھا ہوا تھا۔ اس سے محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب یہ مخلوطہ تیار کیا گیا تھا اس وقت قدیم بنگلہ رسم الخط رائج تھا مگر جب مخلوطہ نیپال کی دربار لائبریری میں محفوظ کیا گیا تب تک سرکاری زبان ناگری بن چکی تھی۔ اس لیے شاہی لائبریری کے لائبریرین نے اس کا اندراج کرتے وقت اس کی شناخت کے لیے سرورق پر ناگری رسم الخط میں 'چریہ اچریہ ٹیکا' لکھ دیا۔ واضح ہو کہ چریہ پد کا مخلوطہ تیرہویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے اوائل میں تیار ہوا تھا۔

چریہ پد چونکہ گیت ہیں اور انھیں مذہبی تقریبات میں یا سادھوؤں کے اجتماعات میں گایا جاتا تھا اس لیے مخلوطے میں ہر گیت کے خالق کے نام کے ساتھ اس گیت کے لیے مخصوص راگ کا نام بھی درج ہے۔ ان گیتوں کو جن راگوں سے سجایا گیا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں:

راگ پٹ منجری، راگ گبڑا، راگ ارو، راگ گرجری، راگ دیب کری، راگ دیشاکھ، راگ بھیروی، راگ کامود، راگ دھنسی، راگ رام کری، راگ بھیرب، راگ براڑی، راگ شبری، راگ ملاری، راگ مالشی، راگ مانسی گبڑا، راگ کنہو گجری، راگ بنگال اور راگ اندرتال۔

بارہویں صدی میں بنگال کے مشہور سنسکرت شاعر جے دیو نے سنسکرت میں گیت گوبند نامی طویل نظم لکھی جو کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا ہر باب کسی مخصوص راگ پر مبنی ہے۔ اس میں جن راگوں کا ذکر آیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

راگ مالوگوڑا، راگ منگل گرجری، راگ رام کری، راگ گرجری، راگ دیشاکھ، راگ بھیربی، راگ دیسی براڑی۔ مندرجہ بالا سارے راگ چریہ پدوں کو بھی گانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ چریہ گیت بنگال کی ہی قدیم زبان و ثقافت کا حصہ ہیں۔ اس دور میں بنگال میں مذہبی گیتوں کے لیے یہی راگ مستعمل تھے۔ اس کے علاوہ ان گیتوں میں مختلف سازوں کے نام بھی آئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چریہ گیتوں کو سازوں کے ساتھ گایا جاتا تھا۔ بینا، کرتال، شنکھ، ڈمرو، ڈھول، نگاڑا، پکھاوج وغیرہ کا ذکر کئی گیتوں میں آیا ہے۔

چریہ پدوں میں مصرعوں کی تعداد عام طور پر دس ہوتی ہے۔ لیکن کچھ چریہ پدوں میں مصرعوں کی تعداد اٹھارہ، بارہ اور چودہ بھی ہے۔ شبر پاد کے دو چریہ پد اس مجموعے میں شامل ہیں اور دونوں میں مصرعوں کی تعداد چودہ ہے۔ بھُسکو پاد کے بھی دو چریہ پد اس میں شامل ہیں۔ چریہ پد 21 میں مصرعوں کی تعداد بارہ ہے جبکہ چریہ پد 43 میں مصرعوں کی تعداد صرف 8 ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ شعرا چریہ پدوں میں مصرعوں کی تعداد کی پابندی کو لازمی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا سارا زور مضمون اور خیال کی ترسیل پر ہوتا تھا۔ کانہو پاد بھی مصرعوں کی تعداد کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان کا ایک چریہ (چریہ 10) چودہ مصرعوں پر مشتمل ہے جبکہ دوسرا چریہ پد 10 مصرعوں پر مشتمل ہے۔

پنڈت ہر پرساد شاستری کی کتاب 'بودھ گان و دوہا' نے بنگلہ کے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ ان مخلوطوں خصوصاً چریہ پدوں کی دریافت نے بنگلہ زبان وادب میں موجود خلا کو پر کر دیا اور اس کی قدامت کو ثابت کیا۔ اس کتاب کی اشاعت سے بنگلہ زبان وادب کی تاریخ کی کتابیں فرسودہ قرار پائیں اور بنگلہ زبان وادب کی تاریخ نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ بنگلہ داں طبقے کو بنگلہ ادب کی کم مائیگی کا جو احساس تھا وہ چریہ پدوں کی دریافت سے دور ہو گیا۔ ان کی زبان اور ادبی قدر و قیمت پر تحقیقی و تجزیاتی کام ہونے لگا۔ بنگلہ ادب کے محققین اور ماہرینِ لسانیات نے متفقہ طور پر چریہ پدوں کو بنگلہ زبان کا اوّلین ادبی نمونہ قرار دیا۔

ہندستانی ادب خصوصاً بنگلہ ادب میں چریہ پدوں کی اہمیت ان کی مذہبی نوعیت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی قدامت اور شاعری کے اعلیٰ نمونوں کی حیثیت سے ہے۔ ان کی ادبی قدر و قیمت اس لیے بھی ہے کہ ان کی وجہ سے بنگلہ زبان کے ارتقا میں گم شدہ کڑیوں کی بازیافت ممکن ہو سکی۔ چریہ پدوں نے بنگلہ شاعری ہی کو نہیں بلکہ ہندستانی شاعری کو بھی بہت حد تک فکر و اسلوب کی سطح پر متاثر کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بودھ شاعری کے ان نمونوں سے ہندستان کی بعد کی متاخر شعری روایتوں مثلاً ناتھ شاعری، بنگال کی باؤل شاعری، ویشنو شاعری اور اسلامی صوفیانہ شاعری نے فیض حاصل کیا۔ امیر خسرو، بابا فرید، کبیر، لالن فقیر، میرا بائی و دیگر صوفی شاعروں کی شاعری پر چریہ پدوں کا اثر بیش و کم دیکھا جا سکتا ہے۔

■

Suhail Arshad
Mirza Ghalib Street, Rajabaandh
P. O. Raniganj- 713347 (West Bengal)
Mob.:9002098517
s_arshad7@rediffmail.com

تاریخ گوئی

فن، اصول اور روایت

عبدالقوی

اردو ادب اور فنِ ریاضی سے بیک وقت شغف رکھنے والے حضرات/شعرا کے لیے فن تاریخ گوئی نہایت عمدہ اور دلچسپ فن ہے۔ یہ فن قدیم بھی ہے اور صرف انھی زبانوں میں رائج ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں ہندسہ 'حرف' کی قیمت مقرر کرتا ہے اور حرف 'ہندسے' کو نہ صرف یادگار بناتا ہے بلکہ اس کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ نتیجتاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ اور علم ہندسہ کا ادغام فن تاریخ گوئی کی اساس ہے۔ اس علم سے استفادہ کرتے ہوئے ہم حیات و ممات، انسانی زندگی کا کوئی اہم واقعہ یا قومی سطح پر رونما ہونے والا کوئی کارنامہ، عمارات کے سنینِ تعمیر، افراد کی پیدائش، مختلف تحریروں کے سنینِ تالیفات و طباعت اور مادی زندگی کے مختلف شعبوں کی کارکردگی نیز مہتم بالشان واقعات کو تاریخی مادّے کی شکل میں برآمد کرسکتے ہیں جو مرورِ ایام سے محفوظ رہ کر آسانی سے دماغ پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ ہمارے گذشتہ لمحات کو چند اعداد میں مقید کردینے کا ایسا عمل ہے، جو ماضی کا شاندار حوالہ بھی ہوسکتا ہے اور مستقبل میں کسی اچھے عمل کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔ علم بدیع کی اصطلاح میں 'تاریخ' اس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی واقعے کا سنہ وقوع کسی لفظ، محاورے، فقرے یا مصرعے کے ذریعے بحساب جمل لگایا جائے۔ تاریخ گوئی کا اصطلاحی مفہوم مولوی نجم الغنی نے بحر الفصاحت میں اس طرح بیان کیا ہے:

''......اصطلاح میں تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا عبارت، مصرع یا بیت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے عددوں سے بہ حساب جمل سنہ اور سال کسی واقعہ، شادی یا وفات کے معلوم ہوں یا نکاح خواہ تولد فرزند یا تصنیف کتاب خواہ لڑائی یا بادشاہ کے جلوس یا کسی اور امر کے وقوع کا زمانہ سمجھا جائے۔''

(بحر الفصاحت، مولوی نجم الغنی، مطبع منشی نولکشور لکھنؤ، اشاعت دوم 1927، ص 996)

فن تاریخ گوئی ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے مادۂ تاریخ رقم کیا جاتا ہے اور اس کے لیے شعرا نے دیگر اصناف سخن کے مقابلے صنف 'قطعہ' کو زیادہ ترجیح دی۔ قطعہ کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں یہ ایک صنف شعر ہے، جس میں قوافی کی ترتیب قصیدے یا غزل کے مطابق ہوتی ہے۔ یعنی تمام اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن غزل اور قصیدے کے برعکس قطعہ میں مطلع نہیں ہوتا اور مقطع بھی ضروری نہیں۔ قطعہ کے لیے کم از کم دو شعر کا ہونا ضروری ہے البتہ زیادہ سے زیادہ اشعار کی کوئی حد بندی نہیں۔ پھر بھی غزل کی طرح قطعے کی طوالت بھی دس بارہ شعروں تک ہی مناسب سمجھی جاتی ہے۔ قطعات میں عام طور پر ردیف سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ بہر حال 'قطعہ' ایک ایسی صنف ہے جس میں تاریخ کہنا دیگر اصنافِ سخن کے مقابلہ زیادہ آسان ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس صنف میں دیگر اصناف سخن کے مقابلے عروضی پیچیدگیاں نسبتاً کم ہیں۔ صنف 'قطعہ' کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات مادۂ تاریخ کسی اور صنف میں نظم کیا گیا ہے لیکن عموماً اس پر عنوان 'قطعہ تاریخ' ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں بلند پایہ شعرا کے دیوان و کلیات کے مرتبین نے کی ہیں اور یہ اغلاط مثنوی اور رباعی کے ضمن میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ مسلم الثبوت ہے کہ تاریخ گوئی کے سلسلے میں اس صنف کا پلہ دیگر اصناف سخن کے مقابلے بھاری ہے۔ یہ ایسا فن ہے جس کے ذریعے بحساب جمل حروف کے بامعنی مرکبات کی عددی قیمتوں اور مادۂ تاریخ کو اعداد کی شکل میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے قدیم تاریخ گو شعرا نے اس فن میں نہ صرف دلچسپ مادوں کی شکل میں ماضی کے جواہر پاروں کو محفوظ کیا بلکہ رباعیات اور قطعات کی شکل میں ان مادوں کو اتنا دلچسپ بنادیا کہ بعض مادے آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ ویسے تاریخیں نثر میں بھی رقم کی جاتی ہیں، جس میں ایک لفظ یا جملے سے مادۂ تاریخ نکالا جاتا ہے لیکن جہاں تک مختلف اصناف کی تاثیر کا سوال ہے تو شاعری کی فوری تاثیر مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن تاریخ گوئی کے آغاز سے ہی شعرا، اشعار اور مصرعوں میں موجود حروف و الفاظ سے تاریخیں برآمد کرتے رہے ہیں، اس میں کسی صنف کی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ شعرا نے کبھی مثنوی، رباعی، قطعہ، نظم اور غزل میں مادہ ہائے تاریخ نکالے لیکن جہاں تک صنف قطعہ کا تعلق ہے تو یہ دیگر اصناف کی بہ نسبت مخصوص اوزان و بحور کی قید سے آزاد ہے۔

تاریخ گوئی کے فن، روایت اور اس کے آغاز و ارتقا کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کیونکہ انسانی معاشرہ اتنا قدیم ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کہا جاسکتا ہے کہ جب علم ہندسہ ایجاد ہوا ہوگا تو دوسری طرف علم ہجی بھی وجود میں آگیا ہوگا، جن کی ترقی یافتہ شکل ابجد ہے، جو تاریخ گوئی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کا بنیادی تقاضا ہے کہ اس کی حیات و ممات اور اس کے کارنامے اس کی زندگی کے بعد بھی برسہا برس یاد کیے جائیں۔

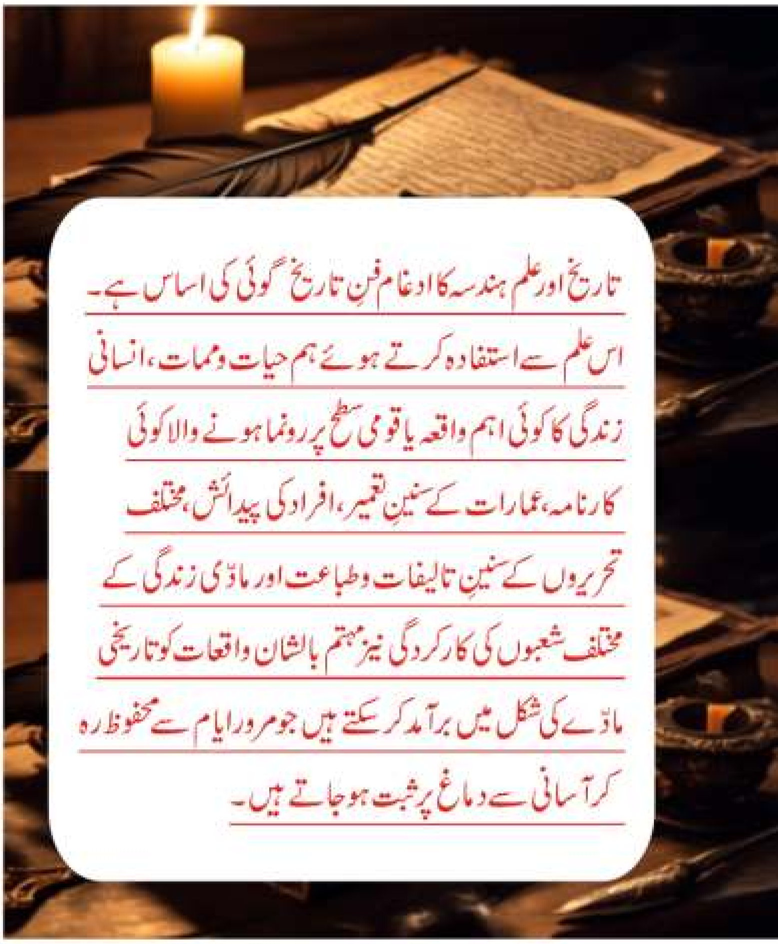

تاریخ اور علم ہندسہ کا ادغام فنِ تاریخ گوئی کی اساس ہے۔ اس علم سے استفادہ کرتے ہوئے ہم حیات وممات، انسانی زندگی کا کوئی اہم واقعہ یا قومی سطح پر رونما ہونے والا کوئی کارنامہ، عمارات کے سنینِ تعمیر، افراد کی پیدائش، مختلف تحریروں کے سنینِ تالیفات وطباعت اور مادّی زندگی کے مختلف شعبوں کی کارکردگی نیز مہتم بالشان واقعات کو تاریخی مادّے کی شکل میں برآمد کرسکتے ہیں جو مرورِ ایام سے محفوظ رہ کر آسانی سے دماغ پر ثبت ہوجاتے ہیں۔

قدیم عمارات پر ہم اکثر سنین دیکھتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عمارت کی تعمیر کی تاریخ لوگوں کو معلوم رہے۔ جب کوئی کارنامہ تاریخ کا حصہ قرار پاتا ہے اور اس کارنامے کو جاوداں بنانے کے لیے انسان کے دل میں یہ تحریک پیدا ہوتی ہے کہ اس کو قائم و دائم رکھا جائے تب تاریخ گوئی کا وجود ہوتا ہے۔ اسلامی دور کے مشہور تاریخی واقعات، فتوحات، سنین پیدائش و وفات، جلوس شاہانہ، تصانیف کتب وغیرہ یہ ایسے کارنامے ہیں جنھیں یادگار بنانے کے لیے قطعے کی صورت دے دی گئی، جس کے ایک ٹکڑے سے اس کی تاریخ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ عربوں نے حروف کے اعداد مقرر کیے، ان میں شعر گوئی کا بھی وافر رجحان تھا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربوں ہی نے پہلے پہل تاریخ لکھی:

''ابجد کے مقررہ کلمات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ کلمات حضرت ادریس علیہ السلام کے وضع کردہ ہیں۔ فن تاریخ گوئی عربی اور فارسی سے ہوتا ہوا اردو میں پہنچا اور آج تک رائج ہے......''

(سیدہ عندلیب زہرا کانپوری، خاتون پاکستان کراچی (مضمون بعنوان فن تاریخ گوئی) جلد 14، شمارہ 3، ص:2)

اس فن کے اصول وقوانین اور شعریات کے سلسلے میں سب سے پہلے حروف ابجد کا تعین ضروری ہے کیونکہ 'ابجد' فن تاریخ گوئی کی اساس ہے۔ فن تاریخ گوئی میں حروف سے ہندسوں کو برآمد کرنے کے لیے جن بنیادوں کو کام میں لایا جاتا ہے وہ ابجد کہلاتے ہیں۔ ان حرفوں کے اعداد بھی مقرر کیے گئے ہیں جنھیں حساب جمل کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اپنے بچوں کے نام بھی اسی قاعدے کے مطابق رکھتے ہیں جس سے پیدائش کا برس نکلتا ہے۔ شان الحق حقی نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ''ابجد حروفِ تہجی کی وہ ترتیب ہیں جو الف۔ ب۔ د سے شروع ہوتی ہے۔'' ابجد کی صورت درج ذیل ہے:

حروف(1)	ا	ب	ج	د	(ابجد)
اعداد	1	2	3	4	
حروف(2)	ہ	و	ز		(ہوز)
اعداد	5	6	7		
حروف(3)	ح	ط	ی		(حطی)
اعداد	8	9	10		
حروف(4)	ک	ل	م	ن	(کلمن)
اعداد	20	30	40	50	
حروف(5)	س	ع	ف	ص	(سعفص)
اعداد	60	70	80	90	
حروف(6)	ق	ر	ش	ت	(قرشت)
اعداد	100	200	300	400	
حروف(7)	ث	خ	ذ		(ثخذ)
اعداد	500	600	700		
حروف(8)	ض	ظ	غ		(ضظغ)
اعداد	800	900	10000		

مذکورہ بالا حروف کے علاوہ بعض حروف کے اعداد اس طرح ہیں:

پ	ٹ	چ	ڈ	ڑ	ژ	گ
2	400	3	4	200	7	20

حروف ابجد کے بارے میں مختلف روایات مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے مخصوص معنی ہیں جس کے مطابق: 'ابجد' آغاز کیا، 'ہوز' مل گیا، 'حطی' واقف ہوا، 'کلمن' سخن گو ہوا، 'سعفص' اس نے سیکھا، 'قرشت' ترتیب دیا گیا، 'ثخذ' نگہبانی کی اور 'ضظغ' تمام کیا وغیرہ۔ بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام جب جنت الفردوس سے زمین پر آئے تو ایک بہشتی زبان اپنے ساتھ لائے جو اپنی اصل کے اعتبار سے عربی ہی کی ایک شکل تھی، اسی کو ابجد یا خالص عربی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ایک قول کے مطابق ابا جاد نامی بادشاہ کے نام کا مخفف 'ابجد' ہے اور باقی سات کلمے اس کے سات فرزندوں کے نام ہیں۔ ایک تصور یہ بھی ہے کہ 'ابجد' 'مرامر' نامی شخص کے آٹھ فرزندوں کے نام ہیں، جبکہ بعض علما نے ان آٹھوں کلمات کو شیاطین کے ناموں سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے سلاطین کے ناموں سے جبکہ عین ممکن ہے کہ یہ کلمے بامعنی نہ ہوں اور محض ابجد کی ترتیب ظاہر کرنے کے لیے استعمال میں لائے گئے ہوں۔

تاریخ گوئی کے لیے عربی حروف کو بنیاد قرار دیا گیا ہے اور فارسی و ہندی حروف مثلاً پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ اور گ کو ابجد میں کوئی مقام نہیں مل سکا لہٰذا فارسی، ہندی اور اردو کے تاریخ گو شعرا نے اپنے حروف کو ابجد کے ماتحت رکھتے ہوئے متذکرہ بالا حروف (پ، ٹ، چ، ڈ، ڑ، ژ اور گ) کو ان کی مساوی شکل ب، ت، ج، د، ر، ز اور ک کا ہم عدد قرار دیا اور مادہ تاریخ نکالنے کے لیے پہلا اصول یہ قرار

پایا کہ تاریخ گوئی کے لیے حروف مکتوبی کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس طرح اس اصول کی پوری طرح پابندی کرنے میں تاریخ کہنے میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس فن میں تلفظ سے زیادہ کتابت کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ابجدی کائنات میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا مخرج یکساں ہے مثلاً الف اور عین، ت اور ط، ث، س اور ص نیز ز، ذ، ظ، ض وغیرہ۔

اس طرح محض حروف مکتوبی کو اساس بنا کر مادہ تاریخ نکالا جائے گا خواہ وہ حروف مکتوبی پڑھنے میں آئیں یا نہ آئیں۔ مثلاً؛ عبدالقوی کا (الف) اگرچہ بولنے میں نہیں آرہا ہے لیکن اس کے عدد شمار کیے جائیں گے کیونکہ یہ مکتوبی حرف ہے۔ اسی طرح عربی کے بعض الفاظ مثلاً 'آمنوا' اور 'بینوا' کے آخر میں 'الف' اگرچہ پڑھنے میں نہیں آرہا ہے لیکن اس کے بھی اعداد شمار کیے جائیں گے۔ بعض ایسے حروف جن پر تشدید واقع ہوتی ہے، وہ دو مرتبہ پڑھے اور بولے جاتے ہیں، لیکن مکتوبی اصول کے نقطۂ نظر سے انھیں صرف ایک ہی حرف شمار کیا جائے، جیسے خرم اور فرخ میں صرف ایک (ر) کے عدد ہی شمار کیا جائے گا کیونکہ ان کی مکتوبی حالت ایک ہے یعنی 'ر' ایک ہی بار تحریر میں آرہا ہے اس لیے انھیں ایک بار شمار کیا جائے گا۔

بعض ہندی حروف جو دو حروف کا مرکب ہوتے ہیں جیسے بھ، پھ، دھ وغیرہ، مکتوبی قاعدے کے مطابق ان کے دو حروف شمار ہوں گے یعنی (بھ) میں 'ب' اور 'ہ' دونوں شمار کیے جائیں گے۔

الف ممدودہ (آ) کی لفظی ادائیگی (اآ) کی صورت میں بنتی ہے لیکن چونکہ لکھنے میں ایک الف شمار کیا جاتا ہے لہٰذا الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی قیمتیں یکساں ہوں گی یعنی ان کو ایک ہی عدد شمار کیا جائے گا۔ اس سیاق میں اختلافات بھی ہیں، بعض حضرات الف ممدوہ کو دو عدد جبکہ بعض ایک ہی عدد شمار کرتے ہیں۔ الف ممدوہ کو دو عدد شمار کرنے والوں کا خیال ہے کہ چونکہ:

1 عربی میں الف ممدودہ میں دو الف ہیں۔
2 فن عروض میں بھی 'آ' بروزن 'فا' شمار ہوتا ہے۔
3 فارسی کی تمام لغات میں حروف تہجی کے بیان میں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کی فصلیں جدا جدا قائم کی گئی ہیں۔
4 الف ممدودہ پڑھنے میں دراز ہوتا ہے جیسے آمدن اور آوردن وغیرہ اس لیے دو عدد شمار کیے جائیں گے۔

الف ممدودہ کو ایک عدد شمار کرنے والے حضرات اپنے موقف میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ چونکہ:

حساب جمل میں مکتوبی حروف کو ملفوظی حروف پر ترجیح دی جاتی ہے، لہٰذا 'آ' کو ایک ہی عدد شمار کرنا چاہیے۔

تائے مدورہ یعنی گول 'ۃ' کا معاملہ سب سے زیادہ نازک ہے۔ تا عربی رسم الخط میں دو طرح سے لکھی جاتی ہے:

1 دراز جیسے 'ت' جس کا نام عربی میں تائے مبسوط ہے۔
2 گول جیسے 'ۃ' اس کو عربی میں مدورہ، مربوط یا تائے تانیث کہتے ہیں۔

پھر تائے مدروہ 'ۃ' کو دو طرح سے لکھنے کا رواج ہے:

1 تائے مدورہ جو اپنے مابعد حرف سے متصل نہ ہو جیسے توبہ، کعبہ، حجہ، وغیرہ۔ ایسی صورت میں تائے مدورہ کے نقطوں کو حذف کر دیا جاتا ہے اور پڑھنے میں 'ہ' کی آواز دیتی ہے۔
2 تائے مدورہ موصولہ جو اپنے مابعد حرف سے متصل ہو جیسے توبۃ النصوح، کعبۃ اللہ، حجۃ اللہ وغیرہ۔

ابجد کے حساب سے قرشت کی (ت) کے عدد چار سو ہیں جب کہ تائے مدورہ (ۃ) جب کسی مقام پر حالت ہائے ہوز میں تبدیل ہو تو اس کا عدد محض پانچ رہ جاتا ہے۔ اس لیے مورخین نے اپنی اپنی ضرورتوں کے مطابق اس مسئلے کا تدارک کر لیا لیکن بعد میں اس فن کے مستند ماہرین نے جو اصول متعین کیے اس کے مطابق (ت) کے ہر حالت میں چار سو عدد ہوں گے خواہ وہ تائے مدورہ (ۃ) ہو یا تائے قرشت (ت) جیسے مراۃ العروس کی 'ۃ' لہٰذا اس کے چار سو عدد لیے جائیں گے البتہ کبھی کبھار تائے مدورہ کو ہائے ہوز (ہ) میں تبدیل کر کے لکھا جاتا ہے جیسے روضہ، جلسہ تو ایسی صورت میں یعنی جب تائے مدورہ کو بشکل ہائے مختفی یعنی بغیر نقطوں کے لکھا جائے تو وہ ہائے ہوز (ہ) ہی شمار کی جائے گی اور اس کے عدد پانچ لیے جائیں گے۔

ہمزہ حروف ابجد کے قبیل سے خارج ہے۔ چونکہ ہمزہ الف کی ہی ایک شکل ہے اس لیے اس کا کوئی عدد نہیں لیا جائے گا۔ اس حرف کے بارے میں مورخین میں خاصا اختلاف ہے۔

کھڑا زبر، کھڑی زیر، تنوین، تشدید وغیرہ کو حروف میں شمار نہیں کیا جاتا لہٰذا ان کے اعداد شمار نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ یہ حروف نہیں بلکہ حرکات ہیں۔ عیسیٰ، موسیٰ، ذاتہٖ، لغیرہٖ، دفعتاً، یقیناً، عزّت، تدبّر وغیرہ پر کھڑا زبر، کھڑی زیر، تنوین اور تشدید کی علامت لکھنے کے باوجود اس کے اعداد کو شمار نہیں کیا جائے گا۔

زیر میں خان شاہد اکبرآبادی جو سائل دہلوی کے شاگرد تھے، کا ایک قطعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ قطعہ مولانا الطاف حسین حالی کی تاریخ وفات نکالنے کے سلسلے میں تخلیق کیا گیا تھا، اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک ہی شعر سے ہجری اور عیسوی دونوں سنہ برآمد ہوتے ہیں۔

اس قدر برسے ہیں ان کی یاد میں آنکھوں سے اشک
آنکھ میں اشکوں کے جو سوتے تھے سب خالی ہوئے
کیوں نہ ہو شاہد لب تاریخ پر 'مغفور باد'
1333ھ

جاں نواز اردو ادب میں حضرت حالی ہوئے

1914

بہر حال فارسی اور اردو میں فن تاریخ گوئی حروف ابجد کی مرہون منت ہے۔ فارسی شعرا اس فن کے ذریعے عرصۂ دراز سے کمالات کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اس میدان میں بتدریج ترقی کا عمل جاری ہے۔ فارسی شاعری میں کامیابی کے بعد یہ فن برصغیر ہند و پاک میں آیا اور یہاں بھی اس کا آغاز فارسی زبان سے ہی ہوا۔ ہندوستان میں فارسی شعرا کی اتباع میں قطعات تاریخ رقم کرنے کا رواج رہا کیونکہ اردو تاریخ گوئی اصول و قوانین کے سلسلے میں فارسی تاریخ گوئی کی مرہون منت تھی۔ اس طرح اردو زبان نے وسیع پیانے پر فارسی زبان سے استفادہ کیا اور وہ تمام اصطلاحیں جو فارسی تاریخ گوئی میں رائج تھیں من و عن لے لیں۔ فارسی زبان میں تاریخ گوئی کو زیادہ مقبولیت ملنے کا سبب یہ تھا کہ فارسی کی مخصوص اصطلاحات اور الفاظ و تراکیب کو اعداد کے نقطۂ نگاہ سے برتنا قدرے آسان تھا۔ اس طرح یہ سلسلہ سودا سے شروع ہو کر ناسخ اور ان کے تلامذہ تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ ناسخ اور جرأت اس میدان کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔

فارسی اور اردو میں فن تاریخ گوئی حروف ابجدکی مرہون منت ہے ۔ فارسی شعرا اس فن کے ذریعے عرصۂ دراز سے کمالات کا مظاہرہ کرتے چلے آرہے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اس میدان میں بتدریج ترقی کا عمل جاری ہے۔ فارسی شاعری میں کامیابی کے بعد یہ فن برصفیر ہند وپاک میں آیا اور یہاں بھی اس کا آغاز فارسی زبان سے ہی ہوا۔

اردو زبان کا ابتدائی دور دکنی دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں بھی فارسی کے زیر اثر تاریخیں کہنے کا رواج ملتا ہے البتہ ناسخ کے یہاں دو چار تاریخیں اردو میں اور دکنی دور میں چند مثالیں اردو تاریخ گوئی کی بھی مل جاتی ہیں۔ سودا کے یہاں بہت کم تعداد میں ہی سہی لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کے قطعات تاریخ بھی ملتے ہیں۔ سودا کے بعد اساتذۂ دہلی کے طبقۂ متاخرین میں جرأت کے یہاں سب سے زیادہ قطعات تاریخ ملتے ہیں۔ اسی عہد میں قائم چاند پوری، ممنون اور راسخ کے یہاں بھی چند قطعات کا ذکر ملتا ہے۔

مرکز شاعری لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد ناسخ اور آتش کا زمانہ آیا، جس میں ناسخ کا نام فن تاریخ گوئی کے بنیاد گزاروں میں اس لیے بھی سر فہرست ہے کہ ان کے تلامذہ نے اپنے استاد کی اتباع کر کے ناسخ کا نام روشن کیا۔ ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، رشک، بحر، منیر، آباد اور طاہر وغیرہ میں سے اکثر نے تاریخ گوئی میں اہم کارنامے انجام دیے۔ اس وقت کے عظیم مرثیہ گو میر انیس اور مرزا دبیر نے بھی تاریخ گوئی کے سلسلے میں فارسی قطعات پر اکتفا کیا۔ غرضیکہ دبستان لکھنؤ کے طبقۂ متقدمین میں اردو تاریخ گوئی کو اتنا عروج نہ مل سکا جتنا کہ دبستان دہلی کی دوبارہ بحالی پر غالب و مومن کے عہد میں حاصل ہوا۔

غالب اور مومن سے قبل شاہ نصیر دہلوی کے یہاں بھی تاریخیں ملتی ہیں لیکن اکثر و بیشتر تاریخیں فارسی زمین میں ہیں۔ غالب کے یہاں بھی تاریخوں کی کثرت ہے۔ دیوان غالب 'نسخۂ عرشی' میں اردو قطعات تاریخ کی تعداد چھ ہے۔ حصہ دوم 'نوائے سروش' میں دو اور حصہ سوم 'یادگار نالہ' میں چار، جب کہ ان کے فارسی دیوان میں تاریخوں کی تعداد زیادہ ہے۔ فن تاریخ گوئی کے حوالے سے مومن خاں مومن کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں بھی فارسی قطعات کی کثرت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو تاریخ گوئی کو بھی نہایت بلند مقام عطا کیا۔ غالب کے بعد ان کے شاگردوں میں میر مہدی مجروح کے یہاں غالب کی نسبت زیادہ قطعات تاریخ ملتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر مکمل مصرعوں میں تاریخیں نکالی ہیں۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے بہت سے شعرا ریاست رام پور اور حیدر آباد منتقل ہو گئے یہ دور امیر مینائی اور داغ دہلوی کا تھا۔ ان دونوں غزل گو شعرا کے یہاں اردو قطعات تاریخ کی بہتات نظر آتی ہے۔ ان کے بعد اردو میں قطعات تاریخ گوئی کے سیاق میں جن شعرا کا نام سر فہرست ہے ان میں ضامن علی جلال لکھنوی، صفی لکھنوی، دل شاہجہان پوری، ریاض خیر آبادی، جوش ملسیانی، ہادی مچھلی شہری، جلیل حسن جلیل مانک پوری، نسیم لکھنوی، احسن مارہروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، ولی حیدر آبادی، نفیس لکھنوی، وسیم خیر آبادی، رفعت بریلوی، وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، مسعود حسن مسعود، حفیظ ہوشیار پوری، شان الحق حقی، عرشی امرتسری، رئیس امروہوی، شاہ لکھنوی وغیرہ شامل ہیں۔ فن تاریخ گوئی کو مولانا الطاف حسین حالی جیسے مجتہد شاعر نے بھی فروغ دیا۔ کلیات نظم حالی میں ان کے قطعات تاریخ کی تعداد سات ہے، جس میں تاریخ دربار قیصری کی طباعت اور مولانا محمد حسین آزاد کی تاریخ وفات عمدہ مثالیں ہیں۔ حالی نے غالب کی وفات کی تاریخ جو ان کی مشہور غزل کے شعر سے نکالی ہے، وہ اس طرح ہے:

ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا | سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا
'تاریخ' ہم نکال چکے پڑھ بغیر 'فکر' | 'حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'

1285

آخری شعر سے 2796 کا عدد برآمد ہو رہا تھا، لیکن اس میں سے 'فکر' کے 300 اور 'تاریخ' کے 1211 اعداد منہا کر دیے گئے، اب نئی صورت میں 1285 کا عدد برآمد ہو رہا ہے، جو غالب کا سنہ وفات ہے۔ اس طرح حالی نے بعض اعداد نکال کر پھر اس میں سے بعض اعداد کو منہا کر کے متعینہ تاریخ برآمد کی ہے، جو قطعات تاریخ کی تکنیک میں نیا اضافہ ہے۔

مصادر و مراجع:

1. قطعات و رباعیات، ترتیب بند از غلام رسول مہر، مجلس یادگار غالب لاہور 1969
2. فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1984
3. اردو رباعی: فنی و تاریخی ارتقا ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، طبع دوم 1982
4. اردو میں قطعہ نگاری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، یونیورسل پبلی کیشنز، لاہور 1975
5. اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، طبع اول 1963

■

Abdul Qavi
Asst Prof. Azeem Memorial
PG College, Biswan, Sitapur- 261201 (UP)
Mob.:6396932929

عبدالرحیم خانخاناں کی تعمیری و ادبی خدمات

عارف انصاری

'مآثر رحیمی' میں تحریر ہے" جب تیندوے نے انسانوں کو آتے دیکھا، وہ غصّے سے لپکا۔ سپہ سالار نے سب سے زیادہ تلوار کے ہاتھ اس تیندوے کو مارے اور اس کے سر کو دو نیم کر دیا۔"

سیّد منصور علی سہروردی کے ذریعے کیے گئے مآثر رحیمی کے اردو ترجمہ میں صفحہ نمبر 206 پر جرأت و بہادری کی روشنی بکھیرتی اس تحریر میں موجود سپہ سالار شکاری کوئی اور نہیں مرزا عبدالرحیم خانخاناں ہیں۔ خانخاناں ایک اچھے شکاری، رزم و بزم کے دھنی اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔

عبدالرحیم خانخاناں کی ولادت اکبر اعظم کے اتالیق وسپہ سالار بیرم خاں کے یہاں 1556 میں لاہور میں ہوئی تھی۔ رحیم نے 71 برس کی عمر پائی۔ ایک روایت کے مطابق 1626 اور ایک دوسری روایت کے مطابق 1627 میں رحیم نے جانِ عزیز جاں آفریں کے سپرد کی۔

عبدالرحیم کی یادگاروں میں سب سے بڑی یادگار فارسی کتاب 'مآثر رحیمی' ہے جو عبدالرحیم کے حکم پر برہان پور میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کے مصنف ملا عبدالباقی نہاوندی ہیں۔ قابل مصنف نے اس کتاب میں بیرم خاں اور عبدالرحیم کے کوائف نیز دیگر سیاسی، سماجی حالات تفصیل سے تحریر کیے ہیں۔لیکن عبدالرحیم سے متعلق صرف 1616 تک کے حالات ہی تحریر کیے جا سکے ہیں۔ بیرم خاں کی رحلت کے بعد عبدالرحیم کی پرورش چار سال کی عمر سے بطور 'خانہ زاد' مغلیہ سلطنت کے شہنشاہ اکبر اعظم کی دیکھ ریکھ میں ہوئی۔ عبدالقادر جاوید انصاری نے 'تاریخ زرنگار برہان پور' میں لکھا ہے:

''اکبر بادشاہ نے بیرم خاں کی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرزا عبدالرحیم کی پرورش اور تربیت اپنی خاص نگرانی میں کرائی۔ مرزا نے اپنی ابتدائی عمر کا حصہ حصول تعلیم میں صَرف کیا اور لہو لعب سے دور رہا۔ جب سن شعور کو پہنچا تو علمی ماحول نے اس کے ذہن رسا کو حیرت انگیز تابانی بخشی۔'' (تاریخ زرنگار برہان پور، ص 255)

لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب

مآثر رحيمي

(جلد اول)

محمد هدايت حسين عفا الله عنه

مآثر رحیمی میں ہے کہ عبدالرحیم نے بغیر کسی استاد کی مدد کے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ 16 کے سن کو پہنچے تو ان کی جنگی مہارتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں سپہ سالار بنا دیا گیا۔

مسلسل تربیت اور مشق و ممارست کے ساتھ جیسے جیسے خانخاناں کی عمر بڑھتی رہی بادشاہ سلامت انھیں کسی نئی خدمت پر متعین کرتے رہے۔ جب خانخاناں 28 برس کے ہوئے تو انھیں شہزادہ جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ مآثر رحیمی سہروردی کے ترجمہ میں ہے۔'' بادشاہ نے جب ان کے احوال اور نئے پن کا مشاہدہ کیا تو آزمائش کے لیے خدمات پر معمور فرمایا...... چنانچہ 28 برس کی عمر میں شہزادہ کامگار یعنی جہانگیر کی اتالیقی پر جو اس زمانے میں شیخو کے نام سے مشہور تھا، مقرر کیا۔''

(مآثر رحیمی...... مترجم سید منصور علی سہروردی، ص 88)

ملکی دارالخلافہ کی طرح دکن کے دارالسلطنت برہانپور سے عبدالرحیم خانخاناں کی گہری وابستگی رہی۔ اس دیار میں عبدالرحیم خانخاناں نے بعد کے دور میں اپنی عمر کا بہترین زمانہ گزارا۔ خانخاناں کے برہان پور قیام اور دکن کی صوبیداری کے دور میں محققین کے درمیان اختلاف ہے۔ 'رحیم گرنتھاولی' میں خاندیش (برہان پور) میں گذارے گئے ان کے وقت کی میعاد 30 سال تحریر کی گئی ہے۔ مولوی معین الدین ندوی نے بھی یہ مدت 30 برس بتائی ہے۔ عبدالقادر جاوید انصاری نے خانخاناں کی صوبے داری کی مدت 32 سال تحریر کی ہے۔ دکن کی صوبے داری کے زمانے کی جہاں تک

عبدالرحیم نے بغیر کسی استاد کی مدد کے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ 16 کے سن کو پہنچے تو ان کی جنگی مہارتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں سپہ سالار بنا دیا گیا۔

بات ہے یہ قلمدان خانخاناں کو اکبر اعظم کے انتقال 1605 کے بعد عہد جہانگیر میں میسر آیا تھا۔ اس سے قبل عبدالرحیم وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ 'مآثر' میں ہے جب خاندیش بنایا گیا اس کا پہلا صوبیدار دانیال اور وزیر عبدالرحیم خانخاناں مقرر ہوا۔ احقر کے تحقیقی مقالے برہانپور کی اردو شاعری پر 'دبستانِ لکھنؤ کے اثرات' میں صفحہ نمبر 32 پر تحریر ہے:

''مغل شہنشاہ اکبر 27 اکتوبر 1605 کو فوت ہوا اور مغلیہ سلطنت کا اگلا تاجدار سلیم جہانگیر آگرہ کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ جہانگیر نے جنوب کی ساری ذمہ داریاں عبدالرحیم خانخاناں کو سونپ دیں۔''

جہانگیر کے ہاتھوں خانخاناں کو صوبیداری کی ذمے داری سونپے جانے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اس منصوبے پر 1605 یا اس کے بعد ہی عمل درآمد ہوا تھا۔ 1605 کے بعد خانخاناں کے 1627 تک بقید حیات رہنے یعنی 22 سال تک مزید زندہ رہنے کے شواہد ملتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ موصوف اپنی زندگی کے آخری برسوں میں دکن یا برہانپور میں موجود نہیں تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں خانخاناں کی صوبے داری کے دورانیے اور برہانپور قیام کے زمانے کا تعین کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

خانخاناں کے قیام برہان پور کے دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ محل سرا میں گروہ بندی کی وجہ سے انھیں دارالسلطنت برہان پور سے واپس بلا لیا گیا۔ تاریخ جہانگیر میں ہے،'' نور جہاں کے گروہ نے یہ انتظام کیا کہ شہزادہ پرویز کو الٰہ آباد تبدیل کر دیا اور خانخاناں کو واپس بلا کر دکن کی مہم شہزادہ خرم کے سپرد کر دی۔'' (تاریخ جہانگیر: ڈاکٹر بنی پرساد: ص 264)

اتنا ہی نہیں حکومت مغلیہ کے ماتحت رہتے ہوئے خانخاناں کو برہانپور سے کئی بار وقفے وقفے سے دیگر علاقوں کا سفر بھی کرنا پڑا تھا، جو کئی مہینوں اور سالوں پر محیط تھا۔ اس لیے مسلسل تین دہائیوں تک خانخاناں کی برہانپور میں اقامت کا دورانیہ بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

خانخاناں کے اوصاف کی بات کریں تو الگ الگ دور میں ان کی طبیعت میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ 'مآثر' میں سہروردی کے اردو ترجمہ میں ہے:'' سحرخیزی سے لطف اندوز ہونا ان کی عادت ہے۔ فرائض و سنن کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ سلطنت ہوتے ہوئے بھی ہوس سے دور، تقویٰ وصلاح کے قریب تھے۔ خلق اللہ کے اہم کاموں اور ضروریات کی تکمیل کو اپنے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں۔''

(مآثر رحیمی... ترجمہ سہروردی، ص 197)

خدمت خلق کے جذبے کے تحت رحیم نے عوامی حمام اور نہر خیر جاری المعروف خونی بھنڈارہ کی تعمیر کروا کر تا قیامت یاد رکھا جانے والا کارنامہ انجام دیا تھا جس کے سبب ہر دور کے عوام کی نظر میں خانخاناں کا قد بلند ہونے کے ساتھ ان کا احترام بھی بڑھ جاتا ہے۔

برہانپور میں عہد مغلیہ میں جو تعمیرات ہوئیں ان میں سے متعدد شاہجہاں کے عہد شہزادگی اور صوبے داری کے دور میں ہوئیں۔ محل گل آرا کی عمارتیں، شاہجہانی عیدگاہ، قلعۂ ارک سے منسلک خوبصورت حمام ان میں خاص ہیں۔ عبدالرحیم خانخاناں نے برہان پور میں جو عمارتیں بنوائیں ان میں جہانگیری حمام (عوامی حمام) نہر خیر جاری، مسجد اور جہانگیری سرائے، دوسری جہانگیری سرائے جسے اکبری سرائے بھی کہا جاتا ہے، صحن جامع مسجد، مقبرہ شاہنواز خاں اور باغات وغیرہ ہیں۔ عبدالرحیم نے اپنی صوبے داری کے زمانے میں دارالسلطنت برہانپور میں عوامی حمام موجود نہ ہونے کی وجہ سے محسوس کی جانے والی پریشانیوں کے پیش نظر شہر کے میدان کے سرے پر ایک حمام تعمیر کروایا تھا جسے جہانگیری حمام کہا جاتا ہے۔ یہ حمام محلہ بیری میدان میں بوہرہ جماعت کی زکوی حویلی کے نزدیک زمانے کے سرد و گرم سہتا ہوا آج بھی خستہ حالت میں موجود ہے۔ گرگ خراسانی کے زیر اہتمام رفاہِ عام کے لیے تیار ہوئے اس حمام سے فیض یاب ہوتے ہوئے فقرا، مساکین اور عوام خانخاناں کی فرماں روائی کے لیے اکثر دعا کرتے تھے۔

سحرخیزی سے لطف اندوز ہونا ان کی عادت ہے۔ فرائض و سنن کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ سلطنت ہوتے ہوئے بھی ہوس سے دور، تقویٰ وصلاح کے قریب تھے۔ خلق اللہ کے اہم کاموں اور ضروریات کی تکمیل کو اپنے کاموں پر ترجیح دیتے ہیں۔

عبدالرحیم خانخاناں کی تعمیرات میں ایک اہم کارنامہ نہر خیر جاری کی تعمیر ہے۔ اس نہر کو عرف عام میں خونی بھنڈارہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اس زمانے میں برہانپور میں پانی کی قلت تھی۔ خانخاناں نے ست پڑا کی پہاڑیوں میں میٹھے پانی کے چشمے تلاش کر کے تقریباً دس کلومیٹر زمین دوز نہر بنوائی تھی۔ گچ اور پتھروں سے بنی یہ نہر زیر زمین ہونے کے ساتھ دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ تعمیری اعتبار سے یہ اپنی مثال آپ کہی جاتی ہے۔ مآثر رحیمی، تاریخ زرنگار برہانپور اور دیگر کتب میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

خانخاناں نے فاروقیوں کے دور کی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ کہی جانے والی جامع مسجد کے برباد ہوتے دالان کو اپنے دور میں نئے سرے سے تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔

انگریز سفیر تھامس رو جب 1615 میں برہانپور میں موجود تھا، اس نے عوام کے مٹی سے بنے ہوئے مکانات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے سفرنامے میں شہزادہ پرویز، امرا اور خانخاناں کے پکے مکانات بشکل محلات موجود ہونے کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے 'خانخاناں جب برہانپور میں تھے، انھوں نے ایک وسیع محل بنوایا تھا۔ اس کا بلند گنبد، اس کی زیب و زینت، اس کا رنگ برنگا فرش، مختلف رنگوں سے سجی اس کی چھت قابل تعریف ہے''

(مآثر رحیمی: ترجمہ سہروردی: ص 227)

خدمت خلق کے جذبے کے تحت رحیم نے عوامی حمام اور نہر خیر جاری المعروف خونی بھنڈارہ کی تعمیر کروا کر تا قیامت یاد رکھا جانے والا کارنامہ انجام دیا تھا جس کے سبب ہر دور کے عوام کی نظر میں خانخاناں کا قد بلند ہونے کے ساتھ ان کا احترام بھی بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح سنگ خارا کا حوض، جہانگیری سرائے اور دوسری جہانگیری سرائے کی تعمیر بھی خانخاناں کے دور میں ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ مقبرہ شاہنواز خاں بھی رحیم خانخاناں کے دور کا فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ مقبرہ دراصل خانخاناں کے پانچ فرزندان میں سے سب سے بڑے بیٹے مرزا ایرج یعنی شاہنواز خاں کا مدفن ہے جو اتاولی ندی کے کنارے سطح زمین سے کافی اونچائی پر موجود ہے۔ آج کل محکمۂ آثار قدیمہ نے اس احاطے میں ایک باغ لگوادیا ہے جس کے سبب یہ برہانپور کے سیاحتی مراکز میں سے ایک اہم مرکز کے بطور جانا پہچانا جانے لگا ہے۔ یہ عمارات چار صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی آثار قدیمہ کے بطور اپنے وجود کا احساس کراتی ہے۔ کچھ عمارات ضرور ایسی بھی رہی ہوں گی جن کا وجود وقت کے طوفان میں ختم ہو کر رہ گیا ہو۔

ان شواہد کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ خانخاناں کو فن تعمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ ساتھ ہی وہ شاعری اور فنون لطیفہ میں بھی معاصرین میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ فن سپہ گری، جنگلی جانوروں کے شکار کا شوق، فن تعمیر اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی مل کر عبدالرحیم خانخاناں کو انوکھا اور نرالا ثابت کرتے ہیں۔ شاید ان صلاحیتوں کے پیش نظر ہی جہانگیر کو اپنی تزک میں تحریر کرنا پڑا تھا۔ ''خانخاناں قابلیت اور خوبیوں میں سارے عالم میں نرالا تھا۔'' خانخاناں شاعر و ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شاعر نواز بھی تھا۔ اس نے اپنے دربار میں دیگر سلطنتوں اور ممالک کے شعرائے کرام کو جمع کر رکھا تھا۔ مولوی معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

''نوعی، شاعر برہانپور میں عبدالرحیم خانخاناں کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے ایک مرتبہ خانخاناں کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر سنایا تو خانخاناں نے اسے دس ہزار روپے نقد، ایک ہاتھی، ایک عراقی گھوڑا اور خلعت فاخرہ عطا کیا تھا۔''

(دارالسرور برہان پور: مولوی معین ندوی: ص 20)

عبدالرحیم خانخاناں کو کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی، وہ فارسی کے علاوہ برج بھاشا یعنی ہندی میں بھی شعر کہتے تھے، نیز فارسی ہندی کے اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ہندی فارسی سے لذت آشنائی کے بعد زبان کا ذائقہ تبدیل ہوا تو خانخاناں نے اردو کی تشکیل کے دور میں ہندی فارسی لفظوں کے سہارے ریختہ یا قدیم اردو

میں اشعار کہے۔ نکات الشعراء، تذکرۂ ریختہ گویاں، مجموعۂ نغز، مخزن نکات اور آب حیات وغیرہ میں بکھرے اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ خانخاناں نے قدیم اردو میں شعر کہے ہیں۔ بطور مثال دو شعر حاضر ہیں۔

ارے ناداں نین اپنے سجن کو کیوں رٹھایا ہے
روٹھا کر پیوں کو جگ میں کسو نے ذوق پایا ہے
بہت پچھتائے گا میری نصیحت مان کہتی ہوں
سکھی کو رات سبوہی سپیار یکو جو بھایا ہے

خانخاناں کو فارسی ہندی زبانوں کے علاوہ دیگر زبانوں پر عبور حاصل ہونے کے سلسلے میں مآثر الامراء سے یہ اقتباس حاضر خدمت ہے:

''خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود، عربی و فارسی و ترکی و ہندی رواں داشت۔ شعر خوب می فہمید و گفت'' (ترجمہ) خانخاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے زمانہ تھا۔ اس کی عربی، فارسی اور ترکی اور ہندی رواں تھی۔ شعر سمجھنے اور تخلیق کرنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔

عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری میں انھیں بطور خاص ہندی دوہوں کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔ عہد حاضر میں زبان زد خاص و عام چند دوہے حاضر خدمت ہیں۔

رحیمن پانی راکھیے، بن پانی سب سون
پانی گئے نہ اوبرے، موتی، مانش چون
بگری بات بنے نہیں، لاکھ کرو کن کوئے
رحیمن پھاٹے دودھ کو، متھے نہ ماکھن ہوئے

حیرت کی بات ہے نہاوندی نے رحیم کے ہندی دوہے 'مآثر' میں کہیں نقل نہیں کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے شاید وہ زبان ہندی سے ناواقف تھے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رحیم کے یہ دوہے بیسویں صدی کی دریافت ہیں اور محققین ان کی صحت پر مزید تحقیق کی گذارش کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ مغلیہ سلطنت کے فرمانرواؤں اکبر اعظم، جہانگیر اور شاہجہاں کے مقرب و معزز کہے جانے والے عبدالرحیم خانخاناں فارسی، ہندی، اردو اور ترکی میں شعر کہنے کے ساتھ اپنی متعدد صلاحیتوں کے سبب بھی اپنے دور میں نمایاں رہے۔ خانخاناں نے خاندیش کے دارالسلطنت برہان پور میں اپنی سکونت کے دور میں نہ صرف متعدد علاقوں کو فتح کیا اور عمارات بنوائیں بلکہ غریبوں کے آنسو پونچھنے کے ساتھ ادبی دنیا کو محبتوں بھری ایسی تخلیقات سے نوازا جس کی ادبی دنیا میں دوسری مثال نہیں ملتی۔ رحیم کے اس دوہے پر بات تمام کی۔

رحیمن دھاگا پریم کا، مت توڑو چٹکائے
ٹوٹے سے پھر نہ جڑے، جڑے گانٹھ پری جائے

ماخذات

1 مآثر رحیمی (خانخاناں بیرم اور عبدالرحیم کی سوانح) مصنف: عبدالباقی نہاوندی، مترجم: سیّد منصور علی سہروردی مطبع: معارف پریس، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2017

2 تزک جہانگیری (نورالدین جہانگیر بادشاہ)، مترجم: مولوی احمد علی صاحب رامپوری، مطبع: مکتبہ الحسنات دہلی، 2001

3 تاریخ جہانگیری، مصنف: ڈاکٹر بینی پرساد، مترجم: رحم علی الہاشمی، مطبع ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، سن اشاعت 1979

4 مآثر رحیمی، مصنف: عبدالباقی نہاوندی مترجم: محمد اسماعیل فہمی برہانپوری، مطبع: مکتبہ دیوبند، سنہ اشاعت: 2020

5 تاریخ زرنگار برہانپور، مصنف جاوید انصاری شائع کردہ: حمید الحق فہمی، 2021

6 رحیم گرنتھاولی (ہندی) مصنف ودیا نواس مشر مطبع: وانی پرکاشن دہلی

7 دارالسرور برہانپور، مصنف: مولوی معین الدین ندوی مطبع: سردار پریس مالیگاؤں، 1978

8 برہانپور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات، مصنف: ڈاکٹر عارف انصاری، ناشر: فاضلی اردو لٹریری اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہانپور، 2018

■

Dr. Arif Ansari
34/ 274, New Bus Stand Road
Jai Smith
Burhanpur- 506244 (MP)
Mob.:9993994141
drarif786aa@gmail.com

منظور احمد دکنی

محمود ایاز کی نظمیہ شاعری

محمود ایاز کے ادبی کارناموں میں ادبی صحافت، تنقیدی تحریریں اور شاعری شامل ہیں۔ وہ شاعر و ادیب سے زیادہ ادبی صحافی کی حیثیت سے اردو دنیا میں انفرادی شان رکھتے ہیں۔ سوغات کی ادارت کے ذریعے آج سے ربع صدی قبل تک ان کے نام اور کام کی گونج سنائی دیتی رہی۔ ادبی صحافت سے ہمہ وقت وابستگی کی وجہ سے ان کی شعری و ادبی کاوشیں مقدار کے لحاظ سے کم ہیں مگر معیار و اعتبار کے لحاظ سے انفرادی شناخت کی حامل رہی ہیں۔ محمود ایاز کی اولین شعری تخلیق (غزل) رسالہ 'چمنستان' میں 1945 کو شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی شعری تخلیقات اس دور کے معیاری رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا کلام 'نقش بر آب' کے نام سے 2001 میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ شعری مجموعہ ان کی تخلیقات کا انتخاب ہے۔ اگرچہ ان کی بہت سی تخلیقات اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں، تاہم اس مجموعے میں شامل نظمیں اور غزلیں نہ صرف ان کے تخلیقی اختصاص کے مطالعے کی دعوت دیتی ہیں بلکہ انفرادی حیثیت سے پُر ایک گم شدہ لہجے کی بازیافت پر دال ہیں۔

محمود ایاز کی ادبی تخلیقات کے بنیادی محرکات اور عوامل سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان کی شاعری درون ترسیل اور مصاحبے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ سچا تخلیق کار اپنی داخلی شخصیت سے ہم کلام ہوتا ہے تاہم اس کے ہرگز یہ معنی نہ لیے جائیں کہ وہ خارجیت سے بے نیازی دکھاتا ہے بلکہ وہ اپنے خارجی مشاہدے کی بنیاد پر اپنے داخلی احساسات و جذبات کو لفظوں کا پیراہن عطا کرتا ہے اور قاری اس کے فکر و فن کے نہاں خانے تک پہنچ کر داد و تحسین پیش کرتا ہے اور یہی وصف شاعر کی شخصیت اور فکر و فن کی عکاسی کرتے ہوئے جذباتِ حقیقی کو شعری جامہ پہناتا ہے اور سنجیدہ قاری کے فکر و احساس کو مہمیز بھی کرتا ہے۔ محمود ایاز تخلیق کے اصل راز سے واقف ہیں اور وہ جدید شاعری بالخصوص جدید نظم کی روایت، ارتقائی مراحل اور مسائل اور اس کی اصل فکر کے مرکزی دھارے سے بڑی حد تک جڑے ہوئے ہیں۔ جدید نظم کے ان عناصر کا جائزہ لینا ایک تفصیلی بحث کا تقاضا کرتا ہے۔ راقم الحروف فی الحال ان تفصیلات میں جائے بغیر جناب محمود ایاز کی کچھ نظمیں جیسے نیا سفر، انتظار اور آخری منزل سے اقتباسات پیش کرتا ہے تاکہ ان کی فکر اور اسلوب کی عکاسی ہو سکے۔

تعلقات کا فسوں کدورتوں کا غبار
دلوں کا بغض محبت کے دائروں کا حصار
مسرتوں کا ہر اک رنگ غم کا ہر لمحہ
گزرتی موج کے مانند اُبھر کے ڈوب گیا

(نظم: نیا سفر، ص 21)

یہ دل جو زندگیِ نو کے خواب دیکھتا ہے
یہ غم جو روح کی پہنائیوں میں جاگتا ہے
تری نگاہ سے چھٹ کر سکونِ جاں نہ ملا
نفس نفس میں امیدوں نے زہر گھولا ہے

(نظم: انتظار، ص 28)

تعلقاتِ جہاں کی ستم گری سے الگ
غم و نشاطِ تمنا کی دسترس سے دور
تمام عمر کی جہدِ حیات سے تھک کر
ہزاروں حسرتیں مشتِ غبار میں ڈھل کر
کچھ ایسے سوئی ہیں خاموشیوں کے مرقد میں
کہ تا ابد کوئی آواز پا جگا نہ سکے

(نظم: آخری منزل، ص 33)

مذکورہ نظموں کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جدید شاعری جو میراجی، راشد، فیض اور اختر الایمان وغیرہ کے فکر و فن کے ساتھ سفر کرتے ہوئے آگے بڑھی اور رد و قبول کے کئی مراحل طے کرتی رہی۔ محمود ایاز بھی اسی راہ کے مسافر رہے چنانچہ یہ نظمیں جہاں اپنے مخصوص تخلیقی تصور اور ہیئت کے لحاظ سے کلاسیکی لفظیات کا تانا بانا بنتے ہوئے نئے امکانات کا پتہ دیتی ہیں وہیں شاعر کے تخلیقی ذہن کے فنی و لسانیاتی تصورات اور نئے جہانوں کی سیر کرواتی ہیں۔ محمود ایاز نے اپنی نظموں کے ذریعے نظم کے تاریخی و تدریجی نقطۂ نظر کو ملحوظِ خاطر رکھا اور لسانی معیار و اعتبار کی مروجہ حدود کو بامعنی اور تر و تازہ بنانے کی سعی کرتے رہے۔ اس عمل میں انھوں نے لفظی ترتیب سے زیادہ کام لیا ہے جو معنویت سے پُر نظر آتی ہیں۔ اس طرح ان کا رشتہ فنی جہتوں سے بھی منسلک ہو جاتا ہے۔

محمود ایاز کی شاعری ترقی پسند تحریک کے دور میں فروغ پائی۔ ظاہر ہے کہ شاعر اپنے عہد کے تقاضوں سے متاثر ہوتا ہے، لہٰذا ان کے کلام میں اس دور کے مروجہ لفظیات و نظریات راہ پانے لگے۔ ایسے میں ان کا رنگ انفرادیت کا حامل ہوا اور ان کی نظموں کو جمال اور عصر کا امتزاج قرار دیا جانے لگا۔ اس طرح ان کا اپنا اسلوب تشکیل پایا، فنی و فکری لحاظ سے بھی ان کلام عمدہ ہے۔ شاعروں میں ایاز صاحب غالباً فیض اور اختر الایمان سے متاثر نظر آتے ہیں، اس کے باوجود ان کا اپنا طرز نمایاں ہے اس ضمن میں اکرام باگ لکھتے ہیں:

"محمود ایاز کا زمانہ شاعری ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ فیض اردو شاعری کے قد آور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ میراجی اور راشد کی آوازیں بھی پہچانی جانے لگی تھیں۔ اختر الایمان کو ابھرتے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا تھا۔ غزل میں فراق اور ناصر کاظمی نے اپنی شعری پہچان بنالی تھی۔ محمود ایاز کلاسیک شعرا کے پارکھ تھے اور اقبال کے فکر و

فلسفے نے ان پر گہرا اثر ڈالا تھا۔محمود ایاز کی شاعری پر مذکورہ شعرا کے اثرات مختلف انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ایاز صاحب کی شاعری میں وقت کا تصور اقبال اور اخترالایمان کے امتزاج سے ایک نئے زاویے سے ظہور پذیر ہوا ہے۔فراق اور فیض کا اثر ان کی لفظیات سے مترشح ہے۔''

(تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی:محمود ایاز اور سوغات کا دور سوم (تدوین وتحقیق)،ڈاکٹر اکرام باگ،2006،ص49)

اردو شاعری کا مزاج غزل کا مزاج رہا ہے۔ اشارے اور کنایے کی جتنی مثالیں غزل میں پائی جاتی ہیں اتنی شاید کسی اور صنف میں نہیں ملتیں۔محمود ایاز نے بھی ان صفات شعری سے خوب فائدہ اُٹھایا۔انھوں نے ان خصوصیات کو نہ صرف غزل بلکہ اپنی نظموں میں بھی استعمال کیا۔ اشارات کے سلسلے میں میراجی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''سچی شاعری وہی ہوتی ہے جو اشاراتی (علامتی) ہو... بات کو دھندلکے میں رکھنے سے ایک حسن پیدا ہوجاتا ہے علامت خیال سے بڑھ کر آپ روپی صورت ہے،اشاراتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے اُمڈ کر نمودار ہوتا ہے۔''

میراجی کا مذکورہ بالا اقتباس محمود ایاز کی نظمیہ شاعری پر بھی صادق آتا ہے، ابہام و اشارات سے انھوں نے اپنی شاعری کو سجایا ہے۔اشاروں اور کنایوں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے جب ہم کسی شاعر کے مزاج و منہاج سے واقف ہوتے ہیں تو قاری کا رابطہ اشاراتی زبان کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ایاز کی چند نظموں کے اقتباسات مثالاً پیش کی جاتی ہیں۔

چاندنی سطحِ سمندر پہ رواں
ریگ پہ آسودہ ہے
ساحلِ بحر کے سناٹے میں
دور افتادہ جزیروں میں اسیر
بین کرتی ہوئی موجوں کی صدا آتی ہے

(نظم:ایک تصویر،ص38)

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خروشاں سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے

(نظم:نوحہ،ص40)

...اس سے پہلے بھی کئی بار
یہ بے کیفی ایام کی رو دیکھی ہے
مگر اب کے نہ بچیں گے
یہ گماں ہے دل کا

(نظم:اندیشہ گماں باداشت،ص52)

اردو نظمیہ شاعری کی جدید گرمی سے لبریز مذکورہ نظمیں جہاں شاعر کے داخلی کرب کا منظر بیان کرتی ہیں وہیں نئے انسان اور نئے دور کے مسائل و مراحل کے مختلف ابعاد کی جانب ذہن و دل کو راغب کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان نظموں میں عہد نو کی جہتوں اور مدارج کا احساس ہوتا ہے ان کے یہاں ماضی،حال سے مربوط و مبسوط ہو کر مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔غرض یہ نظمیں شاعر کے لسانی و لفظیاتی مطالعے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی، اخلاقی،تہذیبی اور معاشرتی جمالیات کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔شاعری میں علامتوں کا استعمال ایک ضروری شے گردانا گیا ہے،شعری اظہارات کا انحصار علامتوں کا متقاضی ہوتا ہے،یہ علائم واستعارات اور ابہام واشارات کے توسط سے تخلیق پاتے ہیں۔محمود ایاز نے بھی اپنی نظمیہ شاعری کو علامتوں کے وصف سے سجایا اور سنوارا ہے اُن کی علامتیں منفرد ہیں اور ان میں ابہام اور اشارت بھی نمایاں ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''اجمال اور جدلیاتی لفظ کے بعد ابہام شاعری کی تیسری اور آخری معروضی پہچان ہے۔[موزونیت اور اجمال کی موجودگی ہمیشہ فرض کرتے ہوئے] ہم یہ کہہ سکتے ہیں اگر کسی شعر میں صرف ابہام ہی ہے تو بھی وہ شاعری ہے۔عام طور پر جدلیاتی لفظ اور ابہام ساتھ ساتھ آتے ہیں لیکن جس طرح تنہا جدلیاتی لفظ شعر کو شاعری میں بدل دیتا ہے،اسی طرح تنہا ابہام بھی شعر کو شاعری بنا دیتا ہے۔شعر میں ابہام یا تو علامت سے پیدا ہوتا ہے یا ایسے الفاظ کے استعمال سے جن سے سوالات کے چشمے پھوٹ سکیں۔ جتنے سوالات اٹھیں گے شعر اتنا ہی مبہم اور اتنا ہی اچھا ہوگا۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی،شعر،غیر شعر اور نثر،ص96،(2005)،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی)

محمود ایاز کی شاعری ابتدا ہی سے فکر و فن کے تقاضوں سے ہمکنار رہی۔اُن کی نظموں میں ابہام و اشارت اور علائم کا خلاقانہ استعمال ملتا ہے اس کے علاوہ پیکر تراشی کا تخلیقی اور فنکارانہ استعمال بھی ان کے یہاں نمایاں رہا ہے۔لفظوں کا صوتی آہنگ اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔وہ اپنے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کے لیے پیکر سازی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ان کے یہاں پیکر تراشی کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ان کی بیشتر نظمیں صفتِ پیکر پر دلالت کرتی ہیں۔

کرب کی رات اٹل ہے
لیکن
نیند آجائے تو دم بھر سولوں

(نظم:نیا سسی فس،ص57)

بسوں کا شور دھواں دھوپ کی شدت
بلند بالا عمارات سرنگوں انساں
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا یہ جمِ غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اک کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آواز پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں

(نظم:شب چراغ،ص46)

محمود ایاز نے مختلف فنی جہتوں کا تعین کیا ہے۔ان کی نظموں کے علائم واستعارے کی معنویت کو پیش نظر رکھیں تو ان کے فنی اختصاص کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے فکری نہاں خانے کے بعض عناصر جیسے شکست و تنہائی،حزن و ملال،حیات و ممات کی کشاکش وغیرہ کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔غرض ایاز صاحب کی نظمیہ شاعری کے جائزے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی نظمیں کسی طے شدہ راہ پر نہیں چلتی اور نہ ہی شعری نظریات کی تابع ہوتی ہیں،بلکہ ان کی کچھ اپنی مخصوص لفظیات و مرکبات،اشاراتی وعلامتی طرز،جدید ذہنی و جذباتی رویے اور نئی شعری جمالیات کا دلچسپ منظر نامہ پیش کرتی ہیں جو ان کے شعری سفر میں ان کی نظموں کا شناخت نامہ بن گئی ہیں۔

■

Manzoor Ahmed Deccani
H. 5-38, Bakshi Haveli , Roza (B)
Dargah Road, Beside Inamdaar Petrol Pump
KALABURAGI-585104
Cell: 9964801454
Email: drmnzrd@gmail.com

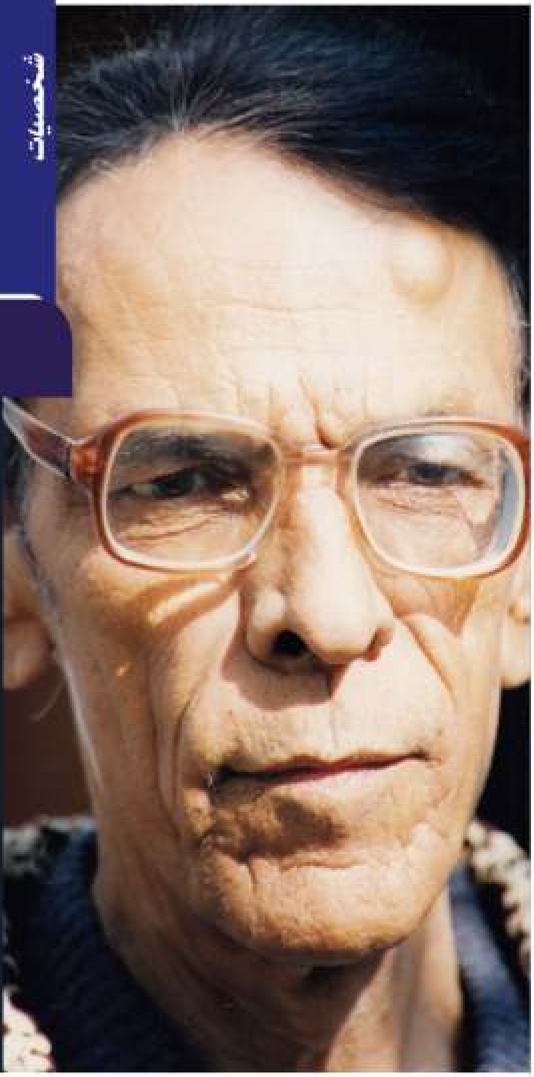

آصفہ زینب

نیر مسعود کے افسانوں کی انفرادیت

نیر مسعود کا شمار برصغیر میں فارسی ادب کے علاوہ اردو ادب کے چند اہم دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی نثر بظاہر بہت صاف شفاف اور آر پار دکھائی دینے والی کیفیت سے معمور ہے، مگر اس میں خیال کی تہہ داری، پیچیدگی اور معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے لیکن ان کی تصنیفات میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے افسانوں کی ہے۔ جدید ادب میں ان کی شہرت ایک جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ہیں۔ جن میں پہلا مجموعہ 'سیمیا' (1984)، دوسرا 'عطر کافور' (1990)، تیسرا 'طاؤس چمن کی مینا' (1998)، چوتھا 'گنجفہ' (2008) اور 'آخری ڈھول بن' ہے جو 2011 میں شائع ہوا۔

نیر مسعود نے افسانہ نگاری کی عام روش سے ہٹ کر منفرد انداز اختیار کیا۔ لہٰذا اردو افسانہ نیر مسعود کے عہد میں جن اسالیب سے پہچانا گیا ان میں ایک اہم اسلوب نیر مسعود کے افسانوں کا تھا۔

انھوں نے اردو افسانے میں اپنے علامتی انداز بیان کے مختلف تجربے کیے اور اپنی فنی مہارت سے لفظوں کی نئی قبائیں تراشیں اور ان کے معنی کو نئے پیراہن عطا کیے۔ نیر مسعود کی افسانہ نگاری کے متعلق کچھ دانشوروں کی رائے یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے میں علامتی بیانیے کا ایک نیا در کھولا ہے۔ سہیل وحید کو ایک انٹرویو کے دوران جواب دیتے ہوئے نیر مسعود نے کہا تھا:

''... ایک اور خیال رکھا ہے کہ استعارہ اور علامت نہ آنے پائے کہانی میں۔ کہانی کا علامتی مفہوم نکالا جا سکتا ہے لیکن میں نے علامتی کہانی تو شاید لکھی نہیں، استعارہ تو تقریباً ہے ہی نہیں۔ میرے یہاں تشبیہ ہوگی بہت لیکن استعارہ نہیں۔ استعارہ کا عمل دوطرفہ ہوتا ہے کہ جو چیز ہے اسی کو کچھ اور بتائیں۔ استعارہ شاعری کے لیے مناسب ہے نثر کے لیے نہیں۔ استعارہ میں ٹھیک سے ترسیل نہیں ہو پاتی۔''

(انٹرویو سہیل وحید، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی جولائی، 2008، ص6)

دوسری طرف معروف فکشن نگار سید محمد اشرف صاحب نیر مسعود کے افسانوں میں تشبیہ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

''جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ نیر مسعود کی کہانی کے بیانیہ میں وضاحت اور طوالت شاید اس لیے ضروری ہیں کہ وہ زبان کے دیگر ہتھیاروں کا استعمال کہانی کی نازک سی فضا کے لیے قاتل سمجھتے ہیں تبھی تو ان کے بیان میں تشبیہ اور استعارے بہت کم ہیں۔ دونوں کتابوں میں مشکل سے اتنی تشبیہیں ہوں گی جتنی ہمارے ہاتھوں میں انگلیاں۔ تشبیہیں تعداد میں بھی کم ہیں اور بنفسہٖ بہت اہتمام کے ساتھ یا عمدہ طریقے پر استعمال بھی نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں تشبیہوں کی کمی اس لیے بھی ہے کہ تشبیہ کسی ایسی چیز کے لیے دی جاتی ہے جو موجود بھی ہو اور محسوس بھی ہو۔ نیر مسعود کے یہاں معاملہ یہ ہے کہ ان کی کہانی میں بیشتر چیزیں موجود ہیں بھی اور نہیں بھی۔ اس لیے ان کے یہاں تشبیہوں کا استعمال بجا طور پر کم بہت کم ہے۔ استعارہ تو ان کی نثر میں تشویش ناک حد تک عنقا ہے۔ غالباً وہ استعارے پر صرف شاعری کا اجارہ سمجھتے ہیں۔''

(نیر مسعود کی کہانیاں، کھوئے ہوؤں کی جستجو، سید محمد اشرف، ص10,11)

جب کہ نیر مسعود کے افسانوں کے مطالعے کے بعد راقم الحروف کی اپنی رائے یہ ہے کہ نیر مسعود کے کہنے کے مطابق نہ تشبیہوں کی تعداد بہت ہے اور نہ سید محمد اشرف صاحب کے کہنے کے مطابق اتنی کم کہ انگلیوں پر گنی جا سکے۔ تشبیہیں ہیں لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کہ افسانے کے بیانیے کی خوبصورتی مجروح ہو جائے اور نہ ہی اتنی کم کہ افسانے کے بیانیے کی رفتار رک جائے۔

نیر مسعود کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر باب جہاں سے شروع ہوتا ہے اور جہاں ختم ہوتا ہے اور پھر جہاں سے دوسرا باب شروع ہوتا ہے

سب میں ایک ربط اور تسلسل ہے اور یہ تسلسل تخلیقی، فکری اور معنوی نوعیت کا ہے۔ ہر باب اپنی جگہ مکمل ہے اور ہر باب دوسرے باب سے مربوط بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں کچھ ایسی صفت ہے کہ وہ آغاز سے انجام تک ایک تاثر نہیں دیتا بلکہ افسانے کا متن قاری کو بار بار پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔ نیر مسعود ایک ایسے ادیب تھے جن کی تحریروں کو کما حقہ سمجھنے والا قاری آج تک نہیں مل سکا۔ کیونکہ انھوں نے واقعات کی بنت ایسے الفاظ کے ذریعے کی ہے جو اپنے اندر معنی کی نئی نئی جہتیں چھپائے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی کہانیوں کے بطون میں چھپی ہوئی بات کو سمجھنا ہر قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کے فن کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد سریت پر استوار ہے جس کی وجہ سے افسانے تفہیم کی سطح پر ذرا مشکل ہی سے کھلتے ہیں اور یہی پیچیدگی ان کے افسانوں کی خوبصورتی ہے۔ نیر مسعود کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا آغاز وانجام ایک جیسا نہیں ہوتا، یعنی آغاز اگر بہت واضح ہے تو انجام بہت الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض اوقات تو سمجھ میں نہیں آتا کہ افسانہ یہاں کیوں کر ختم ہوسکتا ہے۔

نیر مسعود کے افسانوں کے کردار اپنے لیے ڈھالی جانے والی فضا میں پہنچ کر ویسے نہیں رہتے جیسا کہ وہ عام زندگی میں ہوتے ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ افسانہ نگار کا بیانیہ انھیں مختلف کر دیتا ہے، عجیب طرح کا مختلف کہ بظاہر وہ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ کوئی عام زندگی میں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے، مگر بیانیے کی بنت کے اندر ایک عجب اسرار داخل ہوجاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں خوابناک فضا کی موجودگی قاری کے لیے دلکشی کا باعث بنتی ہے، انھیں خوابوں سے جیسی انسیت رہی اسے دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ خواب، خواب نہ ہوں بلکہ حقیقت کا ایک دوسرا روپ ہو۔ نیر مسعود نے خوابوں کو پرچھائیوں کی شکل میں پیش نہیں کیا اور اسی لیے ان کے یہاں کردار پرچھائیں کی صورت اختیار نہیں کر سکے، جس کا اظہار 2007 کا سرسوتی سمان قبول کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

’’سن 70ء کے قریب میں نے ایک مکمل اور مربوط خواب دیکھا۔ محسوس ہوا کہ یہ تو اچھا خاصا افسانہ بن سکتا ہے۔ میں نے اس خواب کو معمولی ردو بدل کے بعد لکھ دیا۔ یہ میرا پہلا مکمل افسانہ 'نصرت' تھا۔ افسانے میں کچھ خواب کی اور کچھ دھندلکے کی کیفیت تھی جو میرے کئی دوسرے افسانوں میں بھی محسوس کی گئی۔ مجھے خود یہ کیفیت بہت پسند نہیں ہے لیکن یہ خود بخود آجاتی ہے، شاید اس لیے کہ میرے بہت سے افسانوں کی بنیاد میرے خوابوں پر ہے، مثلاً مارگیر، اوجھل، مراسلہ، سلطان مظفر کا واقعہ نویس، ندبہ، اکلٹ میوزیم، شیشہ گھاٹ، علام اور بیٹا، خالق آباد، خوابوں پر مبنی ہیں۔‘‘

(پروفیسر نیر مسعود ادیب دانشور، شاہد ماہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص 26,27)

نیر مسعود کا اردو افسانے پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے ایک ایسے فطری، قدرتی اور وجودی مظہر کو موضوع بنایا جو ہمیں کسی اور دنیا سے مربوط کرنے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ یہ بہت بڑا موضوع ہے۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہ ہوگا جس نے کبھی خواب نہ دیکھا ہو۔ آخر خواب میں جس تجربے سے ہم گزرتے ہیں وہ کیا ہے؟ اس بات کو سمجھانے کے لیے انھوں نے خواب کو اپنے افسانے کا وسیلہ بنایا۔ ان کا مقصد خواب کی حقیقت کو سمجھانا ہے،

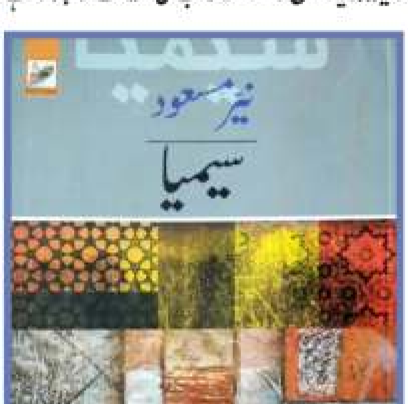

جس سے اس حقیقت کا اندازہ ہوجائے کہ اس جسم کے ماورا کوئی اور بھی حقیقت ہمارے جسم میں پائی جاتی ہے۔ جو چیز ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ تو موجود ہے ہمارے سامنے، لیکن جس چیز کو ہم خواب میں دیکھتے ہیں وہ بھی کہیں ہے اور ہم جو دیکھتے ہیں بند آنکھوں سے تو اس بات کی نشاندہی ہے کہ ہمارے اندر بھی کوئی قوت ہے۔ جب ہم کسی ادیب اور ادب کو

نیر مسعود کے افسانوں کے کردار اپنے لیے ڈھالی جانے والی فضا میں پہنچ کر ویسے نہیں رہتے جیسا کہ وہ عام زندگی میں ہوتے ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ افسانہ نگار کا بیانیہ انھیں مختلف کردیتا ہے، عجیب طرح کا مختلف کہ بظاہر وہ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسا کہ کوئی عام زندگی میں ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے، مگر بیانیے کی بنت کے اندر ایک عجب اسرار داخل ہوجاتا ہے۔

پڑھتے ہیں تو صرف اس کے متن تک محدود نہیں رہتے بلکہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ اس سے اٹھنے والے علمی، فنی، فکری، نفسیاتی، اخلاقی، عرفانی، وجودی، وجدانی مسائل پر غور کرتے چلے جائیں اور یہ تمام سرمایہ ہمارے پاس نیر مسعود کے کلام میں، ان کی تصنیفات میں، ان کی نثر میں اور ان کے افسانوں میں ملتے ہیں۔

پورے اردو ادب کے نثری سرمایے کو دیکھا جائے تو یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ سب سے مضبوط، مستحکم اور حقیقی نثر نیر مسعود نے ہی لکھی ہے۔ ان کی نثر میں سادگی و پرکاری ہے۔ کون سی صنعت ہے جو ان کے یہاں نہیں ہے، مگر وہ دکھائی بھی نہیں دیتی کیونکہ اس سادگی سے انھوں نے برتا ہے جیسے بہتے ہوئے شفاف پانی میں ہائیڈروجن اور آکسیجن نہیں دکھائی دیتے۔ نیر مسعود کے پاس پوری معروضیت کے ساتھ موزونیت گہرائیوں میں اترتے چلے جانے کا ہنر تھا اور ان کا یہی وصف اپنی پوری موزونیت کے ساتھ ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کی خوبی کو دیکھ کر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پورے علمی، فکری اور دانشورانہ سفر طے کرنے کے بعد افسانہ لکھ کر اشارہ کیا ہے کہ دیکھو جب ایک دانشور افسانہ لکھتا ہے تو کیسے لکھتا ہے۔

نیر مسعود نے ہمیشہ موضوع کے مقابلے میں ہیئت کو اہمیت دی، اور ان کی اسی خوبی نے انھیں ایک الگ مزاج کا تخلیق کار بنا دیا۔ ان کی کہانیوں کا انداز بیان اور ہر صفحہ پر موجود تجسس طویل سے طویل افسانے کو بھی پڑھنے پر قاری کو مجبور کرتا ہے۔

نیر مسعود تخلیقی نثر لکھنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ ایک فضا بنانا جانتے تھے، تاثر کو گہرا اور دیرپا بھی کر دیتے تھے۔ فنا یا موت کا احساس ان کا مرکزی تخلیقی تجربہ تھا۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے مٹنے والے وجود اور ہستی کی باز یابی کا تجسس اور انتظار لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کے یہاں دیکھنے سے زیادہ سونگھنے، سننے اور چھونے کی حسیات کے ذریعے ہمہ وقت تحلیل ہوتی ہوئی اس دنیا کو بازیاب کرنے کی خواب نما امنگ ملتی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے واحد متکلم کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے لکھنوی تہذیب کے پس منظر میں اپنے تاریخی اور اسطوری تجربے، مشاہدے اور مطالعے کی روشنی میں تصورات اور تخیلات کی ایک ایسی دنیا تعمیر کی ہے جس میں قدیم روایات اور اقدار کے ساتھ ایک پورے دور کی تاریخ زندہ ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ان کی زبان سادہ، تراشیدہ، صاف شفاف اور کہانی بیان کرنے کا اسلوب تمثیلی یا استعاراتی الجھاؤ سے پاک ہے۔ نیر مسعود کے زیادہ تر افسانوں میں محض کسی ایک قصے کا بیان نہیں ملتا بلکہ اس سے جڑے اور قصوں کا بیان بھی شامل رہتا ہے۔ ان کے یہاں پلاٹ کا باضابطہ التزام نہیں ملتا۔ انھوں نے وحدت تاثر اور مربوط پلاٹ پر استوار یک رخے افسانے لکھنے سے احتراز کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ اکہرے نہیں ہوتے بلکہ ذیلی پلاٹ اصلی پلاٹ پر حاوی ہو جاتے ہیں، لیکن ان کا یہ فنی کمال ہے کہ اختتام کے وقت اس کا اصلی پلاٹ پھر کسی نہ کسی صورت میں سامنے آجاتا ہے اور تمام ذیلی پلاٹ کے نقوش دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر طلسم، حیرت، جادو، دہشت اور خوف پایا جاتا ہے۔ نیر مسعود کی تصنیفات میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے افسانوں کی ہے۔ جدید ادب میں ان کی شہرت ایک جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ ان کو منفرد اسلوب میں لکھے ہوئے افسانوں کی بدولت غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ نیر مسعود نے ہمیشہ موضوع کے مقابلے میں ہیئت کو اہمیت دی، اور ان کی اسی خوبی نے انھیں ایک الگ مزاج کا تخلیق کار بنا دیا۔ ان کی کہانیوں کا انداز بیان اور ہر صفحہ پر موجود تجسس طویل سے طویل افسانے کو بھی پڑھنے پر قاری کو مجبور کرتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں کبھی اپنے مطالعے اور آگہی کی نمائش نہیں کرتے، ان کے یہاں انسانی تجربے کی حقیقت کا ادراک اتنی آہستگی اور خاموشی کے ساتھ افسانہ بنتا ہے کہ کہیں علم نمائی کی دھندلی سی شکل بھی سامنے نہیں آنے پاتی۔ ان کا مقصد اپنے قاری کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ اس کو پہلے سے زیادہ حساس بنانا ہے اور اس کی گم ہوتی ہوئی تہذیب و انسانیت کو بحال کرنا ہے۔ انھیں وہ سب کچھ دکھانا ہے جو بالعموم نظر نہیں آتا۔ اسی لیے سیمیا، عطر کافور، طاؤس چمن کی مینا، گنجفہ اور 'ڈھول بن' کے قصے ہمارے سامنے ایک خواب کا سا منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں۔ آج انسان اپنے اجتماعی سفر میں جن تجربوں سے گزرتا ہوا موجودہ عہد کی وحشت ناک و بے راہ روی جیسی اجاڑ زندگی تک پہنچا ہے۔ نیر مسعود نے ان سب کا احاطہ کیا ہے۔ جب تک ان کی پوری کہانی یکسوئی کے ساتھ نہ پڑھی جائے اس وقت تک ان کے اشارے فہم و ادراک کی گرفت میں نہیں آتے۔

نیر مسعود کی پہلی کہانی 'نصرت' ہے۔ یہ کہانی اس لحاظ سے اہمیت کا درجہ رکھتی ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کی بیشتر خصوصیات اس میں موجود ہیں۔ یہ کہانی رسالہ 'شب خون' 1971 میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ ایک بیانیہ انداز سے شروع ہو کر ڈرامائی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کہانی کی جب شروعات ہوتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیدھا سادہ قصہ بیان کیا جا رہا ہے مگر جب کہانی اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو ذہنی کشمکش و جذباتی کیفیت کی طرف مائل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نیر مسعود نے اس کہانی میں راوی اور نصرت کے درمیان محبت کا اظہار بڑے ہی محتاط انداز میں کیا ہے۔

نیر مسعود نے نصرت کے انداز گفتگو، عادات واطوار، تہذیب و شائستگی کے حوالے سے اس وقت کے معاشرے کی بھرپور نمائندگی کی ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں متضاد صورت حال کو یکجا کر دیا ہے، جس سے کسی بھی تصویر کا کوئی ایک نقش ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ جیسے نصرت کی سبک خرامی کے ساتھ بہار کے موسم کا ذکر، نیک لوگوں کے ساتھ بدکار عورت کا ذکر وغیرہ، یہ وہ متضاد چیزیں ہیں جو نیر مسعود کے افسانوں میں اکثر نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے پیرایۂ اظہار میں بھی انوکھے پن کا ثبوت دیا ہے۔ موت کی صراحت کے بجائے اس کی تصویر کے ذریعے موت کی فضا پیدا کر دی ہے، جس سے واضح طور پر معلوم نہیں

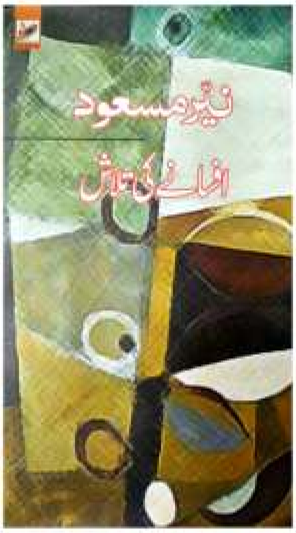

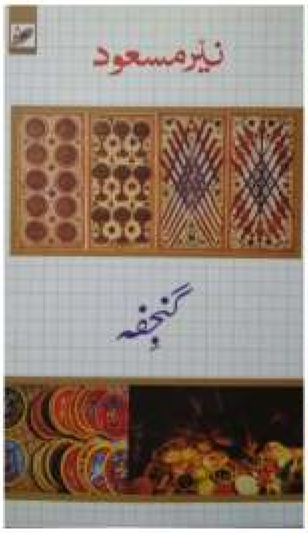

ہوتا کہ وہ مرگئی ہے۔ لیکن راوی جب نصرت کو مرا ہوا پاتا ہے تو چھوڑ کر فرار کا راستہ اختیار کرتا ہے، جب کہ وہ نصرت سے بے پناہ محبت بھی کرتا ہے۔ یہاں نیر مسعود قاری کے ذہن کو الجھا دیتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری پر جب غور کرتے ہیں تو ان کے فنکارانہ اور محتاط رویے کا نقش ابھرتا ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے حوالے سے بہت احتیاط سے کام لیا ہے، کیونکہ ان کا ایک ہی کردار کئی افسانوں میں ملتا ہے۔ افسانہ 'نصرت' کا بھاگا ہوا کردار ان کے ایک شاہکار افسانے 'مار گیر' میں پایا جاتا ہے جو رسالہ 'شب خون' اکتوبر 1978 میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ یہ سیمیا میں شامل تیسرا افسانہ ہے۔ اس افسانے کی شروعات بھی واحد متکلم سے ہوتی ہے۔ جب ہم افسانہ 'مار گیر' میں شکار کی نوعیت اور مار گیر کے علاج کی مختلف تفصیلات کو پڑھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسے جملے سے سابقہ پڑتا ہے، جس سے ہمیں 'نصرت' کا کردار یاد آنے لگتا ہے، جیسے راوی ایک جگہ کہتا ہے 'میں ایک مری ہوئی لڑکی سے بھاگ رہا تھا' اور وہ اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ وہ واقعی مری ہوئی تھی یا اسے مری ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا اور اس لڑکی سے بھاگتا ہوا ایسے جنگل کی طرف نکل پڑتا ہے، جہاں مار گیر سے ملاقات ہوتی ہے۔ مار گیر اسی جنگل میں سانپوں کی تلاش اور جڑی بوٹی کی کھوج میں دن گزارتا ہے اور گھر بیٹھے مار گزیدوں کا اپنی جڑی بوٹی سے علاج کرتا ہے اور راوی اس بستی کے لوگوں کا مسیحا ہے۔ اس کہانی میں ہمیں ایک جگہ اس وقت دھچکا لگتا ہے جب راوی کو سانپ ڈس لیتا ہے تو مار گیر اس کا علاج کرتا ہے اور کہتا ہے ''تمہارے زخم کا نشان باقی نہیں، اب تمھیں یاد نہیں رہے گا'' تو راوی کہتا ہے۔ ''مجھے یاد رہے گا''۔ تو پھر مار گیر کہتا ہے ''یہ پرانے لفظ ہیں انھیں میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔'' اس جملے سے ہمارے ذہن میں 'نصرت' والا راوی یاد آتا ہے جو اس میں مار گیر کے روپ میں موجود ہے۔ دوسری جگہ وہ مار گیر جو سانپوں کے زہر کا علاج کرتا ہے، وہ خود کہتا ہے ''مجھے سب سے زیادہ خوف زہر مہرہ سے ہوتا ہے۔'' کہانی کے آخر میں ایک اور اہم موڑ آتا ہے جب مار گیر کو سانپ کاٹ لیتا ہے۔ مگر وہ خود اپنا علاج نہیں کر پاتا اور مر جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیر مسعود نے اپنی کہانیوں میں ہی بھول بھلیاں سی کیفیت ظاہر نہیں کی ہے بلکہ کردار کے حوالے سے بھی قاری کو التباس میں ڈالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے افسانے کے اختتام میں مار گیر کی بھی وہی حالت دکھائی ہے جو بقیہ افسانوں کے مرکزی کرداروں کی دکھائی ہے۔ یعنی اس کی موت، جس کی وجہ سے کہانی ایک المیے کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نیر مسعود کا ایک افسانہ 'بائی کے ماتم دار' ہے جو ان کے افسانوی مجموعے 'طاؤس چمن کی مینا' میں شامل ہے۔ یہ افسانہ دو حصوں پر مشتمل ہے لیکن انھوں نے اپنے زور بیان سے دونوں حصوں کو ایک کر دیا ہے۔ افسانہ ایک دلہن کی موت سے شروع ہوتا ہے اور ایک بوڑھی عورت 'بائی' کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ دونوں کی موت کی وجہ بالکل مختلف ہے مگر دونوں کے واقعات میں ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس افسانے کا بنیادی خیال انسانی خواہشوں کی تکمیل اور اس تکمیل کے لیے کی جانے والی جائز و ناجائز کوشش ہے۔ اس افسانے میں نیر مسعود نے فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ افسانے کے آخری پیراگراف میں کچھ پرانے خیالات کے لوگ جن میں سماجی اقدار، تہذیب و تمدن موجود ہے، اسے نیر مسعود نے 'بائی' کے شوہر کے روپ میں دکھایا ہے۔ 'وہ صاحب' اپنی بیوی کی موت کے بعد جب گھر چھوڑ کر جاتا ہے تو دروازہ بند کر کے ایک پیتل کا بڑا سا تالا لگاتا ہے اور کنجی ایک بزرگ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ 'صاحب' کا گھر چھوڑ کر جانا مٹتے ہوئے تہذیب و تمدن اور بزرگ کے ہاتھ میں کنجی دینا اپنے تہذیب و تمدن کو بچانے کی آخری کوشش کی علامت ہے۔ کیوں کہ آج سائنس کی بڑھتی ہوئی روشنی نئی نسل کو اپنی گرفت میں لے کر پرانی قدروں کو مسمار کر چکی ہے۔ نتیجتاً لوگ اپنے تہذیب و تمدن کو بھول چکے ہیں اور ان کے اندر حرص و لالچ اپنا آشیانہ بنا چکی ہے۔ اس بات کو نیر مسعود نے اپنے افسانے میں بالکل واضح طور پر دکھایا ہے۔ حالانکہ افسانے میں کردار کی اہمیت زیادہ نہیں ہے لیکن انھوں نے اپنے زور بیان سے افسانے کو شاہکار بنادیا ہے۔

نیر مسعود نے احساس فنا اور اشیا کی نا پانیداری کو اپنے افسانے کا بنیادی موضوع بنایا ہے. گہری رمزیت کے ساتھ پرکشش اور تہ دار اسلوب ان کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے. وہ عہد حاضر کے ایک ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہیں.

ان کا ایک اور افسانہ 'طاؤس چمن کی مینا' ہے جو اردو ادب میں منفرد شناخت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں نیر مسعود نے بڑی گہری بات کو بہت سادگی سے بیان کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار کالے خان ہے جو ایک نواب کے یہاں ملازم ہے۔ کالے خان کی ایک لڑکی ہے جو پہاڑی مینا کے لیے ضد کرتی ہے مگر کالے خان کی مالی حالت ایسی نہیں ہے جو مینا خرید سکے۔ اس لیے وہ نواب کی پہاڑی مینا کو کچھ دنوں کے لیے چرا لیتا ہے۔

اس افسانے میں لکھنوی تہذیب، نوابوں کے چونچلے اور گوروں کو خوش کرنے کے لیے کیے گئے خرچ، زبان کا سلیقہ و نزاکت سب کچھ دیکھنے کو ملتا ہے افسانے کے اختتام پر لکھنؤ میں دل نہ لگنے کا ذکر اور ایک مہینے کے اندر بنارس میں آرہنا، سنتاون کی لڑائی، سلطان عالم کا کلکتے میں قید ہونا وغیرہ میں اس وقت کے لکھنؤ کا زوال آمادہ ماحول اور تہذیب کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

نیر مسعود نے احساس فنا اور اشیا کی ناپائیداری کو اپنے افسانے کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ گہری رمزیت کے ساتھ پرکشش اور تہ دار اسلوب ان کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ عہد حاضر کے ایک ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ نیر مسعود نے مغربی افسانہ نگاروں سے بھی خوب استفادہ کیا ہے اور ان کی خصوصیات کو اپنے افسانوں میں سمونے کی حتی الامکان کوشش بھی کی ہے۔ کافکا اور بورخیس کی جتنی خصوصیات ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں وہ ان کے ہمعصر افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتیں۔

■

Asfa Zainab
Research Scholar ,Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob:7739267865
E-mail:asfazainab0@gmail.com

تاریخ

محمد مجیب

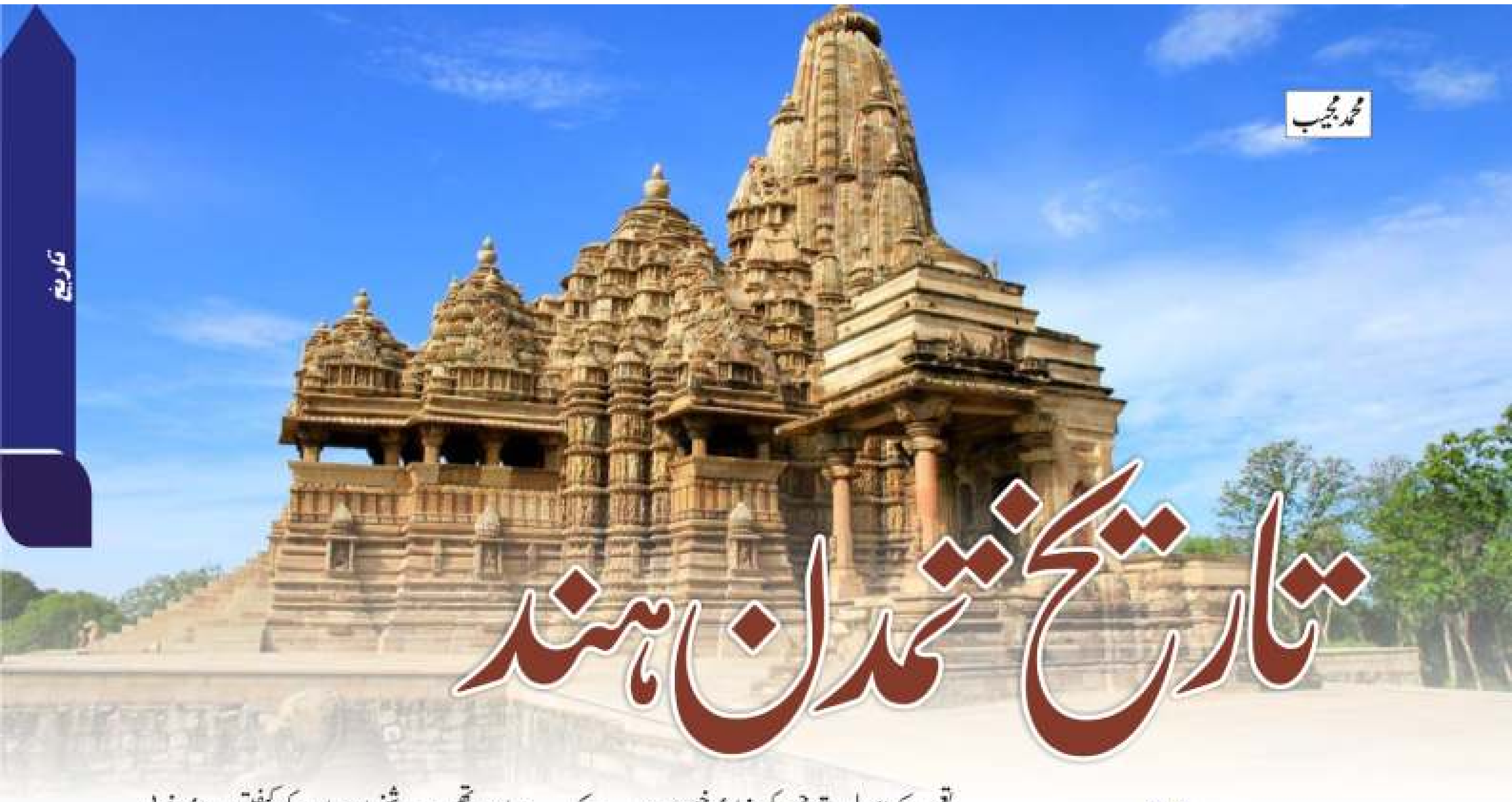

تاریخ تمدن ہند

فن تعمیر

آٹھویں صدی تک مندر کے نقشے اور اس کے لازمی اجزا کا تعین ہوگیا تھا۔ اس کے بعد تعمیری سرگرمی کا ایک دور شروع ہوا جس میں بیسیوں مندر، جو فن کے بہت اچھے نمونے کہے جاسکتے ہیں بنائے گئے۔ مندر کے نقشے کا مرکز ومن، وہ حصہ تھا جس میں بت رکھا جاتا اور وہ خاص کمرہ جس میں بت ہوتا گربھ گریہہ کہلاتا تھا۔ گربھ گریہہ کا دروازہ مشرق کی طرف ایک ہال میں کھلتا تھا جسے منڈپ کہتے تھے۔ پہلے ومن اور منڈپ الگ الگ رکھے جاتے تھے، پھر انھیں ایک پیش دالان (انترالا) کے ذریعے ملا دینے کا رواج ہوگیا۔ منڈپ کے داخلے کے دروازے کی طرف ایک برساتی بنائی جاتی (اور وہ منڈپ) اور دائیں بائیں بغلوں میں کمرے (مہا منڈپ) بنا کر منڈپ کو اور وسیع کردیا جاتا تھا۔ مندر کا ایک عام نقشہ بن جانے کا ایک سبب معماروں کی برادریاں تھیں، دوسرا سبب فن تعمیر کے اصول، جو 'وستوشاستروں' میں مرتب کر لیے گئے تھے۔ معماروں کی جماعتیں ملک کے ایک حصے سے دوسرے میں بلائی جاتی ہوں گی۔ اڑیسہ اور کھجوراہو کے مندروں کو تاریخی سلسلے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے بنانے والوں نے تجربے سے کس طرح سبق لیا اور ہر نیا کام پچھلے کام سے بہتر کیا۔ اس مشق کی پشت پر تعمیر کے اصول تھے جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مندر کا خوش نما ہونا ایک ضمنی بات ٹھہرائی گئی اور اس کے نقشے کا دینی اور فلسفیانہ پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برہمن علما فن تعمیر کو بھی اپنے قابو میں رکھنا چاہتے تھے۔ معمار وستوشاستر کو حفظ کرلیتے، کام کرتے وقت اس کی ہدایتوں کو دہراتے رہتے اور اس طرح ان کی ایک اصطلاحی زبان بن گئی جو پورے ہندوستان میں سمجھی جاتی تھی لیکن کسی فن یا صنعت کا مقررہ اصولوں کا اس صورت سے پابند ہوجانا جو برہمنوں کے پیش نظر تھی ہرگز مفید نہیں، کیونکہ ایسی پابندی انفرادی اپج کو بالکل زائل کردیتی ہے۔ ہندوستان کے معماروں نے "اپنے فن میں شاستروں کی مدد سے نہیں بلکہ ان کے باوجود جان ڈال دی۔"

باہر سے دیکھا جائے تو مندر کی عمارت بہت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں ہندوستانی معماروں نے عمارت کو ایک نامیہ سمجھا جو ہم شکل خلیوں سے مرکب ہو۔ کبھی پورا مندر اور اکثر ومن اپنی ہی شکل کے چھوٹے نمونوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس طرح رو کار اور آرائش اچھی نہ ہو تب بھی ناموزوں نہیں ہوسکتی۔ بعض آرائشی خیال بدھ متی عمارتوں سے لیے گئے، جیسے کہ چیتیا محراب۔ مندر کا گنبد استوپ کے گنبد کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ معماروں کے پیش نظر خطوط کا حسن نہیں بلکہ جسامت تھی، وہ روشنی اور سایے کی کیفیتیں بڑی خوبی سے پیدا کرتے تھے اور چٹانوں کو کاٹ کر غار بنانے کی روایتوں اور مشق کا نئے دور میں اثر یہ ہوا کہ معمار پتھر کی عمارتیں بناتے وقت بھی یہ سمجھتے رہے کہ وہ ایک بڑی بھاری چٹان کو تراش رہے ہیں، چنانچہ بعض مندروں کے اندر صرف وہ دھندلکا سا نہیں ہے جو عبادت کرنے

> اڑیسہ اور کھجوراہو کے مندروں کو تاریخی سلسلے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے بنانے والوں نے تجربے سے کس طرح سبق لیا اور ہر نیا کام پچھلے کام سے بہتر کیا۔ اس مشق کی پشت پر تعمیر کے اصول تھے جن کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مندر کا خوش نما ہونا ایک ضمنی بات ٹھہرائی گئی اور اس کے نقشے کا دینی اور فلسفیانہ پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔

والے کے دل کو متاثر کرتا ہے بلکہ انتہائی تاریکی ہے۔ ان چند باتوں کا خیال رکھا جائے تو مندر کی عمارت میں کوئی بھید نہیں رہتا۔ تعمیر کے قاعدے بہت سادہ تھے۔ معمار عمارت کے وزن کو تقسیم کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اس کا کوئی حل نہیں سوچا کہ بالائی حصے کے وزن سے جو 'پھینک' یا افقی دباؤ پیدا ہوتا ہے اسے کس طرح تعدیل کیا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پتھر کافی وزنی ہوا تو وہ اپنی جگہ پر رہے گا اور اگر چنائی میں پتھر ایک دوسرے سے پھنسا دیے گئے تو پوری عمارت قائم رہے گی۔ وہ بس اس کا اہتمام کرتے تھے کہ سارا دباؤ اوپر سے نیچے کی طرف ہو اور 'پھینک' پیدا ہی نہ ہونے پائے لیکن ان کی تدبیر ایسی عاجز بھی نہ تھی جیسا کہ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اڑیسہ کے مندروں میں پتھر کے ان شہتیروں کو جن سے لنٹلوں کا کام لیا گیا ہے اور مضبوط کرنے اور چھت کو قائم رکھنے کے لیے پہلے لوہے کے گارڈوں کا ایک ڈھانچہ سا بنایا گیا تھا۔ ان گارڈوں میں سے بعض 35 فٹ لمبے اور 7 انچ موٹے ہیں۔ مندروں کے ساتھ جو تالاب بنتے تھے ان کی تعریف حکیم البیرونی نے اس طرح کی کہ ''انھوں نے اس فن میں بڑا کمال پیدا کرلیا ہے اور ہمارے آدمی (یعنی مسلمان) جب انھیں دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ اس طرح کی کوئی چیز خود بنانا تو درکنار، وہ یہ بھی نہیں سمجھا سکتے کہ یہ تالاب کس طرح سے بنائے گئے ہیں۔''

بنیادی طور پر مندر کا نقشہ پورے ہندوستان میں ایک سا تھا، طرز کے اعتبار سے مندر دو قسموں میں تقسیم کیے جاتے ہیں، ایک شمالی یا ہندی آریائی دوسرا جنوبی یا دراوڑی۔ دراوڑی طرز کے نمونے صرف جنوبی ہندوستان میں، اور ہندی آریائی طرز کے شمالی ہند اور دکن میں بھی ملتے ہیں۔ یہ مقام کے لحاظ سے سات حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں، اڑیسہ، کھجوراہو، راجپوتانہ اور وسطی ہند، گجرات اور کاٹھیاواڑ، برندابن اور دکن۔ دکن کی تعمیرات پر اگلے باب میں تبصرہ کیا جائے گا، گوالیار اور برندابن کا کام بعد کا ہے اور زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتا۔ باقی چار قسموں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا چاہیے۔

اڑیسہ میں مندروں کی تعمیر کا سلسلہ آٹھویں صدی کے وسط سے شروع ہوا اور تیرہویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ بیشتر مندر بھونیشور میں بنے، ایک، جو جگن ناتھ کہلاتا ہے، پوری میں اور ایک سوریا (سورج) کا مندر کونارک میں ہے، جو پوری کے پچیس میل شمال مشرق میں ہے۔ بھونیشور کے مندروں میں مقام اور عمارت کے لحاظ سے سب سے ممتاز لنگ راجا ہے، جو ایک ہزار عیسوی کے قریب بنا ہوگا، یہ اونچی جگہ پر ہے، اور اس کے گرد اور بہت سے چھوٹے مندر اسی طرح بنے ہیں جیسے کہ بدھ متی ستوپوں کے گرد خانقاہوں اور چھوٹے ستوپوں کی بستی بس جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جس جگہ یہ تعمیر کیا گیا وہاں پہلے بدھ متیوں یا جینیوں کی عبادت گاہیں تھیں۔ غالباً پوری کا مشہور مندر جگن ناتھ بھی پہلے بدھ متی ستوپ تھا۔ کوہن کی رائے میں وہاں کا چوبی بت، جس کا بہت شاندار جلوس نکلتا ہے، کسی بدھ متی بت کو کاٹ چھانٹ کر بنایا گیا ہوگا۔ مندروں کا بہترین نمونہ کونارک کا سورج مندر ہوتا اگر اس کی تکمیل کی جاسکتی۔ اب صرف اس کا منڈپ (جو اڑیسہ کی اصطلاح میں جگ موہن کہلاتا ہے) اور ومن کی کرسی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے مجسمے ہیں جو مندر کے صحن میں ایک خاص ترتیب سے رکھے گئے ہیں۔ مورتوں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ غالباً مندر ایسے فرقے کے لوگوں نے بنوایا تھا جن کا مذہب

دراوڑی طرز کے نمونے صرف جنوبی ہندوستان میں، اور ہندی آریائی طرز کے شمالی ہند اور دکن میں بھی ملتے ہیں، یہ مقام کے لحاظ سے سات حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں، اڑیسہ، کھجوراہو، راجپوتانہ اور وسطی ہند، گجرات اور کاٹھیاواڑ، برندابن اور دکن، دکن کی تعمیرات پر اگلے باب میں تبصرہ کیا جائے گا، گوالیار اور برندابن کا کام بعد کاہے ا ور زیادہ نمایاں حیثیت نہیں رکھتا، باقی چار قسموں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا چاہیے۔

شہوانیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ آبادی سے دور بنایا گیا۔ اب اس کے گرد ایک ویرانہ ہے جسے سال میں ایک دن زائر اِدھر اُدھر سے آ کر آباد کر دیتے ہیں۔

کھجوراہو کے مندروں کی تعمیر کا زمانہ 950 عیسوی سے 1050 تک تھا، جب اس علاقے میں چندیل راجاؤں کی حکومت تھی۔ ان کو تعمیر کا بڑا شوق تھا اور مندروں کے علاوہ اس زمانے کے بنے ہوئے تالاب وغیرہ بھی ان کے شوق کی یادگار ہیں۔ کھجوراہو کے مندروں میں کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ ان کی خصوصیت ڈیزائن کی خوبی اور کام کی نفاست ہے۔ ہر عمارت کی کرسی اونچی ہے اور نقشہ ایسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عمارت فضا کی بلندیوں میں اٹھتی چلی جارہی ہے۔ شکھرا (گنبد) اپنی شکل کے چھوٹے شکھروں سے مرتب کیا گیا ہے، اس طرح کہ پہاڑوں کی چوٹیوں کی شباہت پیدا ہوجاتی ہے۔ اڑیسہ کے مندروں میں عمارت کے اندر روشنی پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا بس کہیں کہیں چوکور کھڑکیاں ہیں جن میں جالی کے بجائے مجسمے ہیں، اور ان میں سے بہت کم روشنی گزر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کھجوراہو کے بیشتر مندروں میں ایسے در رکھے گئے ہیں جن سے کافی روشنی عمارت کے اندر جاسکتی ہے اور کھلی سطح عمارت کے نقشے میں بڑا تنوع پیدا کردیتی ہے۔ اڑیسہ کے مندروں میں باہر بھرپور آرائش ہے، اندر انتہائی سادگی، کھجوراہو میں عمارت کے اندرونی حصوں کو بھی نیم مجسموں اور گہری منبت کاری سے آراستہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ ستون اور لنٹل جن پر چھت کا بوجھ ڈالا گیا ہے عمارت کے حسن کو دوبالا کردیتے ہیں۔ مندروں میں سب سے خوبصورت کانڈریا مہادیو اور ایک جینی عبادت گاہ ہے جو گھنٹئی مندر کہلاتی ہے۔ کونارک کی طرح کھجوراہو کے مندروں کو جن میں شیومتی، وشنومتی، جینی سبھی ہیں، ایسے لوگوں نے بنوایا ہوگا جن کی عبادت کا مرکز شہوانی رسمیں تھیں۔ اسی وجہ سے ان میں بھی اب نہ بت ہیں نہ پجاری اور ان کو آبادی اور انسان کی ہوا تک نہیں لگتی۔

وسطی مغربی ہند، راجپوتانہ اور گجرات میں سیاسی انقلابوں کی وجہ سے بہت کم مندر سلامت رہ سکے ہیں، لیکن ساگر، اران، جیراسپور، اوسیہ (جودھپور کے 33 میل شمال مغرب میں) اور دو ایک جگہ منتشر طور پر ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے یہاں کے فن اور خاص

محاوروں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اودے پور، ریاست گوالیار، میں گیارہویں صدی کا بنا ہوا۔ اودیشور مندر چھوٹا مگر نہایت خوبصورت ہے۔

شمالی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مندر بیشتر گیارہویں بارہویں اور تیرہویں صدی کے ہیں، جب یہاں سولنکی خاندان کی حکومت تھی۔ مندروں کے علاوہ چند دروازے اور مینار، تالاب اور باؤلیاں تعمیر کرائی گئیں۔ ان تعمیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا اس کا ایک حصہ حکومت دیتی تھی، باقی رعایا سے اس کی رضامندی کے ساتھ محاصل اور چندوں کے ذریعے وصول کیا جاتا۔ اس طرح تعمیر کے منصوبے جماعتی اور اعلیٰ تہذیبی حیثیت رکھتے تھے۔ گجرات کی آبادی اس زمانے میں بہت مالدار تھی، عمارتوں میں بہت اچھا پتھر لگایا اور ان کی تہذیب کا کام دل کھول کر کرایا جاسکتا تھا۔ موڈھرا (ریاست بڑودہ) کا سورج مندر تخیل کی اس بلند آہنگی

> شمالی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مندر بیشتر گیارہویں بارہویں اور تیرہویں صدی کے ہیں، جب یہاں سولنکی خاندان کی حکومت تھی۔ مندروں کے علاوہ چند دروازے اور مینار، تالاب اور باؤلیاں تعمیر کرائی گئیں۔

کی مثال ہے جو وسائل کی فراوانی پیدا کرسکتی ہے لیکن گجرات میں عام طور پر عمارتوں کی آرائش میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ اس کا طبیعت پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے جیسا کہ مٹھاس کی زیادتی کا۔ واڈنگر اور دابھوئی کے دروازے فن تعمیر اور منبت کاری کے انوکھے نمونے ہیں۔

جینیوں کی تعمیرات میں چتوڑ کا مینار، جو بارہویں صدی میں تعمیر کرایا گیا اور کوہ آبو کے مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مینار قریب 80 فٹ اونچا ہے اور آٹھ منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا حسن ایک ثبوت ہے کہ ہندوستانی معمار ایسی تعمیرات میں بھی جن کے الگ قاعدے اور نمونے نہ تھے اپنے فن کا کمال دکھا سکتے تھے۔ کوہ آبو کے مندروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پورے سنگ مرمر کے ہیں، باہر سے بالکل سادے ہیں اور اندر ان کی پوری سطح پر بڑی دیدہ ریزی سے منبت کاری کی گئی ہے مگر اس منبت کاری میں فن کے سچے نمونوں کی سی جان نہیں ہے، نظر اسے دیکھ کر اتنی خوش نہیں ہوتی جتنی کہ حیران ہوتی ہے۔

شمالی ہندوستان کے طرز سے بالکل الگ کشمیر کا طرز تھا۔ یہاں بھی تعمیر کا کام بدھ متی ستوپوں اور انقاہوں سے شروع ہوا، لیکن بہترین عمارتیں آٹھویں اور نویں صدی میں للت آدتیہ اور آونتی ورمن کے عہدوں میں بنیں، اب وہ بیشتر کھنڈر ہیں، مگر ان کے آثار سے بھی ان کے نقشے اور ان کے معماروں کے منصوبے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ ان کی امتیازی صفت یہ ہے کہ وہ فن تعمیر کے نمونے ہیں، سنگ تراشی کے نہیں یعنی ان کے معماروں کے ذہن پر یہ خیال حاوی نہ تھا کہ عمارت پتھر کی چٹان کو کاٹ کر بنائی جاتی ہے، بلکہ انھوں نے یہ سوچا کہ پتھر کے ٹکڑوں کو تراش اور چن کر کسی طرح عمارت کی شکل بنائیں۔ ان کا نقشہ صحیح نقشہ تھا اور انھوں نے اپنے مسالے سے وہی کام لیا جس کے لیے وہ موزوں تھا۔ کشمیر کی عمارتوں میں پتھر کے جو ٹکڑے لگائے گئے وہ بہت بڑے تھے، بعض کا وزن 64 ٹن ہوگا اور یہ بہت تعجب کی بات ہے کہ اتنے وزنی پتھروں کو اتنا صاف تراشا گیا اور ان کی ایسی چنائی کی گئی کہ اس میں کوئی ناہمواری نظر نہیں آتی۔ کشمیر میں چنائی کے لیے چونا بھی استعمال کیا گیا، جس کا ہندوستان میں اس وقت رواج نہیں ہوا تھا۔ روم اور مغربی ایشیا میں البتہ اس کا رواج عام ہوگیا تھا اور غالباً کشمیریوں نے چونا اس وجہ سے استعمال کیا کہ ان کے مغربی ممالک سے تعلقات تھے۔ مارتانڈ اور دوسرے مندروں کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معماروں پر یونانی اور رومی تعمیری طرز کا بہت اثر تھا۔

سنگ تراشی

گپت عہد میں جس معیار کا کام ہوا تھا اس کے بعد ایک طرح کی تکان لازمی تھی۔ ساتویں صدی کی سنگ تراشی دیکھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا بہار کا زمانہ ختم ہوگیا ہے، بس آخری پھول نکل رہے تھے، جن میں اور سب کچھ ہے مگر شادابی نہیں۔ سنگ تراشوں کے دل امنگوں سے خالی معلوم ہوتے ہیں۔ سارناتھ کے صناع، جو سب سے زیادہ مصروف رہے تھے، کوئی نئی چیز نہیں بناتے، ان کا تخلیقی ذوق نئی راہیں تلاش نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی تک یہ تھکن دور ہوگئی، صناعوں کا تخیل پھر جاگ اٹھا مگر کسی اور نئے کام کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ نیا دور قرون وسطیٰ کہلاتا ہے۔

اس وقت بدھ مذہب زوال پر تھا اور نئے کام میں بدھ متی دل سے شریک نہیں ہوئے۔ ساتویں سے نویں صدی تک جو بدھ متی مورتیں بنیں ان میں بتوں کی صفت تھی، یعنی وہ علامات کے مجموعے تھیں جنھیں معلوم قدرتی شکلوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فاہیان کے زمانے میں بھی ایک دیوی پرنگیا، پارمتا (عقل کامل) اور مختلف بودھی ستوون کی، جن میں مائتریا، منجوسری اور اَولوکت ایشور سب سے ممتاز تھے، پوجا کی جانے لگی تھی۔ آٹھویں اور نویں صدی میں نسوانی بودھی ستووں کا خاص چرچا تھا۔ اَولوکت ایشور کی بیوی تارا کی بہت سی مورتیں ملی ہیں جو انھیں دو صدیوں میں بنی تھیں، اور ان میں سے بعض بہت خوبصورت ہیں۔ ایک دیوی ماریچی کی بھی اس زمانے میں پوجا کی جاتی تھی۔ اس کے تین چہرے ہیں، جن میں سے ایک سور کی تھوتنی تھی اور آٹھ

ہاتھ بنائے جاتے۔ بودھی ستوؤں اور دوسرے دیوتاؤں اور دیویوں کی بھی مورتیں بنتی تھیں جن کے کئی سر اور ہاتھ پاؤں ہوتے تھے۔ اس روش میں بدھ متیوں نے برہمنوں کی نقل کی، مگر ان کے اصل عقیدے، اور ان کے مذہب کا رنگ اور رجحان ایسے تصورات کے خلاف تھا اور وہ اس نئی وضع کو نباہ نہ سکے۔ ان کا روایتی نصب العین کامل سکون تھا، برہمنی علامتیں دوامی حرکت اور مافوق الفطری قوت ظاہر کرتی تھیں، اور ان دونوں کو ایک ہی مورت میں دکھانا ممکن نہ تھا۔ بنگال کے پال راجاؤں نے بدھ مذہب کی سرپرستی کی، خاص خاص مرکزوں میں پتھر اور دھاتوں کی مورتیں بنانے کا کام بہت ہوا، مگر اس میں تازگی نہ اپج نہ وہ شدت اور خلوص جو گپت عہد اور اس سے پہلے کی سنگ تراشی اور منبت کاری کو اجاگر کرتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں مورت سازی اور منبت کاری کا بیشتر کام مندروں کی تعمیر کے سلسلے میں ہوا ضمنی یا آرائشی طور پر نہیں بلکہ اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے کہ عمارت کی پوری سطح پگھل کر مورتیں اور بیلیں اور روشنی اور سایے کی بساط بن گئی ہے لیکن عمارت کی مجسم اور نیم مجسم مورتوں اور دوسری منبت کی ہوئی شکلوں کا ربط بڑھنے کے بجائے اور گھٹ گیا۔ بھارہت اور سانچی میں منبت کاری کے ذریعے داستانیں بیان کرنے کی کوشش کی گئی، گپت عہد میں مذہبی داستانوں کے خاص خاص منظر دکھائے گئے۔ قرونِ وسطیٰ میں مورتوں کی حیثیت انفرادی ہوگئی، یہاں تک کہ ہر مجسم اور نیم مجسم مورت ایک الگ موضوع بن گئی۔ قرونِ وسطیٰ کے سنگ تراش بہت اچھا جمالیاتی ذوق رکھتے تھے، مگر ان کے تصور میں وہ پاکیزگی اور صفائی نہیں پائی جاتی جو گپت عہد کی مورتوں کو جنس کی تفریق اور مادہ اور روح کی تقسیم سے بالاتر کر کے خالص جمال کا مظہر بنا دیتی ہے۔ اس کو روحانی بلندیوں پر پہنچنا نصیب نہ ہوا۔ وہ تصورات کو بیان کرنے میں بڑا کمال رکھتے تھے، انھیں اپنی فنی مہارت پر بھروسا تھا، ان کا ہاتھ کبھی خطا نہ کرتا، مگر ان کے فن اور عقیدے میں کامل ہم آہنگی نہ تھی، ان کے دل بے چین سے معلوم ہوتے ہیں، گویا کام کی تکمیل سے انھیں کوئی تسکین نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے وہ ہاتھ کی صفائی کے خیال کے بجائے کام کی خوبی پر زیادہ توجہ کرنے لگے۔ گیارہویں صدی تک مورت سازی تصورات سے قریب قریب خالی ہوگئی، ضمنی باتیں موضوع پر حاوی ہوگئیں۔ اصل چیز تفصیلات میں چھپ گئی۔

گپت عہد کے معیار کا اثر سب سے زیادہ اور دیر تک بنگال اور بہار کے کام پر رہا۔ مجموعی طور پر قرونِ وسطیٰ کے کام کی یہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ سنگ تراش جو کچھ بناتے وہ اپنی طبیعت سے نہیں بلکہ نمونوں اور قاعدوں کو ذہن میں رکھ کر۔ ان کے کام میں آمد کے ساتھ ایک بہت بڑا عنصر آورد کا تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ انھوں نے نئے تصورات اور احساسات کو بھی نئے انداز میں نہیں، بلکہ پرانے طریقے پر بیان کیا ہے، اپنی شخصیت ایسی باتوں میں ظاہر کی جو بالکل ضمنی تھیں، ترتیب میں، آرائش میں، تفصیلی نکات میں۔ یہ خصوصیت بنگال اور بہار کی سنگ تراشی میں بہت نمایاں ہے۔ فنی مہارت کے لحاظ سے یہاں کے کام میں کوئی عیب نہیں، لیکن بہترین نمونے بھی اس کا ثبوت ہیں کہ یہاں کے صناع گپت عہد کے اندوختے پر گزر کر رہے ہیں، اپنی طرف سے انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا اور آخر کار فنی باریکیوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اڑیسہ کے ابتدائی کام میں گپت عہد کے محاوروں اور کسی قدر دکن کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے، مگر یہ اثر بہت جلد اڑیسہ کے خاص طرز میں محو ہوگیا، جس کا اپنا الگ معیار تھا۔ اس معیار کے مطابق حسن کے معنی تھے نرمی، فراوانی، حرکت کے معنی تھے رقص اور ایسا رقص کہ جس میں انسانی ذبات اعضا کی ساخت سے مجبور نہ تھے۔ پرس رام ایشور مندر کے دو روشن دانوں میں منبت کی ہوئی مورتیں، دتیل دیول میں مہیش مردنی کی مورت،

بنگال کے پال راجاؤں نے بدھ مذہب کی سرپرستی کی، خاص خاص مرکزوں میں پتھر اور دھاتوں کی مورتیں بنانے کا کام بہت ہوا، مگر اس میں تازگی نہ اپج نہ وہ شدت اور خلوص جو گپت عہد اور اس سے پہلے کی سنگ تراشی اور منبت کاری کو اجاگر کرتا ہے۔

کونارک کے ہاتھی اور گھوڑے مثالی نمونے ہیں۔ اس پیمانے پر سنگ تراشی کا کام کیا جائے جیسے کہ اڑیسہ کے مندروں میں تو ایک معیار قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، لیکن یہاں اچھے اور معمولی نمونوں میں بھی بڑی اپج ہے اور تیرہویں صدی کی بعض مورتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اڑیسہ کے سنگ تراش فنی روایات کو چھوڑ کر عوام کے تصورات جو طبعی میلانات کی طرف جھک رہے تھے۔ اڑیسہ کے مقابلے میں کھجوراہو کے کام میں نفاست بہت زیادہ ہے۔ یہاں کے صناعوں نے جسم کو ایک نگینہ سمجھا جس کی قیمت تراشنے اور جلا دینے سے بڑھتی ہے، انھوں نے ایک خاص اعصابی کیفیت دکھائی ہے جو شاید ان کی اپنی کیفیت بھی تھی، جس کی وجہ سے بدن تن گئے ہیں، پٹھے ابھر آئے ہیں۔ انھوں نے جو چہرے بنائے ہیں وہ جہاں دیدہ لوگوں کے ہیں، جن کی ہلکی سی مسکراہٹ میں کچھ گھمنڈ ہے، کچھ سیری ہے، جیسے کوئی عیاش جو جانتا ہو کہ عیاشی میں کچھ دھرا نہیں ہے، بھولے بھالے آدمی کو دیکھ کر مسکراتا ہے لیکن ان لوگوں کی نظر دنیا ہی پر ہے، ان کے جذبات کی قوت ان کے جسموں کے اندر ہی گرفتار ہے، وہ نکلنا چاہتی ہے اور نکل نہیں سکتی، اس لیے کہ سرور بن گئی ہے جو ان کی نیم باز آنکھوں سے شعاعوں کی طرح نکلتا ہے، ایک ابھار جس نے بدن میں غضب کی شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ شاید یہ کیفیت ان لوگوں کے عقیدوں نے پیدا کی تھی جنھوں نے کھجوراہو کے مندر بنوائے اور جن کا مسلک تھا کہ گناہوں کے ذریعے ثواب، نفسانی لذت کے ذریعے روحانی سکون حاصل کریں۔ ممکن ہے یہ اس زمانے کی تہذیب کا پرتو ہو جو پکے پھل کی طرح شاخ سے ٹپکنے والی تھی۔

کھجوراہو سے ہم وسطی ہند، گجرات اور راجپوتانہ کی طرف جائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہی اعصابی کیفیت جو کھجوراہو میں نمایاں ہے اور سخت ہوتی جاتی ہے۔ جسم پوری کھنچی ہوئی کمانیں ہیں، اقلیدسی شکلیں ہیں، مورتوں کے مجموعے اعضا کی نفیس اور نازک جالیاں۔ جنوبی راجپوتانہ اور گجرات میں سنگ مرمر افراط سے تھا، اور اس نے فن کی باریکیاں دکھانے کا اور بھی موقع دیا، شکلوں کا اعصابی تناؤ بڑھتا گیا اور اسی کے ساتھ وہ بے جان ہوتی گئیں۔

■

ماخذ: تاریخ تمدن ہند، **مصنف:** محمد مجیب، **تیسرا ایڈیشن:** 1999، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

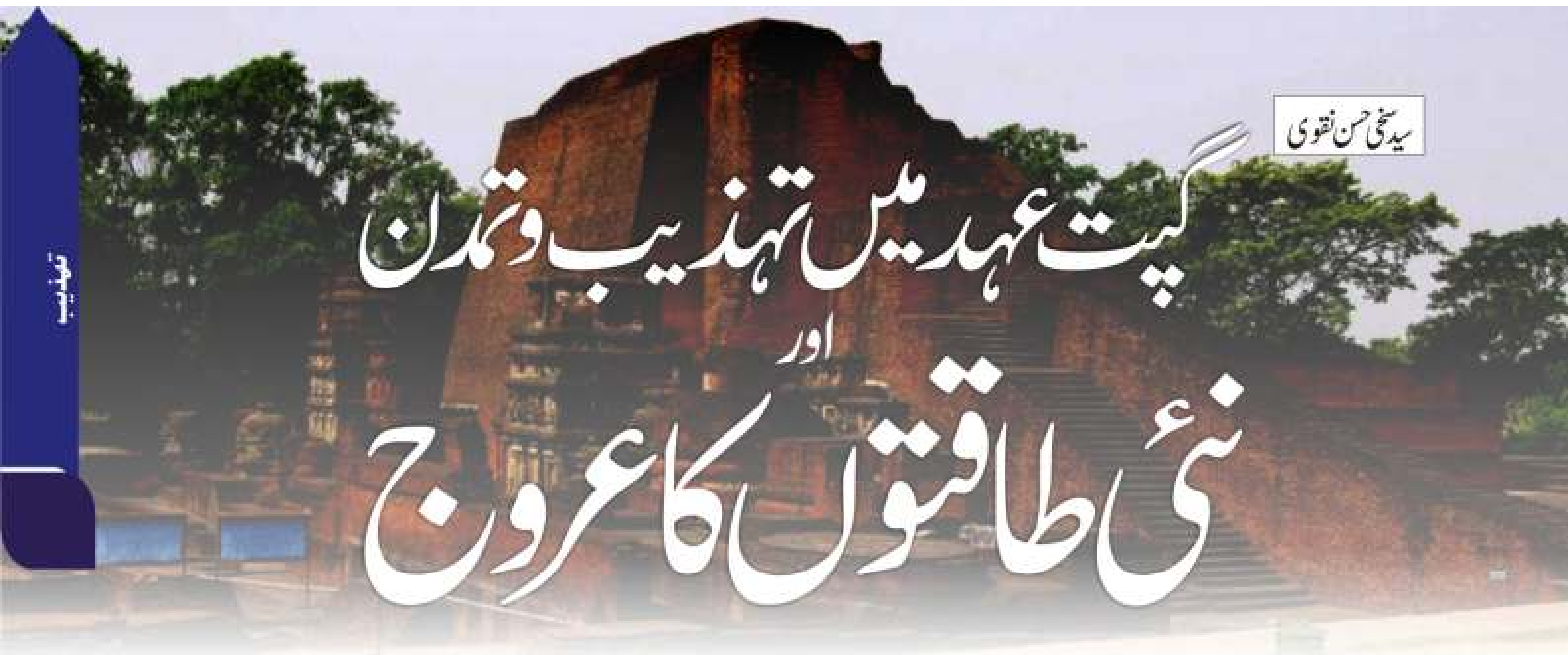

سید سخی حسن نقوی

گپت عہد میں تہذیب و تمدن اور نئی طاقتوں کا عروج

عظیم الشان عہد: گپت شہنشاہوں کے دور حکومت کو اکثر ہندو تاریخ کے عہد زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں کئی بڑے قابل، ذہین اور طاقتور حکمرانوں کا دور حکومت شامل ہے جنھوں نے شمالی ہند کے ایک بڑے حصے کو ایک سیاسی چھتری کے نیچے لاکر متحد و مستحکم کردیا اور باقاعدہ حکومت اور ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ان کی حکومت میں اندرونی تجارت کو بھی فروغ ہوا اور غیر ملکی تجارت کو بھی اور ملک میں دولت کی فراوانی ہوگئی۔ اس اندرونی سکون و اطمینان اور خوشحالی و فارغ البالی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب، ادب اور علم و فن کی ترقی کے لیے نئی شاہراہیں کھل گئیں۔

مذہب، برہمن مذہب: اس عہد میں برہمن مذہب کا زور کافی بڑھ گیا۔ اس کی وجہ ایک بڑی حد تک تو یہ ہوئی کہ گپت راجاؤں نے جو برہمن مذہب کے پیرو تھے اور وشنو سے عقیدت رکھتے تھے، برہمن مذہب کی سرپرستی کی لیکن خود برہمن مذہب میں جو حیرت انگیز لچک اور اثر پذیری کی داخلی صلاحیت موجود تھی اسے بھی اس کی کامیابی میں بڑا دخل تھا۔ برہمن مذہب نے ان تمام عقائد، رسوم اور قدیم دیسی توہمات پر جنھیں عام مقبولیت حاصل تھی اپنی چھاپ لگا کر عوام کو اپنی طرف جیت لیا۔ اس کے علاوہ غیر ملکی حملہ آوروں کو جو ذات پات سے بے نیاز تھے۔ اس نے اپنے وسیع دامن میں پناہ دی جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوگیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیش بندی کے طور پر اپنے مدمقابل یعنی بدھ مذہب کی بعض لطیف تعلیمات کو اپنے اندر سمو کر اور بدھا کو اپنے دس اوتاروں میں شامل کرکے اس نے بدھ مذہب کے منصوبوں کو مکمل شکست دے دی۔

چنانچہ جب یہ تمام نئی باتیں اس میں داخل ہوگئیں تو برہمن مذہب نے وہ صورت اختیار کرلی جسے آج ہندو دھرم کہتے ہیں۔ مختلف و متنوع دیوتاؤں کی پرستش اب اس کا شعار ہوگیا۔ جن میں وشنو، جسے چکر بھرت بھی کہا جاتا ہے، گدادھر، جناردن، نارائن، واسودیو، گووند خاص طور پر نمایاں تھے۔ دوسرے دیوتا جنھیں عام مقبولیت حاصل تھی وہ شیو، شمبھو، کارتکیہ اور سوریہ تھے۔ دیویوں میں لکشمی درگا یا بھگوتی اور پاروتی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ برہمن مذہب قربانیوں پر زور دیتا تھا۔ کتبوں میں ان قربانیوں کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً آشومیدھ، واج، پیہ، اگنیش ٹوم، آپ متریام، اتی راتر، پنچ مہایگیہ وغیرہ وغیرہ۔

بدھ مذہب

فاہیان جو ہر چیز کو بدھ مذہب کی عینک سے دیکھتا تھا اپنی سیاحت کے دوران کوئی علامت تنزل کی نہ دیکھ سکا، لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ گپت دور حکومت میں بدھ مذہب مدھیہ پردیش میں رو بہ زوال ہو چکا تھا۔ گپت حکمرانوں نے کسی قسم کے جبر و تشدد سے نہیں لیا۔ وہ ویشنو مت کے سچے پیروکار تھے لیکن انھوں نے اپنی میزان عدل کو متضاد عقائد کے مابین ہمیشہ متوازن رکھا۔ رعایا کو مکمل طور پر آزادی ضمیر حاصل تھی۔ چندر گپت کے بدھ سپہ سالار آمر کارود کی مثال تو خیر منفرد ہے لیکن اس طرح مملکت کے تمام اعلیٰ عہدوں کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ موضوع سے ذرا ہٹ کر، بدھ مذہب کے زوال کے اسباب کی بحث میں الجھنے کی بجائے اس مقام پر صرف اتنا کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مذہب کی فرقہ بندیوں اور بدھ سنگھ میں خرابیوں نے اس کی قوتِ حیات کو بالکل سلب کردیا تھا، اس کے علاوہ بدھا اور بودھی ستوؤں کی مورتی پوجا، بودھ دیوتاؤں کی مجموعی حیثیت سے پرستش کے رواج، مذہبی رسوم کی ادائیگی اور مذہبی جلوسوں نے بدھ مت کو اس کی دیرینہ لطافت و پاکیزگی سے اس قدر دور ہٹا دیا تھا کہ عام آدمی کے لیے اس میں اور ہندو مت میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس کے ہندو مت میں ضم ہونے کے لیے زمین خوب ہموار ہوگئی۔ آج اس مشابہت و مماثلت کی بہترین مثال نیپال میں پائی جاتی ہے جہاں بقول ڈاکٹر ونسٹ اسمتھ ''ہندو دھرم کا عفریت اپنے شکار یعنی بدھ مت کو آہستہ آہستہ ہڑپ کیے جارہا ہے۔''

جین دھرم: کتبوں سے جین مت کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن جین مت کچھ اس لیے کہ اس میں نظم و ضبط کی پابندیاں زیادہ تھیں اور کچھ اس لیے کہ شاہی سرپرستی اسے حاصل نہیں تھی، زیادہ نمایاں نہیں تھا۔ جین مت اور دوسرے مذہبوں میں اتفاق و اتحاد پایا جاتا تھا، کیونکہ ایک شخص ندر نامی جس نے پانچ مجسمے جین پتر تھنکروں کے نام منسوب کیے تھے۔ برہمنوں کے مذہبی پیشواؤں کی محبت کا بے پناہ جذبہ اپنے دل میں رکھتا تھا۔

مذہبی خیراتیں: نیک اور مخیّر لوگ دنیا اور عقبیٰ میں سکون و مسرت حاصل کرنے کی غرض سے بڑی فیاضی کے ساتھ برہمنوں کو رہائش کے لیے قیام گاہیں (ستر) دان کرتے اور سونے اور دیہی زمینوں (اگر ہار) کی نذریں گزارتے تھے۔ مورتیاں اور مندر تعمیر کرکے بھی لوگ اظہار عقیدت کرتے تھے۔ مندروں کے لیے وہ مستقل رقمیں جمع کردیتے تھے

(اکشیہ نی وی) جن کے سود سے مندر میں تمام سال روشنی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جیسے پوجا کا ضروری جز سمجھا جاتا تھا اسی طرح بدھ اور جین مذہب والے علی الترتیب بدھا اور تیرتھنکروں کی مورتیاں خیرات کے طور پر نصب کراتے تھے۔ بدھ مذہب کے لوگ بھکشوؤں کے رہنے کے لیے خانقاہیں (وہار) تیار کرتے تھے جہاں ان کے لیے کھانا اور کپڑا مفت فراہم کیا جاتا تھا۔

سنسکرت کا احیا: برہمن مت کی تجدید کے ساتھ ساتھ سنسکرت کا استعمال اور اثر بھی بہت تیزی سے بڑھا۔ اس احیا کی بالکل ابتدائی منزل کی ایک سند جونا گڑھ میں رودر دامن کے طویل چٹانی کتبہ میں ملتی ہے جس پر 72 (شک سمیت؟) مطابق 150 پڑا ہوا ہے لیکن اب اسے مستقل طور پر سرکاری زبان کی حیثیت سے لوحی دستاویزات اور مسکوکاتی شعبوں میں وقیع مقام دیا جانے لگا۔ پہلے پالی ذریعۂ اظہار تھی لیکن اب بدھ مصنفین بھی مثلاً وسوبندھو اور دگ ناگ سنسکرت کو پالی پر ترجیح دینے لگے۔

ادبی ارتقا: گپت عہد کا مقابلہ عام طور پر تاریخ یونان میں پیریکلیز کے عہد سے اور تاریخ انگلستان میں ملکہ ایلزبیتھ کے عہد سے کیا جاتا ہے۔ گپت دور حکومت اس جہت سے ممتاز تھا کہ اس میں بہت سے نامور علما وفضلا موجود تھے جن کی تخلیقات نے ہندوستانی ادب کی مختلف اصناف کو مالا مال کردیا۔ گپت حکمراں علم وفضل کی ہمت افزائی کرتے تھے اور خود بھی بہت تعلیم یافتہ تھے۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں الہ آباد کے ستونی کتبہ کی سند پر سمدر گپت کے شاعری اور موسیقی میں کمالات کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے علاوہ وہ آفاقی روایت جس میں 'نوہیروں' (نورتن) کو قصوں کہانیوں والے وکرمادتیہ سے ربط دیا گیا ہے، ظاہر کرتی ہے کہ چندر گپت دوم وکرمادتی کے دربار کے اس عظیم الشان ادبی حلقے نے عوام کے دل ودماغ پر کتنا گہرا اثر مرتب کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت بلا شبہ مشہور ومعروف شاعر وتمثیل نگار، کالیداس کی تھی جو غالباً مالوہ کا ساکن تھا۔ بدقسمتی سے اس کی تاریخ اب تک مشتبہ ہے، یہاں تک کہ بعض عالم اس پر بضد ہیں کہ وہ 57 ق م کی شخصیت ہے لیکن کافی مضبوط قرائن ہمارے پاس اس رائے کے حق میں موجود ہیں کہ کالیداس کا تعلق گپت عہد سے تھا، تیز یہ وہ چندر گپت دوم یا کمار گپت اول کا معاصر تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ چندر گپت دوم کی فتوحات کا ایک حوالہ گھونش میں رگھو کی 'دگ وجے' کی مبالغہ آمیز تفصیلات میں دستیاب ہوتا ہے۔ کالیداس کی ایک اور رزمیہ نظم کمار سمبھو ہے؛ رتو سنگھار اور میگھ دوت اس کی غنائی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔ اس کے ناٹکوں میں ہم مال وکاگنی متروکرم اروشی اور شکنتلا کے بارے میں جانتے ہیں۔ آخر الذکر تو اس درجہ دلکش ہے کہ اس نے دنیا بھر کے عظیم ترین ادبی نقادوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ گپت عہد میں اور بھی بہت سے پایہ کے شعرا موجود تھے لیکن کالیداس کی عظمت نے ان کے فن کو پھیکا کردیا، ہری شین اور ونس بھٹی، علی الترتیب سمدر گپت اور کمار گپت کے معاصر تھے۔ ان کی تخلیقات پتھر کی سلوں پر کندہ ہیں اور بدستور ہم تک پہنچ گئی ہیں۔ مدرا راکشش کا مصنف، وشاکھ دت، فرہنگ نویس، امر سنگھ جس نے امرکوش مرتب کی، مشہور ومعروف طبیب

دھن ونتری اور عظیم بدھ عالم جن کا ذکر ہم نے گذشتہ سطور میں کیا، سب اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ مزید برآں، برہمنوں نے اپنے ادب کو اپنے بے شمار عقیدت مندوں کے جذبات سے ہم آہنگ کرنے اور ان پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کی غرض سے اس پر اسی زمانے میں نظر ثانی کی۔ پرانوں کے جن میں گپت خاندان کا ذکر ہے، اسی عہد میں اصلاح وتصحیح کے بعد وہ شکل اختیار کی جو آج تک موجود ہے۔ اسی طرح منوسمرتی میں بھی ترمیم کی گئی جو تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں انھیں مذہباً جائز قرار دینے کے لیے دوسری سمرتیاں مثلاً یاگیہ ولکیہ سمرتی، بھاسیہ، یا سوتروں کی تفسیریں لکھی گئیں۔

ہیئت اور ریاضیات کے میدان میں بڑے جم کر کام ہوا اور آریہ بھٹ (ولادت 476)، ولاآہ مبر (587-505) اور برہم گپت (ولادت 598) نے سائنسی ادب کی مختلف اصناف میں حیرت انگیز اضافے کیے۔ معلوم ہوتا ہے وہ یونانی ہیئت سے بھی واقف تھے کیونکہ اپنی تصانیف میں انھوں نے بہت سی یونانی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔

تعلیم: اس عہد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے نتائج کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائج الوقت نظام تعلیم بہت عمدہ اور باقاعدہ تھا۔ بدقسمتی سے اس موضوع پر ہماری معلومات بہرحال مایوس کن حد تک ناکافی ہے۔ کتبوں سے معلوم ہوتا کہ استادوں کو اس وقت آچاریہ اور اپادھیائے کہا جاتا تھا، لیکن برہمن عالموں کے لیے بھٹ کا لقب بھی استعمال ہوتا تھا۔ برہمنوں کی امداد کے لیے جاگیر میں گاؤں دیے جاتے تھے اور مخیر لوگ اپنے عطیات سے بھی انھیں نوازتے تھے۔ برہمنوں کے تمام چیلے جوششیہ یا برہم چارن کہلاتے تھے۔ شاکھاؤں اور چرنوں یعنی ان ویدی مدرسوں میں جمع ہوجاتے تھے جو کسی مخصوص وید کے اصلاح شدہ نسخے کی تعلیم دیتے تھے۔ ان اصلاح شدہ نسخوں میں سے کتبوں میں میشرائے فیئے، تیتری لیے اور واجس نیئے اور بعض دوسرے نسخوں کا ذکر آتا ہے۔ رہا مضامین کا سوال تو ان کے بارے میں ہماری معلومات یہ ہے کہ اس وقت چودہ علوم (چترد ش ودیا) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یعنی چاروں وید، چھ ویدانگ، پران می مان سا، نیائے اور دھرم یا قانون۔ کتبوں میں شالاتری یہ (پانیتی) کی دیاکرن (اشٹ آدھیائی) اور شت ساہیری سن ہتا یعنی مہابھارت کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ یقین ہے کہ غیر مذہبی اور دنیاوی ادب کا جو ذخیرہ موجود تھا اس کی ضرور تعلیم دی جاتی تھی۔

زمانے کے روادارانہ مزاج کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بودھ علوم کے عظیم مرکز نالندہ کی بنیاد شکرادتیہ، غالباً کمار گپت اول نے رکھی، جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک خانقاہ وقف کی۔ اس کے بعد بدھ گپت تتھا گت گپت، بالادتیہ اور دوسرے گپت حکمرانوں نے مزید عطیات سے اسے نوازا۔ نالندہ میں نصاب تعلیم بہت جامع تھا اور کچھ بعد تو

اس کا مقام اتنا بلند ہو گیا کہ نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے سے بلکہ بیرونی ممالک سے سیکڑوں تشنگان علم اپنی علمی وروحانی پیاس بجھانے یہاں آتے تھے۔

گپت عہد کے سکے: سمدر گپت (یا چندر گپت اول؟) کے سب سے پرانے سونے کے سکے 118 سے 122 گرین تک وزن رکھتے ہیں، شکل وصورت اور وزن میں کشن راجاؤں کے سکوں سے بہت مشابہ ہیں، سکوں پر غیر ملکی اثر اس سے ثابت ہے کہ گپت عہد کے کتبوں میں کشن نام 'دینار' استعمال ہوا ہے جو لاطینی ڈینیریس سے مشتق ہے۔ بہر حال چندر گپت دوم نے جس کے سکوں کا وزن 124 سے 132 گرین تک تھا کشن (رومی) سکوں والے وزن میں تبدیلی کردی؛ اور بعد ازاں اسکند گپت نے اس وزن کو بالکل ترک کر دیا اور ہندوسوورن کا معیاری وزن (146 گرین) اختیار کر لیا۔ کشترپ علاقوں کی فتح کے بعد گپت راجاؤں نے شک معیار کے مطابق چاندی کے 32 گرین والے سکے بھی جاری کیے، بعد میں اسکند گپت نے ان کا وزن بڑھا کر کارشاپان کی برابر کر دیا، اس مقام پر یہ کہہ دینا بھی مناسب ہے کہ گپت راجاؤں کے تانبے کے سکے بہت کم یاب ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے جیسا کہ فاہیان نے بھی لکھا ہے کہ چھوٹے موٹے لین دین میں کوڑی بطور سکہ کے استعمال ہوتی تھی۔

فن تعمیر: گپت راجاؤں کے عہد حکومت میں فن تعمیر کو بہت فروغ ہوا، لیکن کئی سبب ایسے جمع ہو گئے جن کے باعث اس دور کے آثار باقیہ زیادہ تعداد میں موجود نہیں ہیں۔ گپت عہد کی بہت سی عمارتیں دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔ بعض کا ملبہ لوگوں کی تعمیری ضروریات میں کام آ گیا۔ باقی جو مسلم افواج کے راستے میں آ گئیں، وہ ان کے مذہبی جنون کا شکار ہو گئیں، اس لیے ہماری افواج کا دارومدار اس عہد کے چند باقیات الصالحات ہیں اور وہ بھی سب مذہبی عمارتیں ہیں، غیر مذہبی ان میں کوئی نہیں ہے۔ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ نے ایسے دو مندروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک جو دیوگڑھ (ضلع جھانسی) میں ہے اس کی دیواروں کی منبت کاری میں نقاشی کے خوبصورت نمونے موجود ہیں، دوسرا بھتر گاؤں (ضلع کانپور) میں ہے جو اینٹ اور مسالے سے بنی ہوئی مورتیوں کے لیے مشہور ہے۔ اس مقام پر اجنتا کے غاروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو گپت عہد کے فنی کارناموں کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں سے اکثر مختلف زمانوں میں ٹھوس پتھر سے تراشے گئے ہیں، لیکن بعض ایسے ہیں جو غالباً زیر نظر عہد میں زمین کھود کر بنائے گئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ گپت عہد کے انجینئروں کی فنی صلاحیتوں کی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں۔

مجسمہ سازی: سارناتھ اور دوسرے مقامات پر جو دریافتیں ہوئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ گپت عہد میں مجسمہ سازی کا فن معراج کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس عہد میں گندھارا فن کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہونے لگے اور اب جو مجسمے بدھا کے بنائے گئے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نورانی بالوں سے مزین ہیں، بدھا کو چست لباس پہنایا گیا ہے جس میں جلد بدن جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور بالوں کو خاص انداز سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سارناتھ میں جو بے شمار مجسمے گپت دور کے ملے ہیں ان میں سب سے زیادہ دیدہ زیب اور خوبصورت شاید وہ ہے جس میں بدھا کو وعظ دینے کے انداز میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ (دھرم چکر مدرا) اپنے آقا کی زندگی کے مختلف مناظر کے علاوہ ہندو دیومالا کے جو واقعات پیش کیے گئے ہیں ان میں غیر معمولی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر گپت عہد کے فنکاروں کی امتیازی شان یہ ہے کہ ان کا عمل حرکت وزندگی سے مملو، آورد کے عیب سے پاک، اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل ہے۔

مصوری: اجنتا (ریاست حیدر آباد) کے غار جن کے اندرونی حصے کو بہ افراط دیواری تصویروں سے آراستہ کیا گیا ہے، ظاہر کرتے ہیں کہ مصوری کے میدان میں بھی فنکاروں نے مہارت کا اعلیٰ معیار حاصل کر لیا تھا۔ ان غاروں کی تاریخ پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس طرح بعض غار یقیناً اس عہد سے بھی متعلق ہیں۔ ایک صاحب ذوق مبصر کی رائے میں ''اجنتا کی مصوری کمال فن کا بہترین نمونہ ہے، اس میں روایت پسندی ہے مگر وضع داری کے ساتھ۔ اس کے نقش ونگار میں تنوع ہے جن سے شگفتگی جھلکتی ہے؟ اور رنگ روپ اور شکل وصورت میں حسن ودلکشی اس قدر نمایاں ہے کہ اسے قدیم دنیا کے بہترین فن کے زمرے میں شامل کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔'' اجنتا کے مدرسۂ فن کا حلقۂ اثر آگے بڑھ کر ریاست گوالیار میں باغ کے غاروں تک پہنچ گیا۔ باغ کے غاروں کی تصویریں بھی اعلیٰ معیار رکھتی ہیں اور بے پناہ تنوع کی مظہر ہیں۔

دھات کا کام: گپت عہد کے کاریگر دھات کے کام میں بھی ماہر تھے۔ یہ بات بدھا کے تانبے سے بنے ہوئے کئی دیوپیکر مجسموں، نیز دلی کے قریب مہرولی کے آہنی ستون کی دریافت سے ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گپت عہد کے کاریگر خام دھاتوں کو صاف کرنے کے فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صدیوں تک دھوپ اور بارش کی زد میں رہنے کے باوجود ستون ابھی تک زنگ آلود نہیں ہوا ہے۔

حرکت و عمل کے اسباب: اب ہم گپت عہد کے تہذیب وتمدن پر تبصرہ ختم کر رہے ہیں اس لیے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ علمی اور فنی سرگرمیوں کا جو طوفان اٹھا تو اس کے آخر اسباب کیا تھے۔ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ کی رائے ہے کہ ''غیر ملکی تہذیبوں سے ربط وتعلق اس کا خاص سبب تھا'' اس حقیقت کو بلاشبہ بڑی آسانی سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور چین کے درمیان اور ہندوستان اور مغربی دنیا کے درمیان آمدورفت کا سلسلہ مستقل جاری رہا کیونکہ فاہیان جیسے عقیدت مند زائرین سرزمین بدھا کی زیارت کے لیے پے در پے آتے رہے اور اسی طرح ہندوستان نے بھی کمارجیو جیسے ممتاز دانشوروں کو بدھ مذہب کی تبلیغ کے لیے اس آسمانی بادشاہت میں بھیجا (383ء) مزید برآں گپت سلطنت کے حدود بڑھ کر جب سوراشٹر اور گجرات کے بندرگاہوں تک پہنچ گئے تو مغرب کے ساتھ ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کو فروغ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات کے بہاؤ کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کا رد عمل ہندوستانی دماغ پر بہت اہم ہوا، لیکن ان تمام ترقیوں کے لیے سب سے بڑا محرک وسیع النظر اور کشادہ دل گپت راجاؤں کی حکومت تھی، جس میں خوشحالی اور فارغ البال کا دور دورہ رہا۔ گپت راجاؤں نے جس والہانہ انداز میں علم وفن کی سرپرستی کی ایک بڑی حد تک اسی کی بدولت اتنے شاندار وکارآمد نتائج برآمد ہوئے۔

■

ماخذ: قدیم ہندوستان کی تاریخ، **مصنف**: رما شنکر ترپاٹھی، **مترجم**: سید تقی حسن نقوی، **چوتھی طباعت**: 2019، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

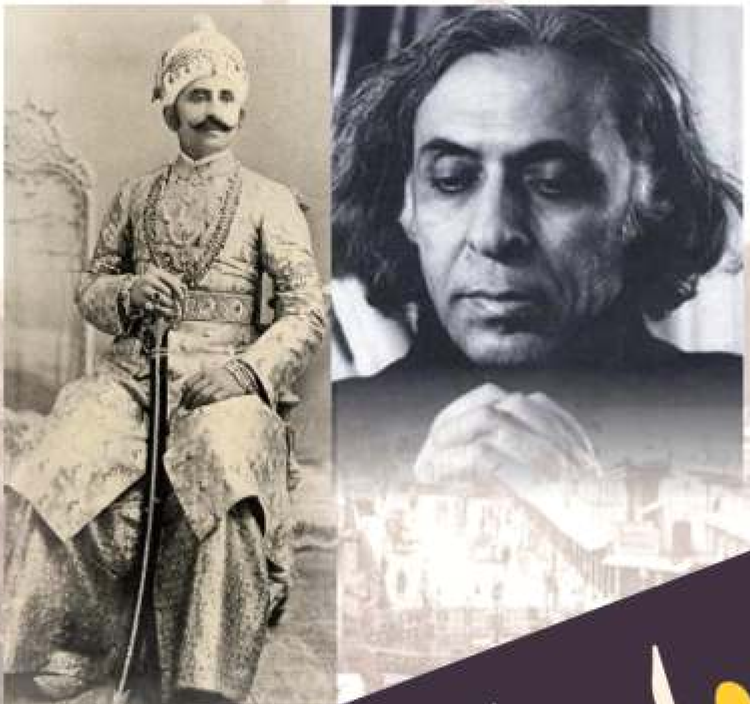

نصیرالدین ہاشمی

دکنی ہندو اور اردو

چھٹا دور: (1883-1918 / 1301-1336ھ)

اب ہم ایسے دور کا تذکرہ کرتے ہیں کہ جبکہ سرکار آصفیہ کی سرکاری زبان فارسی سے اردو ہوگئی تھی، اردو کے رسالے اور اخبار شائع ہونے لگے تھے اس دور کے ہندو شعرا کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس دور میں ہندو ادیبوں اور انشاپردازوں کی پوری صراحت تو دشوار ہے کیونکہ شعرا کی طرح ان کے حالات کسی نے جمع نہیں کیے ہیں ہماری تحقیقات اور معلومات سے جن اصحاب کا سردست پتہ چلتا ہے ان کا تعارف کردیا جاتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ مزید اضافہ ہوسکے۔

مہاراجہ کشن پرشاد: مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنہ آنجہانی کا تذکرہ شعرا کی ذیل میں کردیا گیا ہے مگر آپ ایک قادر الکلام شاعر کے ساتھ ساتھ زبردست ادیب صاحب فن نثرنگار اور بہترین انشاپرداز بھی تھے، مہاراجہ کی نثر کی کتابوں میں ناول، سفرنامے، مقالے اور خطوط ہیں جن کی تعداد خاصی ہے، آپ کے ناولوں میں خاکہ اور کردارنگاری دونوں کے اچھے نمونے موجود ہیں، سفرنامے دلچسپ ہونے کے علاوہ معلومات آفریں ہیں، ان میں تاریخی تحقیق بھی ہے اور سماجی ومعاشرتی امور کی صراحت بھی، درویشوں وفقیروں اور اللہ والوں کا حال بھی لکھا ہے اور سیاسی اور سماجی لیڈروں کا بھی، مہاراجہ کے خطوط میں تبسم وقہقہہ بھی ہے اور متانت بھی، کبھی آپ کی نثر میں نظم کی نقش افرینیاں ملتی ہیں، ظفر علی خاں صاحب نے ایک مرتبہ اپنے رسالہ دکن ریویو میں مہاراجہ کی تالیفات پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل صراحت کی ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے:

''پنڈت رتن ناتھ کے مذاق طبیعت کے لحاظ سے مہاراجہ کی تحریر پر بھی اثر پڑا ہے جو طرز تحریر پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے اس کا عکس مہاراجہ کشن پرشاد کی شاعری ونثر میں بھی نظر آتا ہے۔ (مہاراجہ کشن پرشاد، ص 238)

مہاراجہ کے سفرنامے دو قسم کے ہیں ایک تو روزنامچے کے طور پر لکھے گئے ہیں اور دوسرے سفرنامے میں مہاراجہ کی سرکاری رپورٹیں بھی دلچسپ اور معلومات آفریں ہیں بہرحال مہاراجہ کی نثر اپنی روانی، بیساختہ پن، شگفتگی کے لحاظ سے قابل قدر اور لائق ستائش قرار پاتی ہے۔

آپ کی نثر کے بعض نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

خطوط: ایک دوست کو لکھتے ہوئے اس امر کا جواب دیا گیا ہے کہ بعض اصحاب ان پر اعتراض کرتے اور آپ کے ادبی کارناموں کو پنڈت رتن ناتھ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

''بیشک میں شاعر نہیں، نثار نہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ بغیر کسی سہارے کے ٹوٹنہ چل سکے۔ آزمائش منظور ہے تو قلم ودوات لیں، کوئی مضمون یا خط یا کوئی سین وہ بھی لکھیں بندہ بھی گھسیٹتا ہے اس وقت قلعی کھل جائے گی۔ یہ میں نے مانا کہ میں منشی نہیں ہوں، انشاپردازی مجھے نہیں آتی اور نہ مجھے ابوالفضل یا نعمت خاں حالی ہونے کا دعویٰ ہے مگر ہاں مرزا علی بابا شیرازی الاصل کا شاگرد ہوں۔ سیدھی سادھی نثر لکھتا ہوں مگر انشائے خلیفہ اور مادھورام سے کم نہیں...... نظم میں نہ ذوق ہوں نہ مومن نہ امیر ہوں نہ داغ نہ غالب ہوں نہ بیدل نہ حافظ ہوں نہ سعدی مگر اپنے مطلب کو نظم میں موزوں کرلیتا ہوں۔ اردو نثر لکھنے میں یا ناول نویسی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی۔ ان کا نام میں نے اس وجہ سے نہیں لکھا ہے کہ میرے ہاں موجود ہیں۔ یا بقول آپ کے دوست کے وہ مجھے نظم ونثر لکھ دیا کرتے ہیں نہیں نہیں ان سے پوچھ لیا جائے کہ جب وہ حیدرآباد آئے اس وقت میری اردو زبان کیسی تھی، اور ان کا میری نسبت کیا خیال تھا۔ الغرض میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ مگر بھیا معمولی مکتوبات نویسی وغیرہ میں اگر غالب مرحوم کا چربانہ اتارا تو ہار جاؤں۔ الغرض

جو کچھ میں نے سیکھا استادوں سے سیکھا۔ صحبت اہل علم وفضل کی رہی ہے، یہ میرا کلمہ غرور کا نہ سمجھیے۔ میں تو نیچمدان ہوں..." (ایضاً،ص237)

اور ایک خط میں غالب کا رنگ ملاحظہ ہو:

"مہربان دوستان سلامت، تلوار پہنچی۔ میں تو ارمغان سمجھا تھا مگر خط کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ابھی مول نہیں لی گئی۔ صرف میرے امتحان اور پسند کے لیے بھیجی ہے۔ اس قدر دانی کا شکریہ، میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ پرکھوں۔ مگر حضرت عباس کی قسم عمدہ عباسی ہے، جو ہر وار قوت بازوئے سپہ سالار اس کی شان ہے۔ فتح وظفر اس کا دم بھرتے ہیں، تعریف تو یہ ہے کہ دشمن بھی جان دیتے ہیں اور اس پر مرتے ہیں۔ اور یہ ان کے خون کی پیاسی واہ ری عباسی آبداری میں گوہر آبدار لولوے شاہوار جس کے نخل ہستی میں آب رسانی کی اس کا چمن سوکھ کر کانٹا ہوگیا۔ گویا خزاں کے جھونکوں سے نیست و نابود تو کیا ویران وتباہ ہوگیا۔ باڑھ ہے کہ سمندر کی دھار ہے۔ خم ابرو سے کم نہیں، قبضہ بھی عمدہ ہاتھ آیا۔ اچھے پر قبضہ پایا۔ تیغی شاہی کام ہے شاہوں کے قبضہ قدرت میں رہنے کا سہام ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ (ایضاً،ص238)

آپ بیتی حالات: "اگرچہ ہر فرد بشر جس کی استعداد علمی زیادہ ہو یا کم وہ اپنے سرمایۂ استعداد کے موافق نثر لکھ ہی لیتا ہے۔ مگر نثاری کا فن بالکل جداگانہ ہے جو آج کے زمانے میں لٹریچر سے موسوم کیا گیا ہے۔ ہر کس وناکس نثار نہیں ہوسکتا۔ بڑے بڑے عالم فاضل دیکھے گئے ہیں کہ وہ باوجود اس لیاقت وفضیلت کے نثار یا منشی نہیں پائے جاتے اردو کی دنیا میں اگرچہ نثاری کی بنیاد مدت سے پڑ چکی تھی۔ مگر متاخرین میں مرزا غالب مرحوم کی اردوئے معلی نے اردو زبان کے تن بیجان میں روح پھونک دی۔ اردو معلی پہلی کتاب ہے جو متاخرین کے زمرے میں مستند سمجھی گئی ہے.......... میں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اکثر اردو ناولیں جو مشہور مصنفین کے انمول مضامین تھے ان کا مطالعہ کیا۔ اور التزام کے ساتھ ان کے روز مرہ محاورات دلچسپ فقرات اور ضرب المثل کو قلم بند کرتا گیا۔ جب اس سے فارغ ہوا تو ان کو از بر کرلیا۔ گو اس وقت میری عمر کے سفر کے ساتھ فراموشی بھی ہوتی گئی۔ مگر ایک اقتضائے سن دوسرے شوق کی امنگ نے مجھ کو نچلا نہ رہنے دیا۔ میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ موسوم بہ 'سرمایہ سعادت' لکھ کر شائع کرایا۔ یہ رسالہ کسی اہل زبان کی محک نظر میں کسا نہیں گیا۔ یوں ہی اس کو طبع کرادیا یہ ایک قصہ دو بھائیوں کا ہے جس میں ایک خواندہ اور دوسرا ناخواندہ ہے۔ ان کی طرز معاشرت اور اتفاق ونفاق کا نتیجہ دکھلایا ہے۔ اس عرصے میں رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اودھ اخبار میں طبع ہونا شروع ہوا۔"

اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہوسکتا ہے کہ مہاراجہ کی افسانہ نویسی پنڈت رتن ناتھ سرشار سے پہلے شروع ہوچکی تھی۔ مہاراجہ کے ایک سفرنامہ کا نمونہ بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں ناگپور کے سفر کے حالات ہیں مگر ہم اس سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جو مہاراجہ کے تصوف کے شغف کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

"اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور اس کی وحدت کا ثبوت ہم کو ہر وقت اور ہر آن ملتا ہے۔ مگر غفلت کا پردہ عقل پر ایسا پڑا ہوا ہے کہ ہم محسوس نہیں کرتے۔ دنیوی تعلقات اور اس کی نیرنگیوں کے تماشوں کو ماسوا اللہ کی شان میں دیکھ دیکھ کر اپنی اوقات کو خراب کرتے ہیں۔ ورنہ اگر بغور تمام اور بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو اس کی وحدت ہی کا سارا تماشا ہے۔ ادھر زہرہ بی نے جانے کی خبر دی اور اس کے اسباب بظاہر ایسے جمع ہوئے کہ ناگزیر سیر وتفریح کا قصد مصمم ہوا..... الغرض چلتے چلتے راجہ کے باغ کی طرف پہنچے جہاں شاہ صاحب رہتے تھے۔ اور خبر لی کہ شاہ صاحب ہیں کہ نہیں معلوم ہوا کہ موجود ہیں، فوراً میں اتر کر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ زائرین کا تانتا لگا ہوا ہے، اور منتظر فضل باری ہیں اور مجذوب کے مظہر کو اپنا قاضی الحاجات سمجھ کر امید کا دامن پھیلائے ہوئے ہیں اور مظہر ذات نامتناہی عبودیت کے خلعت سے مزین ہوکر مجذوب کی تصویر بن کر ہر ایک کے درد کی دوا کرنے میں اپنی مسیحائی دکھا رہا ہے جل جلالہ، جل شانہ، اس وقت شاہ صاحب دوسری طرف متوجہ تھے میرے پس پشت کھڑے ہوتے ہی چونک کر فوراً میری طرف دیکھ کر نظر ملائی بقول شخصے

نین چھپائیں نہ چھپیں پٹ گھونگھٹ کے اوٹ
چتر نار اور سورما کریں لاکھ میں جوٹ

نظر کا ملنا تھا کہ میرے قلب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار قلم سے ممکن نہیں۔"

مانک راؤ: پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب کا نام بحیثیت مورخ تاریخ دکن میں یادگار رہے گا۔ ضلع گلبرگہ آپ کا آبائی وطن تھا۔ 1867 میں ولادت ہوئی، گھر پر اردو، فارسی، انگریزی اور مرہٹی کی تعلیم کا انتظام ہوا، گھر کی تعلیم کے بعد مدرسہ اعزہ میں شریک ہوئے اور کچھ عرصہ تک تعلیم کے بعد ملازمت کے سلسلے میں منسلک ہوگئے۔ چونکہ آپ کے خاندان کو پائگاہ خورشید جاہی سے تعلق تھا اس لیے آپ بھی یہاں ہی ملازم ہوئے امرا پائگاہ کی مصاحبین کے ساتھ ساتھ مہتمی تعلیمات پائگاہ پھر رکن فوج رہے 1939 تک ملازمت کا سلسلہ باقی رہا۔ سنہ مذکور میں وظیفہ حاصل کرکے خانہ نشین ہوئے۔

مانک راؤ صاحب کی علمی خدمت کا سلسلہ ملازمت کے پہلے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی پہلی کتاب تفریح الحیات 1896 میں شائع ہوئی اور 1932 تک کتابوں کی تصنیف اور اشاعت کا سلسلہ باقی رہا۔ آپ کے تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:

شمار	نام کتاب	فن
1	تفریح الحیات	اخلاق
2	امیرانہ اور غریبانہ زندگی	اخلاق
3	راجہ اشوک کا جیون چرتر	تاریخ
4	دیدورنتی	مذہب
5	بستان آصفی سات جلدیں	تاریخ

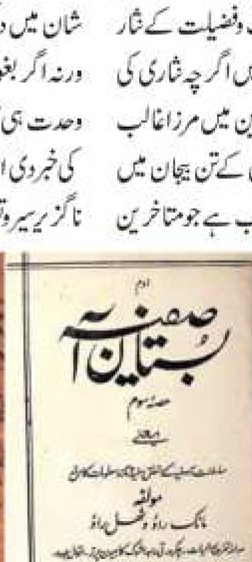

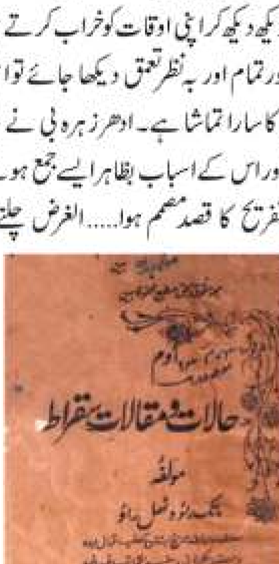

6	اقوال بدھ	مذہب
7	دستور حکمرانی	فن
8	مفید الخواتین	نسوانیات
9	حالات ومقالات سقراط	سوانح وفلسفہ
10	خیابان آصفی	تاریخ
11	مرہٹوں کا تمدن	تاریخ

مانک راؤ صاحب کی تصانیف کو تاریخ اور اخلاق پر تقسیم کر سکتے ہیں جن میں تاریخی کتابوں کا حصہ زیادہ ہے، مختلف سائز کے 4489 صفحات پر مانک راؤ صاحب کی کتابیں مشتمل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں بستان آصفی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب تاریخ دکن خصوصیت سے سلطنت آصفیہ کی مفصل تاریخ ہے اس میں نظم ونسق حکومت اور دیگر تاریخی امور کے متعلق جس قدر مواد موجود ہے بہت کم کسی دوسری کتاب سے حاصل ہوسکتا ہے۔

شمس العلما مولانا ذکاء اللہ جیسے مورخ نے اس کتاب کے متعلق جو رائے دی ہے وہ قابل ملاحظہ ہے:

''اس بستان آصفیہ میں ایسے چمن گلشن تاریخ لگے ہوئے ہیں جن کی بہار سے دل کی کلیاں کھلتی ہیں، اس میں عموماً دکن کے سلاطین کے خاندانوں اور خصوصاً خاندان آصفیہ کے اس بسیط وتفصیل سے حالات لکھے ہیں کہ اس کے مطالعے کے بعد پھر کسی اور تاریخ دکن سے سلاطین ماضیہ وحال کے حالات بڑی لیاقت وقابلیت وجاں فشانی وعرق ریزی سے استنباط کر کے لکھے ہیں غرض وہ حیدرآباد نظام کے کلیات وجزئیات حالات کا آئینہ ہے۔''

گو یہ صحیح ہے کہ اس ضخیم کتاب میں چند خامیاں بھی ہیں مگر وہ ایسی نہیں ہیں جن کی وجہ سے مانک راؤ صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ جو ذخیرہ تاریخی اس میں مل سکتا ہے وہ کسی اور جگہ بدست

مانک راؤ صاحب کی تصانیف کو تاریخ اور اخلاق پر تقسیم کر سکتے ہیں جن میں تاریخی کتابوں کا حصہ زیادہ ہے، مختلف سائز کے 4489 صفحات پر مانک راؤ صاحب کی کتابیں مشتمل ہیں۔ آپ کی تصانیف میں بستان آصفی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

نہیں ہوسکتا۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی مولف کا کارنامہ باقی رہے گا۔ ان کی زبان سادہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔

مانک راؤ صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

''ابوالخیر خاں کا سلسلہ نسب حضرت شیخ فرید شکر گنج تک پہنچ کر حضرت عمرؓ سے ملتا ہے، آپ کے پدر بزرگوار کا نام شیخ بہاؤ الدین خاں تھا، اور وہ مع اپنے چھوٹے فرزند کے شکوہ آباد ضلع مین پوری میں مسکن گزیں تھے، عنفوان شباب میں ذی اقتدار ہوئے، اور محمد شاہ بادشاہ دہلی کے حضور سے 'خان بہادر' کا خطاب پایا اور جس زمانے میں حضرت آصف جاہ اول عازم دکن ہوئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہوئے حضرت موصوف نے انھیں دو ہزار منصب پانچ سو سوار اور تین ہزار سپاہ کی جاگیر مرحمت فرمائی۔ سب سے پہلے جو اہم کام انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ باپو ناتک کا مقابلہ کیا اور فتح پائی۔ جب نواب ناصر جنگ اپنے والد ماجد حضرت آصف جاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے انھوں نے اپنا طرفدار بنانا چاہا لیکن انھوں نے بایں الفاظ انکار کر دیا کہ باپ کا جو ملازم ایسی حالت میں بیٹے کا شریک ہوگا وہ نہ صرف گناہ کبیرہ ہی کا مرتکب نہیں بلکہ دنیا میں بھی سخت سزا پائے گا۔ (بستان آصفی جلد دوم ص548)

راجہ راجیشور راؤ: راجہ راجیشور راؤ صاحب کا تذکرہ شعرا کے ساتھ ہوا۔ آپ کو شاعری سے زیادہ نثر نگاری سے رغبت تھی مختلف فنون میں سے زیادہ کتابیں تصنیف وتالیف فرمائی جن میں بعض حسب ذیل ہیں:

شمار	نام	فن
1	محبوب الاخلاق	اخلاق
2	حدیقۃ الاخلاق	اخلاق
3	گلبن دانش	اخلاق
4	گلزار دانش	اخلاق
5	ریاض دانش	اخلاق
6	کشف الاسرار	تصوف
7	ہدیۃ الملوک	اخلاق
8	تاریخ جہانگیری	تاریخ
9	معالجات کلب	حیوانات
10	تشریح الفرس	حیوانات
11	گنجینۂ امثال	لغت
12	کارنامہ	تاریخ
13	نجم اللغات	لغت
14	مفتاح اللغات	لغت
15	افسر اللغات	لغت
16	فرحت کدہ آفاق	لغت
17	قران السعدین	لغت
18	مجمع البحرین	لغت
19	نغمہ عنادل	نظم
20	تاریخ ہند	تاریخ
21	طبقات اکبری	تاریخ
22	مجموعہ ضرب الامثال	لغت
23	مجمع الالفاظ	لغت
24	فرہنگ فارسی جدید	لغت
25	گلدستہ مصوری	آرٹ
26	رامائن	تاریخ
27	مہابھارت	تاریخ

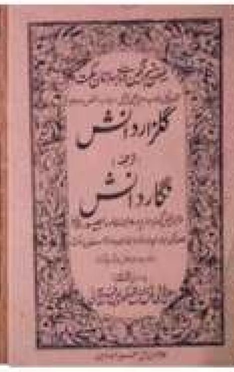

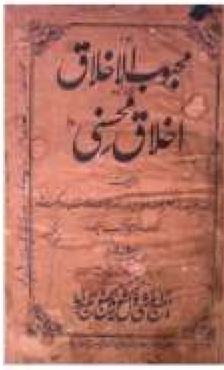

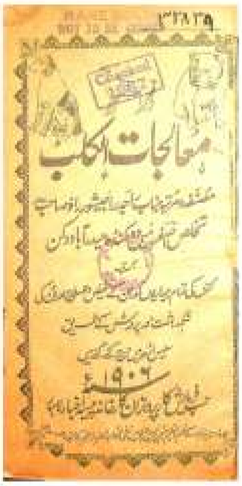

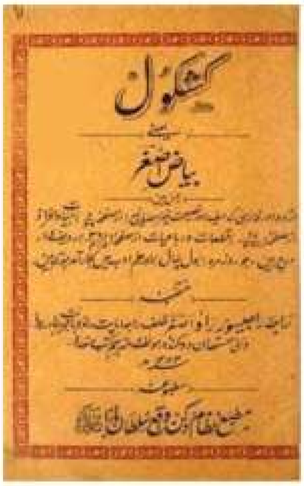

28	کشکول	لغت
29	القاموس	لغت
30	الخط عثمانی	آرٹ

باقی تصانیف فارسی میں ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اس فہرست سے واضح ہو سکتا ہے کہ راجہ راجیشور صاحب نے کس طرح مختلف فنون میں خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ لیکن آپ کو زیادہ تر 'لغت' سے دلچسپی تھی اسی فن پر آپ کی تصانیف کا زیادہ حصہ مشتمل ہے۔ آپ کی علمی یادگاروں اور قلمی کارناموں کے کئی ہزار صفحات ہیں جو شائع ہو چکے ہیں مگر اس کے علاوہ راجہ صاحب نے بلحاظ حروف تہجی عربی، فارسی اور اردو کی ایک لغت تیار فرمائی تھی جس کی چھبیس جلدیں مکمل ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس ضخیم کتاب کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ مانک راؤ صاحب کی طرح آپ کا نام بھی دنیائے اردو میں باقی رہے گا۔ آپ کا اسلوب بیان بھی صاف سادہ اور عام فہم ہوتا ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

''جس وقت جنگجو بہادروں کے اجسام ہتھیار پہننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے اس وقت جنگ کے باجوں کی آوازوں نے ان لوگوں کے دلوں میں شجاعت کی روح پھونک دی تھی جس سے سب کے دماغوں میں یہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ کب جنگ شروع ہو اور کب اپنے دل کی امنگ نکالیں۔ اس وقت ارجن نے اپنے دوست بھگوان سری کرشن سے جو ان کا رتھ چلا رہے تھے کہا دوست ذرا رتھ کو ایسے مقام پر لے چلو جہاں سے میں طرفین کے بہادران کارآزما کو اچھی طرح دیکھ سکوں۔ بھگوان سری کرشن نے ارجن کے منشا کے موافق رتھ کو دونوں افواج کے درمیان لے جا کر کھڑا کر دیا اور ہر ایک بہادر مرنے اور مارنے کے لیے بخوشی تیار تھا۔ چاروں طرف دریائے شجاعت کی لہریں موجزن تھیں سب کے چہروں پر رونق جھلک رہی تھی۔ یعنی سب کے منھ سے یہی آواز نکل رہی تھی کہ بزن وبکش'' (مہابھارت ص 110)

راجہ تیج رائے: راجہ تیج رائے صاحب برہم چھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے اجداد پائگاہ کے متوسل تھے رائے خوب چند آپ کے مورث اعلیٰ تھے جو نواب ابوالفتح خاں شمس الامرا کی سرکار میں ایک ذمے داری کی خدمت پر اپنے انتقال تک مامور رہے۔ رائے خوب چند کے بعد ان کے فرزند سروپ چند اور ان کے بعد ان کے نواسے راجہ تلجا پرشاد پائگاہ آسمان جاہی سے متعلق رہے۔

راجہ تیج رائے تلجا پرشاد کے فرزند تھے جو 1281ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے حسب رواج قدیم اردو فارسی اور انگریزی کی تعلیم پائی، بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اسی لیے اعلیٰ تعلیم نہیں پائی بلکہ ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہو گئے۔ آسمان جاہ نے آپ کو آبائی خدمت پر مامور کر دیا۔ اولاً مہتمم خزانہ اور سررشتہ دار فوج بنے پھر جب مجلس پائگاہ مرتب ہوئی تو آپ کو رکن فوج کی خدمت دے دی گئی آسمان جاہ کے انتقال کے بعد پادشاہ بیگم صاحبہ اور نواب معین الدولہ کے زمانے میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔ جب راقم الحروف کے نانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب (جو میر مجلس پائگاہ تھے) کا 1327ھ میں انتقال ہوا تو راجہ تیج رائے صاحب ان کی جگہ میر مجلس پائگاہ بنائے گئے جس کی انھوں نے اپنے انتقال تک جو 1935 میں ہوا انجام دیتے رہے۔

راجہ تیج رائے کو اردو ادب سے دلچسپی تھی، اور کتابوں اور اخباروں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنے مربی اور محسن آقا نواب سر آسمان جاہ کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا اور 1320ھ میں اس کی ترتیب شروع ہوئی اور نہایت محنت اور جانفشانی سے اس کا مواد مرتب کیا۔ اس سوانح عمری کو آپ نے 'صحیفہ آسمان جاہی' سے موسوم کیا ہے اس کے دو حصے ہیں ایک میں آسماں جاہ کی سوانح عمری ہے جس میں امرائے پائگاہ کے مختصر حالات اور آسمان جاہ کی وزارت کا تذکرہ اور مختلف سفروں وغیرہ کے حالات لکھے گئے ہیں اور دوسرے حصے میں آسمان جاہ کے سفر یورپ کے حالات کو جس کو نواب صاحب نے خود قلم بند کیا تھا درج کیا ہے۔

1321ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ حیدرآباد کے اخبار نویسوں نے اس پر اچھی تنقیدیں کی ہیں، نواب محسن الملک اور وقار الملک جیسے اصحاب نے بھی اس کی ستائش کی ہے۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے لکھا ہے کسی نے نواب سالار جنگ کی لائف نہ لکھی آپ نے حق خدمت خوب ادا کیا۔ نواب آسمان جاہ کی ایسی عمدہ لائف لکھ کر اپنی لیاقت اور سعادت ثابت کی۔ صحیفہ آسمان جاہی کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

آسمان جاہ کی شادی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''روز دوشنبہ کو صاحب عالیشان رزیڈنٹ صاحب بہادر کی دعوت مع ایک سو دیگر صاحبان انگریز و افسران بلوارم و سکندرآباد کی بڑے تکلف سے جدید حویلی میں کی گئی۔ لہٰذا سانچق و مہندی و شب گشت و بازگشت بھی یہاں

راجہ تیج رائے صاحب برہم چھتری قوم سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے اجداد پائگاہ کے متوسل تھے رائے خوب چند آپ کے مورث اعلیٰ تھے جو نواب ابوالفتح خاں شمس الامرا کی سرکار میں ایک ذمے داری کی خدمت پر اپنے انتقال تک مامور رہے۔ رائے خوب چند کے بعد ان کے فرزند سروپ چند اور ان کے بعد ان کے نواسے راجہ تلجا پرشاد پائگاہ آسمان جاہی سے متعلق رہے۔

کے رواج و دستور کے موافق اس دھوم دھام اور تکلف سے آئے اور گئے کہ جس کا حال قلم بند کرنا یا تو ناول نویسوں کا کام ہے یا شاروں کا نہ مجھ میں اتنی لیاقت ہے نہ قابلیت اس کا فوٹو کھینچ سکوں اور نہ میرا ارادہ اس قسم کی رنگ آمیزی کا ہے۔ حتی الامکان اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ سچے واقعات کو سلیس عام فہم عبارت میں ظاہر کیا جائے اور مبالغے سے کوسوں دور رہوں۔'' (ص 34)

شمس الامرا کے حالات میں تذکرہ کرتے ہیں:

''آپ کے محل میں اب تک بھی کیمیاوی تجربات کے آلات موجود ہیں جو انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک سے بصرف زر کثیر منگوائے گئے تھے۔ ان آلات کو آپ نے نمائش کے طور پر نہیں منگوایا تھا بلکہ ہر ایک آلہ کو خود استعمال کرنے کی لیاقت اور قابلیت رکھتے تھے آپ کی تعمیر کردہ عمارت موسوم بہ جہاں نما اس زمانے میں واقعی اسم بامسمّیٰ تھی دور دور سے شائقین اس کو دیکھنے کی غرض سے آتے تھے۔ اب تک اس مکان کی شہرت تھی، اس زمانے میں حیدرآباد میں اس کی مثل کوئی ایسی عالیشان سجی ہوئی عمارت نہیں تھی۔''

(صحیفۂ آسماں جاہی، ص 9)

پنڈت رتن ناتھ سرشار: اگرچہ سرشار حیدرآباد کے نہیں تھے بلکہ کشمیر کے باشندہ تھے لیکن ملازمت کے سلسلے میں 1897 میں حیدرآباد آگئے اور یہاں ہی 1902 میں ان کا انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے حیدرآباد کے ادیبوں میں ان کا تذکرہ کرنا نامناسب نہیں ہے۔

پنڈت سرشار کی ادبی خدمات کی تفصیل ہمارے مختصر صفحات میں دشوار ہے۔ انھوں نے 'فسانہ آزاد' لکھ کر دنیائے اردو میں اپنا سکہ بٹھا دیا اور جب تک اردو زبان باقی ہے اس وقت تک سرشار کا نام بھی تاریخ اردو میں سنہرے حروف میں ثبت رہے گا۔

سرشار ایک نہایت خوشگوار شاعر بھی تھے اور مزاحیہ نگار نثار بھی ان کی حسب ذیل تصانیف بہت مشہور ہیں۔

فسانہ آزاد، سیر کوہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کرم دھم بچھڑی دلہن، ہشو، طوفان بے تمیزی، رنگیلے سماں، پی کہاں شمس الضحیٰ وغیرہ۔

ان میں سے بعض حیدرآباد میں تصنیف ہوئی ہیں۔ سرشار کی کردار نگاری مشہور ہے اگرچہ وہ اصلیت کے ساتھ مبالغے سے کام لیتے ہیں۔

سرشار کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

''لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب ابھی بندرگاہ تو آنے دیجیے۔ بی شتاب جان اور کرم بخش اس سے کیونکر سن لیں گی۔ کہا اجی ہٹو بھی تم کیا جانو کبھی کسی پر دل آیا تو سمجھو۔ ارے نادان عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں اور کون کوس کڑی منزل کے کوسن لیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی، واہ بھلا کوئی بات ہے، مگر جواب کیوں نہ دیا۔ یہ پوچھو اس میں ایک لم ہے۔ پوچھو وہ کیا وہ یہ کہ معشوق پن نہیں اگر اتنی کچی نہ ہو۔ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو بندے کی نظروں سے گر جائیں۔ مزا جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈتے اور آوازیں دیتے ہوں کہ بی شتاب جان صاحب ابی بی صاحب اور وہ بے خبری میں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور ہنک کر کہیں مونڈی کاٹا آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ غل مچاتا پھرتا ہے۔

درد: رگھوناتھ راؤ بھی اس دور کے شاعر ہیں، زیادہ دوہرے نظم لکھا کرتے، افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی تھی، رسالہ 'تاج' کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

درد کا وطن بیدر تھا جہاں وہ 11 اکتوبر 1891 کو تولد ہوئے ان کے بچپن میں والد کا انتقال ہوگیا، حیدرآباد آکر ماموں کے زیر پرورش رہے اردو فارسی کی تعلیم پائی وکالت کا بھی امتحان دیا۔ مطالعے کا ذوق تھا اردو کے مشاہیر مولانا نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور سرشار کی کتابوں کو شوق سے دیکھا کرتے، اس سلسلے میں رسالہ تاج اور ادیب الاطفال کے ایڈیٹروں کے اصرار پر مضمون نویسی شروع کردی ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کرتے رہے، بیدر گزٹ کی ایڈیٹری بھی کچھ عرصے تک کرتے رہے۔

ثمرۂ محنت، یتیم کی عید، بیوہ کی عید، صدائے بیکس، پیکر وفا، تازیانہ عبرت، ظہور قدرت، سچا محسن، نیرنگی وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔

افسوس ہے کہ ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا اور اس سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ بجز دو تین افسانوں کے باقی افسانے ہدست بھی نہیں ہوتے۔

درد کے افسانے طبع زاد ہیں ان کے افسانوں میں رنج والم زیادہ ہے۔

''ہیرا سنگھ نے جوئے اور شراب خواری کی لت سے چوری کرنے کا پیشہ اختیار کیا اس کا ساتھی امر سنگھ اچکا تھا، ہیرا سنگھ گو طبعاً نیک تھا مگر امر سنگھ کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ یہ بھی پکا جواری اور چور بن گیا پھر شراب کی عادت پڑ گئی، گھر سے چار چار روز غائب رہنے لگا گھر میں بیوی اور ایک شیر خوار بچہ دو تھے۔ اگر دل میں آیا روپیہ دو روپیہ گھر میں دے دیا ورنہ چلتا پھرتا نظر آیا بیوی (درو پدی) کرتی تو کیا کرتی اگر کچھ چوں چرا کرتی تو لاٹھی یا جوتی سے مدارات کی جاتی۔

فاقے پر فاقے گزرتے تھے لیکن صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے دن کاٹ رہی تھی، محنت مزدوری اس وقت ممکن ہے جب کہ پیٹ میں کچھ ہو، جہاں تین تین دن کے فاقے گزرتے ہوں وہاں کیا ہوسکتا ہے۔

چھوٹا دیال بیمار ہوگیا ماں کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا کوئی پرسان حال نہیں اس کے لیے دنیا تاریک تھی، بیمار کے لیے حکیم اور دوا کی ضرورت تھی لیکن ان کے بھینٹ چڑھانے کے لیے یہاں کچھ بھی نہ تھا۔''

رائے بیجناتھ: بیجناتھ صاحب شمالی ہند کے باشندہ تھے مگر سرکاری ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد آکر بس گئے اور مرنے تک حیدرآباد میں رہے، آپ کا تعلق سررشتہ قانون سازی سے رہا اس کے علاوہ آپ لا کلاس (قانونی جماعت) کو سالہا سال تعلیم دیتے رہے، اس طرح آپ کے شاگردوں کی تعداد حیدرآباد کے تمام اضلاع میں پھیلی ہوئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لیے آپ نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا اس کے علاوہ اکثر قانونی کتابیں تالیف کی، جامعہ عثمانیہ کے قانونی کالج میں لکچر دیتے رہے کئی کتابوں کے مؤلف ہیں آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

''دھرم شاستر کے مضمون کی اہمیت اور قانون پیشہ حضرات کے لیے اس کی ضرورت محتاج بیان نہیں ہے۔ اس مضمون پر اصل کتابیں تو سنسکرت زبان میں ہیں لیکن بہت کم قانون پیشہ حضرات ایسے ہیں جو اصلی کتابوں کا مطالعہ فرما سکتے ہیں، یا جن کو اس قدر فرصت ہے کہ ان سے ضرورت کے وقت کسی نزاعی مسئلہ کے متعلق صحیح اصول اخذ کرسکیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ انگریزی زبان میں بالخصوص ٹیگور لکچروں کے ذریعہ بہت کافی سامان مہیا ہوگیا ہے لیکن اردو زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب میرے دیکھنے میں نہیں آئی جس سے طلبا اور نیز قانون پیشہ حضرات کی علمی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ (دھرم شاستر مطبوعہ 1916)

■

ماخذ: دکنی ہندو اور اردو، **مصنف:** نصیر الدین ہاشمی، **تیسری اشاعت:** 2023، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سماجی شعور

تعارف، اہمیت وافادیت

عرفان امین گنائی

انسان طبعاً معاشرت پسند اور سماجی واقع ہوا ہے۔ گرہوں اور ٹولیوں میں رہنے کی یہ خصلت ازل سے ہی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ جب ہم انسانی سماج کی ورق گردانی کرتے ہیں تو حضرت انسان کو روزِ اوّل سے ہی مختلف سماجی امور میں سرگرداں پاتے ہیں مثلاً جنگلوں میں مختلف گروہوں کی شکل میں بود وباش اختیار کرنا، ٹولیاں بنا کر جانوروں کا شکار کرنا وغیرہ۔

یہ بات نہایت قطعی اور حتمی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ انسان کسی بھی انسانی سماج کی پہلی اکائی ہے۔ اس کے بغیر سماج کا تصور عنقا ہے کیونکہ انسانی جماعت ہی ایک سماج کی تعمیر وتشکیل کرتی ہے۔ فرد اور سماج کے آپسی ربط اور سماج کے ارتقا کے بارے ماہر سماجیات ہربرٹ اسپنسر نے انیسوی صدی میں (Organismic Theory of Society) کا نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی اپنی کتاب میں اس طرح کرتے ہے:

''اسپنسر کے نظریہ کی رو سے جس طرح ایک بیج سے تناور درخت نشوونما پاتا ہے اسی طرح افراد کے بین عمل بتدریج سماج کا ارتقا ہوا جو روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جارہا ہے۔ درخت کی شاخوں اور پتوں کی طرح سماجی ادارے اور افراد درخت کی نشوونما کے لیے ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ درخت پتوں کی ضمانت دیتا ہے اور پتے درخت کی۔ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے ضروری ہے۔'' (ابتدائی سماجیات، ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی، ص65)

یعنی انسان کا وجود ہی سماج کو تشکیل دیتا ہے۔ اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے کہ وہ اپنے آپ کو سماج اور سوسائٹی سے کاٹ کر یکا وتنہا زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ یہ دراصل اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان رہے۔ ان سے اپنا ربط وتعلق بنائے، ان سے مختلف معاملات میں گفت وشنید رکھے۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان کے اندر انسانی خصلتیں سماج کے اندر رہ کر ہی پیدا ہوتی ہیں اسی لیے تقریباً تمام ماہرین سماجیات و بشریات (Sociologists and Anthropologists) کا اس بات پر کلّی طور سے اتفاق ہے کہ انسان اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو نے آج سے ہزاروں سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ انسان ایک سماجی جانور (Social animal) ہے۔ جو بغیر سماج کے بھی زندہ رہ سکتا ہے وہ یا تو جانور ہے یا پھر خدا (God) ہے جو اس سے بالاتر ہے۔ اسی کے مماثل پروفیسر پارک نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ "(man is not born human but to be made human). یعنی کوئی بھی آدمی پیدائشی طور انسان نہیں ہوتا بلکہ اسے انسان بنایا جاتا ہے۔ مذکورہ حوالوں سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ انسان کو انسان بننے کے لیے اس سماج میں جاری انسانیت (Humanity) کے عمل (Process) سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے وہ سارے نشیب وفراز چڑھنے اور اترنے ہوتے ہیں جن سے یہ انسانی سماج گزرتا ہے۔ مرزا غالب نے تقریباً اسی خیال کو اپنی غزل کے ایک شعر میں یوں پیش کیا ہے۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(دیوان غالب، ص38)

انسان کو انسانی خصوصیات سے آراستہ ہونے کے لیے اسے سماجی اصولوں پر عمل پیرا ہونا نیز اس کے تحت خود کو ڈھالنا ضروری ہے۔ یہ سماج ہی ہے جو ایک انسان کو باشعور بناتا ہے۔ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے۔ عقل ودانش کی بالیدگی کا سبب بنتا ہے۔ یہی چیز سماجی اصطلاح میں 'سماجی شعور' (Social Consciousness) کے نام سے موسوم ہے۔ سماجی شعور لسانی اعتبار سے دو الفاظ کا مجموعہ ہے 'سماج' اور 'شعور'۔ ذیل میں دونوں الفاظ کے لغوی اور اصطلاحی معنی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

لفظ 'سماج'، سنسکرت زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنا ہے 'سم' اور 'آج'۔ سم کے معنی 'اکٹھا' اور آج کے معنی 'رہنا' کے ہیں۔ یعنی لفظ سماج کے لغوی معنی ہیں 'ایک ساتھ رہنا' انگریزی میں سماج کے لیے (Society) لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی 'اکٹھا ہونا' کے ہے۔ شعور عربی زبان کے مادہ ش ع ر سے نکلا ہے۔ جس کے معنی 'جاننا اور محسوس کرنا' کے ہیں۔ اردو میں لفظ شعور کے معنی 'سمجھ بوجھ، احساس، دانائی، آگاہی' وغیرہ کے ہیں۔ یعنی سماجی شعور کے معنی سماجی حالات ومسائل کی آگہی ہوتا ہے۔

اردو ادب کے مشہور تنقید نگار کلیم الدین احمد اپنی فرہنگ 'ادبی اصطلاحات' میں سماجی شعور کی تعریف میں لکھتے ہیں:

''سماجی شعور یا آگہی۔ Social consciousness''

(فرہنگ ادبی اصطلاحات، پروفیسر کلیم الدین احمد، ص179)

اردو لغت میں سماجی شعور کی تعریف یوں کی گئی ہے:

''سماجی شعور: معاشرتی حالات ومسائل وغیرہ کی آگاہی''

(اردو لغت، وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان، 1990)

سائنسی اشتراکیت (Marxism) کے بانی کارل مارکس نے سماجی شعور کی معاشی توضیح کی ہے۔ وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

"Human beings enter into certain production, or economic releations and these releations lead to the form of social consciousness."

یعنی انسان دراصل چند پیداوری اور معاشی تعلقات سے ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے اور یہی تعلقات سماجی شعور کی ایک شکل کا باعث بنتا ہے۔

وکی پیڈیا کے مطابق سماجی شعور کی تعریف یوں ہے:

''سماجی شعور وہ شعور ہے جو سماج کے افراد (ممبران) کے مابین مشترک ہوتا ہے۔'' (وکی پیڈیا)

انگریزی کے مشہور آن لائن لغت Collins کے مطابق:

''سماجی شعور دراصل ان مسائل سے آگہی اور واقفیت کا نام ہے جو سماج میں موجود لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً غربت، بے سروسامانی، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی حتی الامکان مدد بھی کرنا۔''

مذکورہ بالا متعدد تعریفات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ سماجی شعور دراصل معاشرتی حالات و مسائل کی آگہی اور حتی الوسع ان کو سلجھانے کا نام ہے۔ سماجی طور پر باشعور ہونے کا مطلب یہ بھی ہے کہ معاشرے میں اپنے آس پاس کے لوگوں کے بارے میں گہرائی سے آگاہ ہونا۔ آپ آس پاس کے لوگوں پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ آپ کو کیسے متاثر کرتے ہیں۔ سماجی شعور آپ کو دوسروں کے لیے ہمدردی کا احساس دلا سکتا ہے اور اس وجہ سے یہ ذہن نشین کرا سکتا ہے کہ آپ کے اعمال ان پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔

سماجی شعور کی اہمیت

ایک مہذب انسانی سماج میں 'سماجی شعور' کی اہمیت اور اس کی افادیت مسلم ہے۔ یہ سماجی شعور ہی ہے جو ایک سماج کے لوگوں کو زندہ دل بناتا ہے۔ لوگوں کے مسائل سے واقفیت ہونا، ان کے دکھ درد میں شرکت، ان کی معاشرتی حالات کی آگہی اور عملی طور پر مسائل کی گتھیوں کو سلجھانا ہی دراصل وہ پیمانہ ہے جو انسان کو حیوان کی صفتوں سے باہر نکالتا ہے۔ اس طرح:

❖ سماجی شعور دراصل اخلاقیات (Ethics) اور حسن اخلاق کا نام ہے، جس کو سماجی شعور سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔

❖ سماجی شعور سماجی تبدیلی کا ضامن ہے۔ انسانی سماج کے مسائل تب تک حل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے اندر سماجی شعور بیدار نہیں ہوتا، جس دن یہ شعور جاگ اٹھے گا اسی دن سے معاشرے میں تبدیلی شروع ہوگی۔

❖ سماجی شعور دراصل ایک سماجی ذمہ داری ہے۔ انسان بس سماج میں اپنے شب و روز گزارتا ہے۔ اگر وہ اس کے ایشوز اور مسائل سے بے بہرہ اور ناواقف ہے تو ایک مثالی انسان ہونے کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے گا۔ سماجی شعور کے حامل افراد ہر آن انسانی سماج کو ایک بہترین جگہ بنانے میں سرگرداں نظر آتے ہیں جو کہ عین مطلوب ہے۔

❖ سماجی شعور سماج میں موجود ناانصافیوں کے خلاف علم بغاوت ہے۔ زندہ دل افراد سماج میں کسی طرح کی ناانصافی اور دھاندلی کو جیتے جی قبول نہیں کرتے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سماجی شعور کا حامل فرد سماج کے اندر کسی بھی طرح کی ناانصافی کو قبول نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے خلاف حتی الوسع بغاوت کرتا ہے۔

❖ سماجی شعور انسانی وقار کا حصہ ہے۔ اس کرۂ ارض پر انسان کا درجہ اشرف المخلوقات (Exalted creation) کا ہے۔ اگر وہ اپنے سماج میں موجود برائی کی تمیز نہ کر سکے، صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی جرات نہ رکھتا ہو، تو پھر انسانی اور حیوانی سماج میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ انسانیت کا وقار مجروح ہو کے رہ جائے گا۔ لہٰذا سماجی شعور سے خود کو مزین کرنا انسانی وقار کا حصہ ہے۔

سماجی شعور کی اصطلاح سمجھنے سے پہلے یہ بہتر ہوگا کہ شعور اور لاشعور کے مابین فرق کی وضاحت کر دی جائے۔ شعور (Conscious) سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن سے ہم کسی نہ کسی طرح سے واقف ہوتے ہیں اور جو ہمارے شب و روز کے مشاہدات سے بچ کر نکل نہیں سکتیں۔ دوسری طرف لاشعور (Unconscious) وہ اشیا ہیں جن کے بارے میں ہم کو کچھ معلوم نہیں ہوتا اور جو ہمارے شب و روز کے مشاہدات میں بھی نہیں ہوتیں۔ ہمارے کردار پر اثر انداز ہونے والے زیادہ تر میکانزم کافی حد تک ہمارے شعور اور لاشعور پر مبنی ہوتے ہیں۔

سماجی شعور

سماجی شعور سے مراد وہ آگاہی ہے جو معاشرے کے ہر فرد کی فلاح و بہبود کے تعلق سے ہو اور اس اثر معاشرے کے دیگر افراد کی فلاح و بہبود کی کوشش کے لیے ہو۔ مشہور ماہر سماجیات کولن (Colin) سماجی شعور کی تعریف کے ضمن یوں لکھتے ہیں:

''سماجی شعور کو معاشرے کی آگاہی بھی کہا جاسکتا ہے جو کہ دراصل خود آگاہی کے تصور سے وابستہ ہے۔''

(امریکن جرنل آف سوشیولوجی، جلد 12، پروفیسر چالس ایچ کولن، ص 675)

سماجی شعور دراصل کسی انجمن، تنظیم یا معاشرے کو درپیش مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور اس کا حل پیش کرنے کی تدابیر کرنے کی ایک اجتماعی جدوجہد کا نام ہے۔ پروفیسر کولن نے سماجی شعور کی مثال دیتے ہوئے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''سامانتھا (Samantha) نے اپنے شہر کے مسائل پر توجہ دینے کی کوشش کی کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ ایک شہری ہونے کے ناطے اس کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کے شہری سماجی طور پر باشعور ہوں اور ذاتی طور پر اس کی اصلاح کرنے کی عملی تدابیر اختیار کرنے اور انھیں نافذ کرنے میں فعال کردار ادا کریں۔'' (ایضاً، ص 695)

سماجی طور سے باشعور ہونے کا مفہوم

سماجی طور سے باشعور ہونے کا مطلب ہے کہ ہر آن آپ کو یہ شعور رہے کہ آپ معاشرے کے ایک رکن ہیں۔ اس ناطے سے آپ کا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ لوگوں کے احوال و کوائف اور ان کے مختلف مسائل سے واقف ہوں۔ ساتھ ہی اس بات کو بھی تسلیم کرنا ہے کہ آپ کی کمیونٹی کے دیگر افراد بھی اسی احترام و عزت کے مستحق ہیں جس کی آپ ان سے توقع رکھتے ہیں۔ سماجی طور سے باشعور انسان اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اسے صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے جذبات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔

لوگوں کا ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ سماجی طور سے باشعور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے بہت سے دوست اور رفقا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کثیر الروابط ہو، حالانکہ یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس سماجی شعور انسانی سرگرمی کی بجائے دماغ کی ایک کیفیت اور حالت کا نام ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آپ کے دوستوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بن سکتی ہے لیکن اگر آپ کی اس دوستی سے سماج کے اوپر اگر کوئی مثبت اثر نہیں پڑتا تو آپ شعوری طور پر سماجی یا سماجی طور پر باشعور فرد کے طور پر کامیاب نہیں ہوں گے۔

سماجی شعور کا ایک مفہوم ماحولیاتی طور پر باشعور ہونا بھی ہو سکتا ہے اس طور سے کہ یہ سمجھنا معاشرے کو غیر پیدا شدہ نسل کے لیے محفوظ رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے سماجی شعور دراصل سماجی ضمیر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور سماجی ضمیر کو اگر بروئے کار نہ لایا جائے تو یہ محض ایک نظریے تک محدود رہ سکتا ہے۔

■

Irfan Amin Ganie
S/o Mohammad Amin Ganie
R/o Arwani, Tehsil Bijbehara
District.Anantnag- 192124 (J&K)
Cell.: 9149672422
irfanamin9945@gmail.com

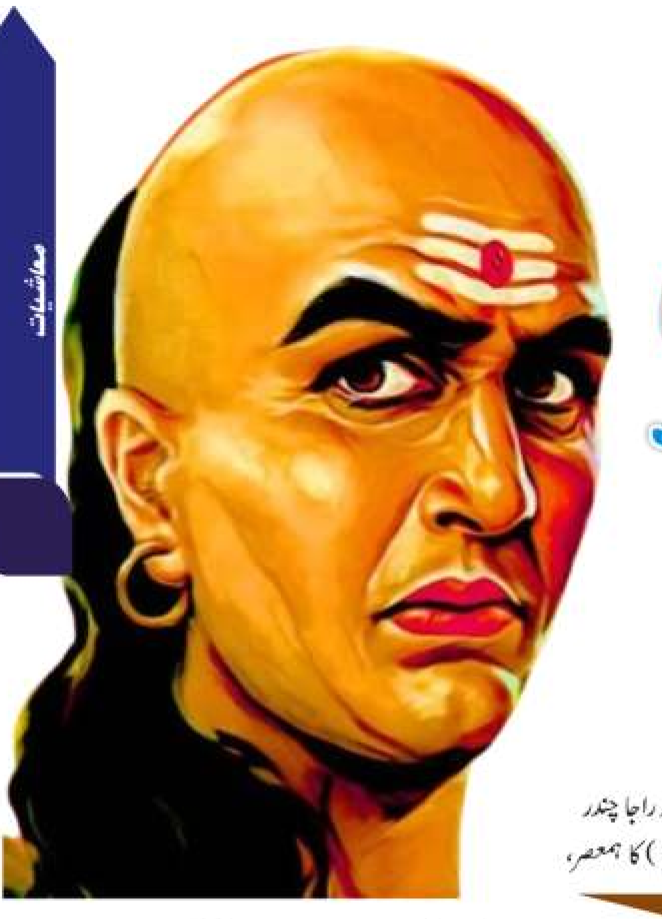

قدیم بھارت کا عظیم سیاست داں اور ماہر معاشیات

مقبول احمد مقبول

کوٹلیہ

تاریخ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بعض لوگ ایسی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک گزرے ہیں جن کی شہرت رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ ایسی ہی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل قدیم بھارت کے ایک شخص کا نام کوٹلیہ ہے۔ تاریخی کتب اور سنسکرت لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ کوٹلیہ کا اصل نام وشنو گپت تھا لیکن آج اس کا یہ اصل نام غیر معروف ہے۔ وشنو گپت نہایت ذہین، چالاک اور زیرک آدمی تھا۔ اس وصف کی وجہ سے اس کا نام چانکیہ پڑ گیا۔ اس نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'ارتھ شاستر' میں جگہ جگہ خود کو کوٹلیہ کہا ہے۔ آج ساری دنیا میں یہ شخص کوٹلیہ اور چانکیہ کے نام سے مشہور ہے۔ کوٹلیہ کی شہرت کا سارا دارومدار اس کی کتاب 'ارتھ شاستر' پر ہے۔ کوٹلیہ ایک غریب برہمن خاندان کا فرد تھا۔ لیکن اپنی زبردست ذہانت، حکمتِ عملی اور سیاسی شعور کی بنا پر موریہ سلطنت کے قیام کا ذریعہ بنا۔ مورخین کے درمیان کوٹلیہ کے سالِ پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی 350 ق م بتاتا ہے تو کوئی 370 ق م بتاتا ہے، تو کسی کے نزدیک 375 ق م اس کا سالِ پیدائش ہے۔ اس کا سالِ وفات 283 ق م اور مقامِ وفات پاٹلی پتر ہے جسے آج پٹنہ کہا جاتا ہے۔

کوٹلیہ اپنے وقت کا بڑا دانشور، فلسفی، ویدوں کا زبردست عالم، معاشیات اور سیاسیات کا ماہر، مدبر و منتظم اور جنگی حکمتِ عملی کا ماہر تھا۔ وہ بہت ہی ذہین، دانا اور دور اندیش آدمی تھا۔ کئی علوم و فنون کا ماہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ یونانی اور فارسی زبانیں بھی جانتا تھا۔

کوٹلیہ بھارت کے قدیم اور مشہور راجا چندر گپت موریا (350 ق م تا 295 ق م) کا ہمعصر،

کوٹلیہ کی شہرت کا سارا دارومدار اس کی کتاب 'ارتھ شاستر' پر ہے۔ کوٹلیہ ایک غریب برہمن خاندان کا فرد تھا۔ لیکن اپنی زبردست ذہانت، حکمتِ عملی اور سیاسی شعور کی بنا پر موریہ سلطنت کے قیام کا ذریعہ بنا۔

استاد، مشیر اور وزیر تھا۔ چندر گپت موریہ کے راجا بننے سے قبل شمالی بھارت کے علاقے مگدھ پر نند خاندان کے راجا دھانا نند کی حکومت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی تقریب میں اس راجا نے کوٹلیہ کی توہین کی تھی۔ اسی وقت کوٹلیہ نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ نند خاندان کی حکومت کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس غرض سے کوٹلیہ نے نند خاندان کے ایک نوجوان چندر گپت کی اپنی نگرانی میں تعلیم و تربیت شروع کی جو کسی وجہ سے راجا کی ناراضی کا عتاب جھیلتے ہوئے جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

کوٹلیہ کی تربیت، مشوروں اور رہنمائی کی بدولت چندر گپت نے اپنے پیشرو راجا دھانا نند کی حکومت کا تختہ پلٹ کر مگدھ میں موریا سلطنت کی بنیاد رکھی اسے بہت وسیع کیا۔ بھارت کا مشہور فاتح اور حکمراں اشوکِ اعظم چندر گپت موریا کا پوتا تھا جس نے اپنی حدودِ سلطنت کو اور بھی وسیع کر کے تاریخ عالم کے عظیم فاتحوں اور حکمرانوں میں اپنا نام لکھوایا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس عظیم موریا سلطنت کے قیام میں کوٹلیہ کی دانائی، عملی، سازش اور مشوروں کا بہت اہم کردار ہے۔ موریا سلطنت کے قیام کے بعد ایک مدت تک کوٹلیہ چندر گپت کے وزیر کی حیثیت سے کارگزار رہا۔ کہا جاتا ہے کہ تمام شاہی عیش و آرام میسر ہونے کے باوجود کوٹلیہ معمولی سی کٹیا میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔

کوٹلیہ مصنف بھی تھا۔ ممکن ہے اس نے اور بھی کتابیں لکھی ہوں لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا 'ارتھ شاستر' کوٹلیہ کی سب سے مشہور کتاب ہے جس کا موضوع علمِ سیاست ہے۔ اکثر محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ارتھ شاستر 311 ق م سے 300 ق م کے دوران میں تحریر کی گئی ہے۔ بائیس صدیوں تک کوٹلیہ کی یہ کتاب گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی۔ ارتھ شاستر کے اردو مترجم شان الحق حقی کے مطابق بیسویں صدی کی ابتدا تک اس کتاب کا نسخہ دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اس

سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ ارتھ شاستر کا ذکر ہندوستانی ادب اور شاستروں میں خاصے تواتر کے ساتھ آتا ہے لیکن کتاب کا نسخہ اس صدی کے شروع تک ناپید تھا۔ اسے پہلے ڈاکٹر شام شاستری نے دریافت کیا جوراج میسور کی میوزیم لائبریری کے نگراں تھے اور 1909 میں اس کا پہلا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

(عرض مترجم، ارتھ شاستر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2010، ص7)

پھر اس کے بعد دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ جیسا کہ کہا گیا اس کتاب کا اردو ترجمہ پاکستان کے مشہور لغت نویس اور مترجم شان الحق حقی نے کیا ہے جو پہلی بار 1991 میں کراچی سے شائع ہوا۔

کتاب 'ارتھ شاستر' میں پندرہ ابواب ہیں اور ہر باب کئی اجزا پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا ہی میں یعنی باب اول کے شروع ہونے سے پہلے ہی کتاب کی غرض وغایت، موضوع اور مقصد کی وضاحت کی گئی ہے۔ لکھا گیا ہے کہ:

''یہ ارتھ شاستر ان تمام تالیفات کے خلاصے کے طور پر مرتب کیا گیا ہے جو اس عنوان سے قدیم اساتذہ نے ملک گیری و ملک داری کے تعلق سے تحریر کی تھیں۔''

(ارتھ شاستر مترجمہ شان الحق حقی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2010، ص17)

مولف کے اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ:

1 کتاب زیر بحث کا موضوع علم سیاست اور حکومت ہے۔

2 اس کتاب کی تصنیف یا تالیف کا مقصد مملکت کو حاصل کرنے اور اس کے تحفظ اور توسیع کے طریقوں سے آشنا کرنا ہے۔

3 یہ کتاب اس موضوع پر پہلی کتاب نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی اس موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ کتاب ان سب کتابوں کا عطر مجموعہ ہے۔

یہ کتاب تو بنیادی طور پر علم سیاست وحکومت پر مشتمل ہے لیکن اس میں کوٹلیہ نے تمدنی زندگی کی تقریباً ہر جہت پر بحث کر کے اس کے اصول اور ضوابط مقرر کیے ہیں۔ مختلف علوم وفنون، فوج کشی، معیشت، آئین حکومت، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، سماجی زندگی، شادی بیاہ، رسم ورواج، ٹونکے، توہمات، علاج ومعالجہ، ادویات سازی، فوج کشی، مجرموں کی سزائیں، جاسوسی کے طریقے، راجا کے اوصاف، حکومتی معاہدات اور ریاست کو مستحکم کرنے کے طریقوں جیسے ان گنت موضوعات پر رہنمایانہ اصول مرتب کر کے کوٹلیہ نے اپنی غیر معمولی فہم وفراست، گہری سیاسی بصیرت، سماجی شعور اور نکتہ دانی ونکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔ کوٹلیہ کی اس ہمہ گیر فکر اور اس کی حیرت انگیز ذہانت وفطانت پر دنیا حیران ہے۔

کتاب ارتھ شاستر کا پہلا باب راجا کی تربیت اور دستور حیات سے متعلق ہے۔ اس باب میں راجا اور راجکماروں کی تعلیم وتربیت، منتریوں اور پجاریوں کے تقررات، والی مملکت کے فرائض جیسے کئی امور کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ دوسرا باب عمال حکومت (صوبوں کے حاکموں) کے فرائض پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں مختلف امور کے قوانین بتائے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں کاری گروں اور بیوپاریوں سے نبٹنے، بدمعاشوں کا صفایا کرنے، مجرموں کو رنگے ہاتھ یا شبہے کی بنیاد پر پکڑنے اور اس طرح کے کئی امور سے متعلق اصول وضع کیے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں درباریوں کے آداب وقواعد بتائے گئے ہیں۔

چھٹواں باب 'ملکی حاکمیت کے وسائل' کے عنوان سے ہے جس کے تحت حاکمیت کے بنیادی لوازم، حالت امن اور مہمات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، نیز حلیف اور حریف کی تعریف بیان کرتے ہوئے ان کی خصوصیات بتائی گئی ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے کس طرح کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ساتویں باب میں چھ حکمت عملیاں اور اس کے مقاصد کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ کوٹلیہ نے اپنے گرو کے حوالے سے جو چھ حکمت عملیاں بیان کی ہیں وہ یہ ہیں: امن، جنگ، غیر جانبداری، حرکت، اتحاد اور ایک کے ساتھ صلح تو دوسرے کے ساتھ جنگ۔ ان شش گانہ حکمت عملیوں کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ کوٹلیہ کے مطابق انھی چھ حکمت عملیوں کے بروقت اور درست استعمال سے

کتاب ارتھ شاستر کا پہلا باب راجا کی تربیت اور دستور حیات سے متعلق ہے۔اس باب میں راجا اور راجکماروں کی تعلیم وتربیت، منتریوں اور پجاریوں کے تقررات، والی مملکت کے فرائض جیسے کئی امور کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

ریاست کو استحکام اور بقا حاصل ہوتی ہے۔ آٹھویں باب میں مختلف قسم کی زمینی اور آسمانی آفتوں کے اسباب اور ان سے نبٹنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

نواں باب حملہ کرنے کے وقت، جگہ، اپنی اور دشمن کی طاقت کا اندازہ کرنے، اندرونی اور بیرونی خطروں کے سدباب، جان ومال کے نقصان کے جائزے جیسے امور پر مشتمل ہے۔ دسویں باب میں جنگی کارروائی کے طریقوں، پیدل اور سوار دستوں کی ذمے داریوں، صف آرائی کی مختلف شکلوں اور دھوکے کی چالوں جیسے جنگ کے دوران میں پیش آنے والے دسیوں معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ فوج کشی اور جنگ کے تمام ممکنہ مسائل کو اس باب میں سمویا گیا ہے۔ گیارھواں باب ریاستی گروہوں سے نبٹنے کے طریقوں پر مشتمل ہے۔ بارھویں باب میں طاقتور

دشمن سے نبٹنے کے طریقے اور چالیں بتائی گئی ہیں۔ تیرھویں باب میں قلعے فتح کرنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔

چودھویں باب میں دشمن کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں، پرفریب چالیں، عجیب وغیب دوائیں، زہر سازی کے عجیب عجیب نسخے مختلف زہروں کا توڑ، جادو منتر، ٹونے، ٹوٹکے وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ان چیزوں کو پڑھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ان ٹوٹکوں، منتروں اور طلسمات کو پڑھ کر آدمی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ پندرھواں اور آخری باب بہت مختصر ہے جو کتاب کے اجزائے متن کی ترتیب وتالیف اور تقسیم پر مشتمل ہے ۔ اس باب کی ابتدا میں ارتھ شاستر کی تعریف کرتے ہوئے کوٹلیہ نے لکھا ہے کہ:

''انسانی معیشت کا دارو مدار ارتھ یا دولت پر ہے۔ ارتھ دراصل زمین کا نام ہے اور یہی دولت بھی ہے۔ وہ علم جو زمین کو حاصل کرنا اور اسے قابو میں رکھنا سکھاتا ہے، ارتھ شاستر ہے۔

(ارتھ شاستر مترجمہ شان الحق حقی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی،2010،ص524)

اس کے بعد کتاب کا متن جن اجزا پر مشتمل ہے ان کی فہرست دی گئی ہے ۔ زبان، صرف ونحو، ادب وانشا میں استعمال ہونے والی اصطلاحات مثلاً جملہ، تمثیل، کنایہ، دلیل، حذف، اشتقاق وغیرہ کی تصریح وتشریح کی گئی ہے۔کتاب کے اختتامی جملوں میں لکھا ہے کہ یہ کتاب دنیا وآخرت کی بھلائی کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔ یہ دھرم، ارتھ اور کام کے حصول کا ذریعہ ہے اور جو باتیں ان کی ضد ہیں ان کو مٹاتی ہے۔ کتاب کا آخری جملہ یہ ہے:

''یہ شاستر اسی کا لکھا ہوا ہے جس نے اپنے جذبے سے شاستر اور شستر ودیا کو نیا جیون دے کر دھرتی کو نندراجاؤں سے چھڑایا۔'' (ایضاً ص528)

کتاب کے اس آخری جملے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ کوٹلیہ نندراجاؤں سے ناراض تھا اور یہ کہ اس نے نندراجاؤں کی حکومت کو ختم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی میں میکیاولی (1469-1527) نام کا مشہور مفکر وفلسفی گزرا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ میکیاولی سیاست میں کوٹلیہ کی فکر سے بہت متاثر ہے۔اس نے 'دی پرنس' نامی کتاب لکھی ہے۔اس میں حصولِ مقصد کے لیے تقریباً وہی تدابیر بتائی گئی ہیں جو صدیوں پہلے کوٹلیہ نے اپنی کتاب ارتھ شاستر میں لکھی ہیں۔اسی لیے کوٹلیہ کو انڈین میکیاولی بھی کہا جاتا ہے۔اس مناسبت سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میکیاولی اٹلی کا کوٹلیہ تھا۔کتاب ارتھ شاستر دنیا میں پہلی بار بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں منظر عام پر آئی جب کہ میکیاولی سولھویں صدی میں گزرا ہے۔ ظاہر ہے کہ ارتھ شاستر کا اس کی نظر سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ میکیاولی اپنے سیاسی نظریات میں کوٹلیہ سے متاثر تھا، لیکن دونوں کے نظریات میں جو مماثلت ہے وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔

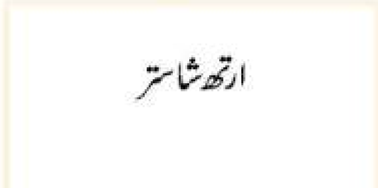

زماں ومکاں کی دوری اور زبان و مذہب کے فرق کے باوجود نظریات میں یہ مماثلت اور ہم آہنگی واقعی حیرت انگیز ہے۔

کوٹلیہ کی عیارانہ چالوں، مکارانہ روش، سفاکانہ اصول، حریصانہ پالیسی، اقتدار کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ہر جائز وناجائز طریقوں کو اپنانے کی تعلیم جیسی باتوں کے پیش نظر اس کی کتاب ارتھ شاستر اور خود اس کی ذہنیت ہدف تنقید بھی بنتی رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوٹلیہ نے بائیس صدیوں قبل نظامِ حکومت کے لیے وسیع اور بسیط ضابطہ مدون کیا ہے۔ یہ ایسا ضابطہ ہے جس میں انتظامِ مملکت اور سماجی زندگی سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو چھوٹ گیا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بہت سے اصول وضوابط اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے قابلِ تنقید ضرور ہیں۔

کوٹلیہ کے ایسے کئی اقوال مشہور ہیں جن میں حکمت اور دانائی پوشیدہ ہے۔ان میں سے کچھ اقوال یہاں پیش ہیں:

1 دوسروں کی غلطیوں سے سیکھو، تم اپنی صرف خوبیوں کی بدولت زندہ نہیں رہ سکتے۔

2 اپنے راز کسی کو نہ بتاؤ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔

3 کسی بھی شخص کو بہت زیادہ دیانت دار نہیں ہونا چاہیے۔ سیدھے کھڑے ہوئے درختوں کو پہلے کاٹا جاتا ہے اسی طرح دیانت دار افراد کو بھی پہلے ناکارہ کیا جاتا ہے۔

4 انسان اپنی پیدائش سے نہیں اپنے کارناموں سے عظیم بنتا ہے۔

5 تعلیم بہترین دوست ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کی ہر جگہ عزت کی جاتی ہے۔تعلیم خوبصورتی اور جوانی کو شکست دے دیتی ہے۔

6 ایک بدمعاش بیٹا سارے کنبے کو تباہ کر دیتا ہے۔

کوٹلیہ کی موت 283 ق م میں ہوئی۔اس کی موت کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ایک یہ کہ چندر گپت موریا کی بیوی ملکہ ہیلینا نے اسے زہر دے کر قتل کروایا۔ دوسری کہانی کے مطابق راجا چندر گپت کی پہلی بیوی کے بیٹے راجا بندوسار کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی ماں کی موت کا ذمے دار کوٹلیہ ہے تو بندوسار بہت غضب ناک اور غمگین ہو گیا۔اس کے دل میں کوٹلیہ سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ بندوسار نے اسے خدمات سے سبکدوش کر کے کئی دن تک بھوکا رکھا اور اسی میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ گویا راجا نے اسے بھوک مری کی سزا دی۔ایک تیسری روایت کے مطابق راجا بندوسار کے وزیر نے کوٹلیہ کو زندہ جلا دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راجا بندوسار کا وزیر، کوٹلیہ کی قابلیت اور شہرت سے جلتا تھا۔اسی لیے وہ راجا بندوسار کے دل میں کوٹلیہ سے نفرت پیدا کر کے اس کو موت کے گھاٹ اتروانے میں کامیاب ہوا۔ قدیم بھارت کا مشہور حکمراں اشوک اعظم (م: 232 ق م) اسی راجا بندوسار کا بیٹا تھا۔

■

Prof. Maqbool Ahmad Maqbool
Dept.of Urdu
Maharashtra Udayagiri Collge
UDGIR-413517
Dist: Latur (M.S)
Mob:9028598414E
mail:maqboolahmedmaqbool@gmail.com

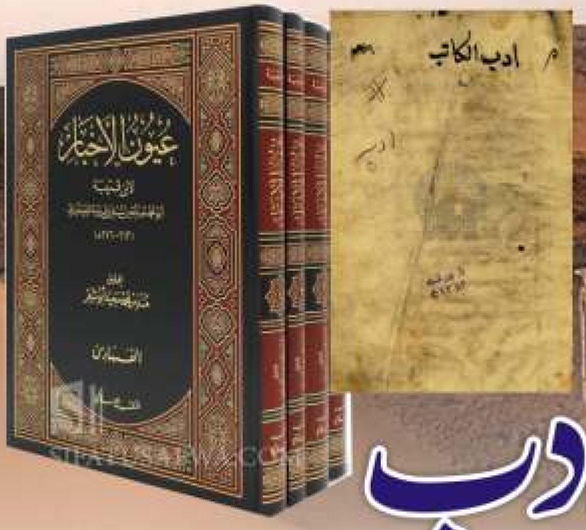

محمد شہباز عالم

ابن قتیبہ کا تصور ادب

ابن قتیبہ (وفات:889) صرف ایک مؤرخ، فقیہ اور ادیب ہی نہیں تھے، بلکہ ان کے نظریات نے اسلامی علوم وفنون پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کی تصانیف جیسے 'عیون الاخبار' اور 'ادب الکاتب' نے ادب کو ایک اخلاقی، تعلیمی اور سماجی فریضے کے طور پر پیش کیا۔ ادب، ابن قتیبہ کے نزدیک، نہ صرف جمالیاتی پہلوؤں کا مظہر تھا، بلکہ یہ ایک ایسا وسیلہ تھا جس کے ذریعے اخلاقی ومعاشرتی اقدار کو فروغ دیا جاتا تھا۔

ابن قتیبہ کی پیدائش 828 میں عراق کے شہر کوفہ میں ہوئی، جو اس وقت اسلامی علوم وفنون کا ایک اہم مرکز تھا۔ ان کے والد قاضی تھے، اور اس علمی ماحول نے ابن قتیبہ کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے والد اور دیگر اساتذہ سے علم حاصل کیا اور عربی زبان، ادب، نحو، فقہ، اور حدیث کے علوم میں مہارت حاصل کی۔

ابن قتیبہ کی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزرا، جو عباسی خلافت کا علمی مرکز تھا۔ بغداد میں ابن قتیبہ نے نہ صرف علمی حلقوں میں شہرت حاصل کی، بلکہ وہ یہاں مختلف علمی اور تعلیمی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ بغداد میں قیام کے دوران ان کی ادبی، فقہی اور تاریخی تصانیف نے اسلامی علوم میں نئی جہتوں کو متعارف کروایا۔

ابن قتیبہ کی اہم تصانیف میں 'عیون الاخبار'، 'ادب الکاتب' اور 'تاویل مختلف الحدیث' شامل ہیں۔ 'عیون الاخبار' ایک ایسی کتاب ہے جس میں ادب، تاریخ، اور اخلاقیات کا امتزاج ملتا ہے، جبکہ 'ادب الکاتب' نے اسلامی ادب میں ایک نئی روح پھونکی اور اہل قلم کے لیے ایک عملی رہنما کتاب ثابت ہوئی۔

اسلامی کلاسیکی دور میں 'ادب' کی اصطلاح بہت وسیع اور جامع تھی۔ ادب کا مطلب صرف فنون لطیفہ یا زبان و بیان کی مہارت تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس کا دائرہ اخلاقیات، سماجی آداب اور معاشرتی اصولوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلامی معاشرتی نظام میں ادب کا ایک اہم مقصد لوگوں کو اخلاقی تربیت دینا اور ان کی شخصیت کو معاشرتی معیار کے مطابق ڈھالنا تھا۔ ابن قتیبہ اس تصور کے ایک اہم ترجمان تھے۔

ابن قتیبہ کے نزدیک ادب کا مقصد محض زبان و بیان کی خوبیوں کو اجاگر کرنا نہیں تھا، بلکہ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعے انسانوں کی اخلاقی اصلاح ممکن تھی۔ انھوں نے ادب کو سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل کے حل کے لیے ایک موثر وسیلہ سمجھا۔ ان کی کتب میں اخلاقی نصائح اور معاشرتی اصلاح کے پہلوؤں کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ابن قتیبہ کے نزدیک ادب کا ایک اہم پہلو اس کی اخلاقی حیثیت تھی۔ ادب کے ذریعے معاشرتی اصلاح ممکن تھی اور لوگ اپنی زندگیوں میں اعلیٰ اخلاقی اصولوں کو اپنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ادب کو وہ محض ایک تفریحی سرگرمی کے بجائے ایک اصلاحی آلہ سمجھتے تھے۔

'عیون الاخبار' ابن قتیبہ کی اہم تصانیف میں سے ایک ہے جو ادب اور تاریخ کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اخلاقی نصائح اور حکمت آموز حکایات شامل ہیں۔ ابن قتیبہ نے اس کتاب میں مختلف سیاسی، سماجی اور اخلاقی موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک تاریخ کو ایک ایسی اخلاقی تعلیم کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔

'ادب الکاتب' ابن قتیبہ کی دوسری اہم تصنیف ہے جو لکھنے والوں کے لیے ایک رہنما کتاب ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے زبان کی درستگی، فصاحت اور بیان کی خوبصورتی پر زور دیا ہے۔ ابن قتیبہ کے نزدیک ایک قلم کار کا کام صرف الفاظ کے انتخاب میں مہارت کا مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ اخلاقی اصولوں کی پاسداری بھی ضروری تھی۔ ان کے نزدیک قلم کار کو اپنے علمی کام میں صداقت اور اخلاقی معیارات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

'تاویل مختلف الحدیث' ابن قتیبہ کی ایک اور اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے حدیث کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ اس کتاب میں ابن قتیبہ نے اسلامی علوم میں تنقیدی فکر کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ علم کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کی درستگی اور تحقیق پر بھی توجہ دینی چاہیے۔

ابن قتیبہ کے نزدیک ادب کا ایک اہم مقصد معاشرتی اصلاح تھا۔ ان کی تصانیف میں یہ پہلو نمایاں طور پر سامنے آتا ہے کہ ادب کے ذریعے نہ صرف لوگوں کی تفریح کی جائے، بلکہ ان کی اصلاح بھی کی جائے۔ 'عیون الاخبار' اور 'ادب الکاتب' میں انھوں نے مختلف تاریخی واقعات اور حکایات کے ذریعے لوگوں کو اخلاقی اور سماجی اصلاح کے اصول بتائے ہیں۔

ابن قتیبہ کے نزدیک تعلیمی نظام میں ادب کا

کردار نہایت اہم تھا۔ ان کے نزدیک ادب ایک ایسا فریم ورک تھا جس کے ذریعے تعلیمی اور اخلاقی اصولوں کی تربیت دی جاسکتی تھی۔ ابن قتیبہ نے اس بات پر زور دیا کہ علم کا مقصد صرف ذہنی مشقت نہیں، بلکہ اخلاقی تربیت بھی ہے۔

ابن قتیبہ کی علمی اور ادبی خدمات کا سب سے اہم پہلو ان کا عربی نثر پر گہرا اثر ہے۔ ان کی تصانیف نے عربی ادب کو ایک نیا رخ دیا، خاص طور پر نثر کی روایت کو مضبوط کیا۔ عربی ادب کے عہدِ زریں میں ان کی تصانیف کو بے حد سراہا گیا اور ان کے کاموں نے بعد میں آنے والے مصنفین، ادبا اور دانشوروں کو متاثر کیا۔ ابن قتیبہ نے ادب کو صرف جمالیات تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے سماجی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ان کا اسلوب سادہ، عام فہم اور پراثر تھا، جس نے انہیں عوام میں بھی مقبول کیا۔

ان کی تحریریں ادب کے مختلف شعبوں پر محیط تھیں، جس میں تاریخ، فقہ، اخلاقیات، اور تعلیم شامل تھے۔ ان کی تصانیف نے اسلامی دنیا میں علمی مکالمے کی روایت کو فروغ دیا، اور ان کے ادبی وفکری کاموں کو علمی دنیا میں ایک مستقل مقام ملا۔ 'ادب الکاتب' میں ان کے بیان کردہ اصولوں نے نہ صرف اس زمانے کے لکھنے والوں کو متاثر کیا، بلکہ آج کے دور میں بھی ان کے نظریات کو ادب کی تعلیم وتدریس میں ایک بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابن قتیبہ کی فکر اور نظریات آج کے جدید دور میں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی کہ ان کے اپنے وقت میں تھی۔ موجودہ دور میں، جہاں ادب، تاریخ، اور فلسفہ کی فکری بنیادیں تبدیلیوں کا سامنا کررہی ہیں، ابن قتیبہ کے تصورِ ادب کی اخلاقی اور سماجی حیثیت کا احیا اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی تحریریں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ادب اور علم کا اصل مقصد انسانیت کی اخلاقی تربیت ہے اور معاشرتی بھلائی کے لیے اسے ایک ذریعہ بنایا جانا چاہیے۔

ابن قتیبہ کا زور ہمیشہ علمی اصولوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی معیارات پر بھی رہا ہے۔ آج کے دور میں جب ادب کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، ابن قتیبہ کی فکر ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ادب کی ایک سماجی اور تعلیمی ذمے داری بھی ہے۔ ان کی تصانیف ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے ادب کو استعمال کیا جانا چاہیے اور یہ کہ ادب کا مقصد لوگوں کو اخلاقی تعلیم دینا بھی ہے۔

ابن قتیبہ کے نظریات موجودہ علمی وادبی معاشرے میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ علمی وادبی دنیا میں جب سماجی اور اخلاقی مسائل پر غور کیا جاتا ہے تو ابن قتیبہ کے نظریات کو رہنما کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کو صرف زبان کی ترقی کے لیے نہیں، بلکہ سماجی ترقی کے لیے بھی ایک اہم وسیلہ سمجھا جانا چاہیے۔

آج کے تعلیمی نظام میں ابن قتیبہ کی فکر کو اپنانا اور اسے علمی معاشروں میں نافذ کرنا تعلیمی نظام کی بہتری کا باعث بن سکتا ہے۔ ان کے تصورات اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں کہ تعلیمی نصاب میں ادب کی اخلاقی اور تعلیمی اہمیت کو مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے، تاکہ طلبا نہ صرف علمی مہارت حاصل کریں، بلکہ اخلاقی طور پر بھی مضبوط ہوں۔

جدید دنیا میں، جہاں ادب کے مختلف پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے، ابن قتیبہ کی فکر ہمیں ادب کے ساتھ اخلاقیات کے گہرے تعلق کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ انھوں نے ادب کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا جو معاشرتی اقدار کو فروغ دینے اور سماجی تبدیلیاں لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج کے دور میں، جب ادب کو ایک ثقافتی اور سیاسی آلے کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے، ابن قتیبہ کا تصورِ ادب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ادب کو اخلاقیات اور سماجی فلاح کے لیے بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

ابن قتیبہ کے نزدیک ادب کی تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو فرد کی شخصیت کو نکھارتا ہے اور اسے معاشرتی و اخلاقی معیارات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ آج کے دور میں بھی، جب کہ دنیا مختلف سماجی اور سیاسی مسائل کا سامنا کررہی ہے، ابن قتیبہ کی فکر ایک رہنما کے طور پر سامنے آتی ہے اور ہمیں ادب کی اخلاقی اور تعلیمی ذمے داریوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

آج کے دور میں بھی ابن قتیبہ کی فکر اور نظریات ادب کے میدان میں ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ ادب کا مقصد نہ صرف تفریح فراہم کرنا ہے، بلکہ معاشرتی اصلاح اور اخلاقی تربیت کرنا بھی ہے۔ ابن قتیبہ کا تصورِ ادب آج کے جدید دور میں بھی ایک ایسی روشنی فراہم کرتا ہے جو ہمیں ادب کے اصل مقصد کو سمجھنے اور اس کے ذریعے معاشرتی بھلائی کو فروغ دینے میں معاون بن سکتی ہے۔

ابن قتیبہ کے ادب اور اخلاقیات پر مبنی نظریات آج بھی اسی طرح اہمیت رکھتے ہیں جیسا کہ ان کے اپنے وقت میں تھے۔ ان کی تحریریں اور نظریات علمی و ادبی دنیا میں ادب کے مقام و مرتبے کو نہ صرف واضح کرتے ہیں، بلکہ اس کے ذریعے معاشرتی اور اخلاقی فلاح و بہبود کو بھی فروغ دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

حوالہ جات

1 عبداللہ ابن قتیبہ: عیون الاخبار، بیروت: دارالکتب العلمیہ، 1986
2 عبداللہ ابن قتیبہ: ادب الکاتب، تحقیق: محمد التنجی، بیروت، دارالفکر، 1996
3 عبداللہ ابن قتیبہ: تاویل مختلف الحدیث القاہرۃ: دارالکتب العلمیۃ 2006
4. Kennedy, Hugh :The Early Abbasid Caliphate: A Political History , London: Croom Helm, 1981.
5. Lecomte, Gérard. "Ibn Qutaybah." : Encyclopaedia of Islam, Second Edition, edited by P. Bearman, Th. Bianquis, C.E. Bosworth, E. van Donzel, and W.P. Heinrichs. Leiden: Brill, 1986.
6 محمد عابد: اسلامی فکر میں ادب کا مقام، دارالعلم، کراچی 2010
7. Rosenthal, Franz : Knowledge Triumphant: The Concept of Knowledge in Medieval Islam , Leiden: Brill, 1970.
8. Lyons, Jonathan : The House of Wisdom: How the Arabs Transformed Western Civilization , New York: Bloomsbury Press, 2009.
9. Ashtiany, Julia, et al., editors. :Abbasid Belles Lettres (The Cambridge History of Arabic Literature). , Cambridge University Press, 1990

■

Mohammad Shahbaz Alam
Dept of Arabic
Sitalkuchi College, Sitalkuchi
Cooch Behar- 736158 (West Bengal)
Mob.:9064502370
shahbazslkc@gmail.com

علی زاہد ملک

اردو زبان و ادب پر فارسی کے اثرات

ہندوستان کی مقامی زبانوں اور فارسی کے امتزاج سے نئی زبان یعنی اردو کا وجود عمل میں آیا لیکن فارسی کے اثرات نہ صرف زبان تک محدود رہے بلکہ اس نے انسانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ مثلاً ہندوستانی ناموں کے بجائے ایرانی ناموں کا رواج عام ہونے لگا، کھانے پینے کی اشیا کے نام، رشتوں کے نام، متعدد جگہوں کے نام، پھولوں اور پھلوں کے نام، اعضائے بدن، اسمائے بلاد و رجال، سواری اور سفر میں کام آنے والی اشیا کے اسما، ہندوستانی پیشہ و پیشہ وروں، عہدوں، عدلیہ و قانونی اصطلاحات، موسیقی، تعمیراتی، معماری، تحریری اور کتابی اصطلاحات وغیرہ بھی ایرانی طرز پر استعمال ہونے لگیں۔ پروفیسر نذیر احمد[1] نے اپنے مقالے میں ہندوستانی نام جو فارسی سے مستعار ہیں، پر نہ صرف تفصیلی بحث کی ہے بلکہ ان اسما کی ایک طویل فہرست بھی پیش کی ہے۔ ذیل میں چند اسما بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

پرویز، دلنواز، آفتاب، ماہتاب، شاہنواز، شہریار، اورنگزیب، جمشید، خورشید، فیروز، شیر خان، بہادر شاہ، دریا خان، خسرو، منیژہ، ناہید، نسرین، زینب، صغریٰ، نوشین، شاہین، زرینہ، فرزانہ، نور جہاں، دردانہ، فاطمہ، آذرمیدخت، پروین، نسیم، وغیرہ۔

اسی طرح اردو میں انسانی اعضائے بدن کے اسما بھی فارسی سے مستعار ہیں۔ مثلاً: پیشانی، ناخن، خون، سینہ، دل، پلک، بازو، خون، پنجہ، گردن، کمر، سر، زبان، حلق، آبرو، مژگان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غذا اور خوراک وغیرہ کے اسما: گوشت، سبزی، نان، چپاتی، قیمہ، کوفتہ، دسترخوان، نہاری، یخنی، شیر، بریانی، دم پخت، حلیم، قورمہ، دوپیازہ، زردہ، پلاؤ، فالودہ وغیرہ۔

رشتے و رشتے داروں کے نام: داماد، باجی، بابا، برادر، زوجہ، شوہر، پھوپھی زاد، خالہ، خالو، برادر نسبتی، ہمشیرہ چچازاد، خالہ زاد وغیرہ۔

ہندوستانی خطابات: سالار جنگ، بہادر جنگ، آصف جنگ، شمشیر جنگ، خان بہادر، رائے بہادر، اور یاور جنگ وغیرہ۔

ہندوستانی لباس وغیرہ کے متعلقات: عمامہ، پاجامہ، زیر جامہ، چار جامہ، پوشاک، جراب، موزہ، شیروانی، کف، شلوار، قمیص، ازار بند، سینہ بند، عبا، قبا، مخمل، پشمینہ، دامن، عرض، خیمہ، زربفت وغیرہ۔

ہندوستانی پھلوں کے نام: سیب، انار، انگور، امرود، ناشپاتی، خوبانی، شریفہ، بادام، خربوزہ، تربوزہ، ہندوانہ، توت، شہتوت، کشمش وغیرہ۔

ہندوستانی پیشہ وروں کے متعلقات: حلوائی، درزی، حجام، نانبائی، باورچی، قصاب، گورکن، کتاب فروش، سبزی فروش، ملاح، حلال خور، زرگر، شتربان، گاڑی بان، پیلبان، قصاب، خانساماں بزاز وغیرہ۔

کھیتی اور زراعت کے متعلق: زمیندار، زمینداری، کاشتکاری، کاشتکار، گندم، زاید، ربیع، فصل وغیرہ۔

جگہوں کے نام: احمد آباد، حسن آباد، حیدر آباد، فیروز آباد، شاہجہاں آباد، الہ آباد، غازی آباد، فرخ آباد، فیض آباد، محمود آباد، شمس آباد، احمد پور، شاہجہاں پور، حسن پور، جونپور، مرزاپور، کانپور، محمد پور وغیرہ۔

گھر وغیرہ کے متعلقات: نعمت خانہ، غریب خانہ، دروازہ، دہلیز، برآمدہ، غسل خانہ، پاخانہ، چبوترہ، کرسی، تخت، چارپائی، دالان، طاق، باورچی خانہ وغیرہ۔

زیور اور خوشبو کی چیزوں کے نام: بازو بند، کمر بند، پابند، گلوبند، ہار، دست بند، انگشتری، پازیب، عطر، مشک نافہ، عنبر، زعفران وغیرہ۔

عدالتی اور قانونی اصطلاحات: کاتب، گواہ، ملزم، شہادت، گواہی، الزام، وکیل، مؤکل، وکالت، وکالت نامہ، بیعنامہ، رہن نامہ، عدالت، قانون، مدعی، مدعا علیہ، منصفی، دیوانی، سزا، جرمانہ، ثبوت، حاضر، حاضری، دستاویز وغیرہ۔

تحریر و کتابت کی اصطلاحات: قلم، دوات، سیاہی، روشنائی، کتاب، کاغذ، خط، املا، دستخط، سرورق، پشت، دیباچہ، مقدمہ، باب، سرخی، کتابت، جلد، متن، حاشیہ، فصل، سطر، طالب علم، استاد، درس، مشق، وغیرہ۔

سواری اور سفر کے سلسلے کے الفاظ: رکاب، رکابدار، زین، نعل، نعل بندی، راہ، میل، سوار، سواری، دور، نزدیک، راہ گیر، پیادہ، لگام وغیرہ۔

ہندوستانی گالیوں کے کلمات: بدمعاش، حرام زادہ، بے شرم، آوارہ، بے حیا، کمینہ، بدذات، بیہودہ، احمق، بدبخت بدنصیب، بے شعور وغیرہ۔

تحسین کے کلمات: شاباش، زندہ باد، سبحان اللہ وغیرہ۔

اردو زبان میں فارسی کے اس قدر کثیر التعداد الفاظ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس قدر اس زبان نے اردو کو متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو کی شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو گی جو فارسی الفاظ کی آمیزش سے خالی ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ اردو زبان و ادب پر خالص فارسی کا ہی اثر نہیں ہوا

بلکہ فارسی کی بدولت عربی اور ترکی الفاظ بھی اردو میں شامل ہوگئے۔ لیکن اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کو سب سے زیادہ فارسی زبان نے ہی متاثر کیا۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر عصمت جاوید اپنی کتاب 'اُردو پر فارسی کے لسانی اثرات' کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں:

''اگر چہ دنیا کی دیگر مخلوط زبانوں کی طرح اردو میں بھی کئی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں... لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اردو نے ایک زبان اور صرف ایک زبان کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے اور وہ زبان ہے فارسی۔ یہ وہ فارسی ہے جو عربی سے اپنا خزانہ بھر چکی تھی۔ اس لیے اردو نے جہاں خود اس زبان سے بیشتر الفاظ قبول کیے وہیں اس کے راستے سے کچھ ترکی اور اکثر و بیشتر عربی الفاظ بھی اردو میں داخل ہوگئے... فارسی سے ہماری مراد ''فارسی بحت یا فارسی باستان'' سے نہیں بلکہ اُس اسلامی فارسی سے ہے، جس پر عربی کی گہری چھاپ ہے''2

فارسی نے صرف اردو زبان پر ہی نہیں بلکہ اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو کی تمام اصناف سخن یا تو براہ راست فارسی سے مستعار ہیں یا اگر عرب کی تخلیق ہیں تب بھی فارسی کے ذریعے ہی اردو میں داخل ہوئیں۔ مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی وغیرہ کا اردو ادب میں اچھا خاصا رواج ہے لیکن یہ اصناف بھی فارسی کے توسل سے ہی اردو میں داخل ہوئیں۔ ان اصناف کا طرز تحریر، تشبیہات واستعارات بلکہ اکثر و بیشتر اصطلاحات بھی فارسی سے ماخوذ ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں امیر خسرو دہلوی کو اردو شاعری کا بابائے آدم سمجھا جاتا ہے۔ ان کے یہاں فارسی تشبیہات و استعارات کے علاوہ متعدد غزلیات کے پورے پورے مصرعے فارسی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔3

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑیے، سنوریے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

خسرو کی ایک اور غزل جو آج بھی اپنی شہرت کا لوہا منوائے ہوئے ہے، اس طرز کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔4

> اردو زبان میں فارسی کے اِس قدر کثیر التعداد الفاظ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس قدر اس زبان نے اردو کو متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو کی شاید ہی کوئی ایسی تحریر ہو جو فارسی الفاظ کی آمیزش سے خالی ہو۔

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دو راہ نیناں بلائے بتیاں
چو تاب ہجراں ندارم ای جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بعشق آں مہ
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں
بحق آں مہ کہ روزِ محشر بداد مارا فریب خسرو
پست من کی دورا ہے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

اسی طرح اگر اردو کے کسی بھی شاعر کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ فارسی شعرا کی پیروی کی ہے۔ نمونے کے طور پر اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کی ایک غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جس کے تقریباً ہر مصرعے میں فارسی اصطلاحات اور تشبیہات و استعارات کی چاشنی محسوس ہوتی ہے۔5

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامہ مژگاں بہ خونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

مذکورہ غزل کے علاوہ دیوان غالب میں فارسی الفاظ، اصطلاحات، تراکیب، تشبیہات و استعارات سے بھرا پڑا ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

غالب کے علاوہ میرتقی میر، مصحفی، حالی، اور علامہ اقبال وغیرہ کی شاعری میں بھی فارسی الفاظ بلکہ تراکیب، اصطلاحات، تشبیہات واستعارات کی بھرمار ہے۔ اردو شعرا نے فارسی شعرا کی پیروی کرتے ہوئے ان کی ہی اصطلاحات کو اپنی شاعری میں استعمال کیا مثلاً کاغذین جامہ یا کاغذین پیرہن عجز وانکساری کی علامت ہے۔ یہ وہ لباس ہوتا ہے جسے فریادی پہن کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں اور بادشاہ ان کی خستہ حالی پر ترس کھا کر انھیں کچھ نوازتا ہے لیکن شاعری میں فریادی سے مراد عاشق اور بادشاہ سے مراد معشوق ہوتا ہے۔ یہاں عاشق کی حالت زار کو دیکھ کر محبوب ترس کھاتا ہے اور اسے وصل کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔ فارسی شاعری میں کاغذین جامہ یا پیرہن کی اصطلاح بہت معروف ہے، جسے خاقانی شیروانی، کمال اسماعیل اور حافظ شیرازی نے اپنے اشعار میں نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ خاقانی اور حافظ شیرازی کا ایک ایک شعر نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس میں اس اصطلاح کا استعمال ہوا ہے۔

حاسدانم چون ہدف بین کاغذین جامہ کہ من
تیر شحنہ از پی امن شبان آوردہ ام
—خاقانی

کاغذین جامہ بہ خونابہ بشویم کہ فلک
رہ نمونیم بپای علم داد نکرد
—حافظ

اردو شعرا نے بھی اس اصطلاح کو اپنے اشعار میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں غالب کے دو اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جن میں فارسی شعرا کی پیروی کرتے ہوئے اس اصطلاح کو نہایت ہی خوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے:6

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا
پہنے ہے پیرہن کاغذ ابر نیساں
یہ تنک مایہ ہے فریادیِ عبرتِ ایثار

اردو شاعری میں اس طرح کی مثالیں اکثر و بیشتر شعرا کے کلام میں ملتی ہیں۔ شاعری کے علاوہ اردو نثر پر بھی فارسی زبان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ فارسی نثر میں مسجع و مقفیٰ عبارت کے ابتدائی نقوش خواجہ عبداللہ انصاری اور سعدی شیرازی کی نثری تصانیف میں ملتے ہیں۔ اِس طرزِ تحریر پر بعد کے نثر نگاروں نے بھی طبع آزمائی کی جو اِن کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ آگے چل کر اردو کے ادیبوں نے بھی اس روش کی پیروی کی جس کی بدولت اردو نثر میں بھی اس کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً ملا وجہی کی تصنیف 'سب رس' اردو کی پہلی داستان جو مسجع و مقفیٰ عبارت کی بہترین مثال ہے۔ اِس اسلوبِ نگارش سے ہٹ کر اردو نثر کی متعدد ایسی عبارتیں بھی ملتی ہیں جن میں اردو کے بجائے فارسی الفاظ کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اردو نثر کے کئی شہ پاروں کے شروع یا آخر میں اردو کے چند الفاظ کا استعمال ہوا ہے اور بقیہ عبارت میں فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ اس قسم کی تحریروں میں میر تقی میر کی ایک نثری عبارت کا کچھ حصہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس میں اکثر و بیشتر فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے:7

''ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالےٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیرین سخن ہو، پس یہ چند مصرعے کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ رو زبان انہی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے، لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کرون تا زبانی ان اشخاص کے ہمیشہ موردِ تحسین و آفرین رہوں''

اسی طرح غالب کے خطوط میں بھی جہاں ایک طرف فارسی الفاظ کی بوچھاڑ ہے تو وہیں ان کے بیشتر خطوط میں فارسی اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ اشعار سے قطع نظر ایک خط کی چند سطور بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں، جن میں نہ صرف فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے، بلکہ مقفیٰ نثر کی چاشنی بھی محسوس ہوتی ہے:8

''اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے خدمت خدام مخدوم خادم نواز میں بعد تسلیم معروض ہے۔ تفقد نامۂ نامی میں صورت عز و شرف نظر آئی۔ اللہ اللہ تم نے میری نظر میں میری آبرو بڑھائی۔ حضرت کی قدردانی کی کیا بات ہے۔ آپ کا التفات موجب مباہات ہے۔ یہ بات بطریق طی اللسان زبان پر آئی ہے ورنہ قدردانی کیسی یہ قدر افزائی ہے۔ نظیری علیہ الرحمۃ کا شعر ایک کاغذ پر لکھ کر میرے گلے میں ڈال دیجیے اور زمرۂ شعرا میں سے مجھ کو نکال دیجیے۔''

اسی طرح مرزا مظہر جانِ جاناں کی خدمت میں انشاء اللہ خان انشا کی ایک درخواست سے اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس میں فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے:9

'' ابتدائے سن صبا سے اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبہ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔''

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فارسی نے نہ صرف اردو زبان کو بلکہ اردو ادب کے ہر شعبہ کو متاثر کیا ہے۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو فارسی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ممکن ہے ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب کے پیش نظر بھی یہی وجوہات رہی ہوں جن کی بنا پر انہوں نے اپنی کتاب زبان فارسی کا اثر زبان اردو پر، اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:10

''فارسی نے اردو پر اپنا اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اس کو بالکل ہی مغلوب کر لیا اور دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو گئے اور اردو کی صرف و نحو اور قواعد کی کتابیں بھی فارسی طرز پر لکھی گئیں''

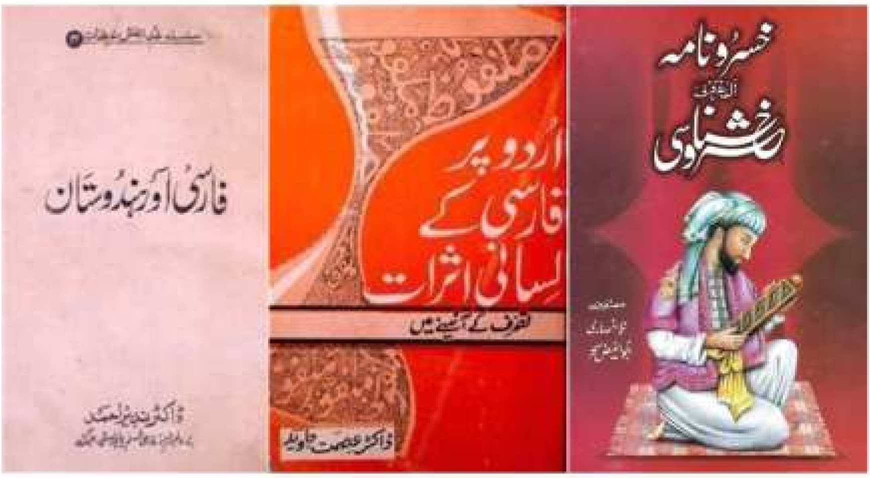

حواشی

1 فارسی اور ہندوستان ،ڈاکٹر نذیر احمد،خدا بخش خطبات 1974،ص9-16

2 مقدمہ اردو پر فارسی کے اثرات، ڈاکٹر عصمت جاوید، مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول سداشیو پیٹھ۔ پونا،1987،ص10

3 خسرو شناسی،مرتبین،ظ۔انصاری،ابوالفیض سحر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،1975،ص216

4 خسرو شناسی،مرتبین،ظ۔انصاری،ابوالفیض سحر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،1975،ص245

5 دیوان غالب،مرتبہ غلام رسول مہر،علی پرنٹنگ پریس لاہور۔1967،ص289-90

6 دیوان غالب، مرتبہ غلام رسول مہر،علی پرنٹنگ پریس لاہور۔1967،ص20

7 زبان فارسی کا اثر زبان اردو پر،ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی،1954،ص27

8 ادبی خطوط غالب: جناب مرزا محمد عسکری صاحب، نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ،1929،ص32

9 زبان فارسی کا اثر زبان اردو پر،ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی،1954،ص27

10 ایضاً،ص6-7

■
Ali Zahid Malik
Research Scholar, Dept of Prsian
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9797552503
zahidamu93@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے، جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

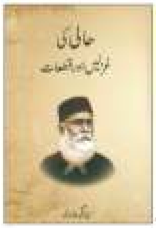

حالی کی غزلیں اور قطعات

مرتب: سید تقی عابدی

صفحات: 185، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد اشرف یاسین، E-66، دوسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی 25

اردو زبان وادب میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی (1914-1837) کی حیثیت کئی اعتبار سے اہم اور ممتاز ہے۔ انھوں نے شاعری، تنقید اور سوانح نگاری جیسی اہم اصناف میں طبع آزمائی کی، جبکہ تنقید اور سوانح نگاری سے انھیں زیادہ شہرت ملی۔ انجمن پنجاب کے چار مناظموں میں شریک ہوکر مولانا حالی نے نئی نظم اور نیچرل شاعری کی سمت ورفتار متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ مسدس حالی (مدوجزر اسلام) لکھ کر مسلمانوں کو اپنے احتساب پر آمادہ کرنے کی مستحسن کوشش کی۔ ہماری کلاسیکی شاعری کے یہ واحد ایسے شاعر ہیں، جنہوں نے اپنے دیوان میں شامل سبھی اشعار پر (ج) جدید اور (ق) قدیم جیسی علامت لگا کر اپنے سبھی مطبوعہ کلام کی خود ہی نشان دہی کر کے ناقدین کو اس سمت میں محنت ومشقت اور تلاش وتحقیق کرنے سے بچا لیا۔

زیر تبصرہ کتاب 'حالی کی غزلیں اور قطعات' اردو زبان وادب کے معروف محقق، ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مرتب کردہ ہے۔ کلاسیکی ادب کی تحقیق وترتیب میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام ممتاز اور نمایاں ہے۔ اس کتاب کو چند عنوانات اور تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حالی کی غزلیہ شاعری پر باضابطہ گفتگو کرنے سے پہلے ان کی تصویر، تحریر کا عکس، سر سید احمد خان (1898-1817) سے ان کے تعلقات پر مبنی ایک خط، شجرۂ نسب اور ان کی حیات وشخصیت کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کا پہلا باب 'غزلیاتِ اردو' پر مشتمل ہے۔ باب کے شروع میں فاضل مرتب نے 'حالی کی غزل گوئی' کے عنوان سے بہترین اور کارآمد گفتگو کی ہے۔ جس میں قدیم دور (1874-1863) کی 30، جدید دور (1893-1874) کی 86، آخری دور (1914-1893) کی 07 مکمل اور 03 نامکمل غزلیں شامل ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ حالی کی کل غزلوں کی تعداد 123 ہے۔ اور ان میں موجود اشعار کی تعداد 1,261 ہے۔ (بحوالہ، حالی کی غزل گوئی، صفحہ نمبر 02)، جبکہ حالی کے کل اردو اشعار کی تعداد 8518، فارسی اشعار کی تعداد 687، عربی اشعار کی تعداد 115 ہے اور ان کے مطبوعہ اشعار کی تعداد 9320 ہے۔ (بحوالہ، مولانا حالی کی حیات اور شخصیت، صفحہ نمبر lxiv)

دوسرا باب 'قطعات' (1893-1874) پر مبنی ہے۔ اس میں بھی حالی کے قطعات سے پہلے 'حالی کے قطعات کا اجمالی تجزیہ' جیسے عنوان کے تحت گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید تقی عابدی لکھتے ہیں۔ ''حالی نے مختلف موضوعات پر 67 قطعات لکھے ہیں۔ یہ سارے قطعات مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ قطعات کے مجموعی اشعار کی تعداد 470 ہے۔ سب سے طولانی قطعے میں 21 شعر اور سب سے چھوٹے قطعے میں 2 شعر ہیں۔'' (بحوالہ، حالی کے قطعات کا اجمالی تجزیہ، صفحہ نمبر 93)، اس باب میں حالی کے قطعات موضوعات کے لحاظ سے درج کیے گئے ہیں۔ جیسے 7 تنقیدی قطعات، 8 سیاسی، 19 معاشرتی واصلاحی، 20 طنزیہ ومزاحیہ، اور 13 قطعات، حکایات ومطائبات پر مبنی ہیں۔ اس طرح سے ان قطعات کی مکمل تعداد 67 ہو جاتی ہے۔

کتاب کا تیسرا اور آخری باب 'قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے مقتبس از قرآن'

ہے۔ قطعۂ تاریخ دراصل ایک مشکل لیکن دلچسپ فن مانا جاتا ہے۔ شادی بیاہ، ولادت، کتابوں کی تصنیف، بادشاہوں کی تخت نشینی، فتوحات، خطاب یابی، منصب پر ماموریت اور عمارت کی تعمیر وغیرہ گویا ہر طرح کے اہم واقعات کے سال کو محفوظ رکھنا اس فن کا مقصد ہے۔ اس فن کے ذریعے تاریخ گو ایسا مصرعہ، جملہ یا فقرہ ترتیب دیتا ہے، جس کے حروف کے اعداد جوڑنے سے اس سال کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ جس برس وہ اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایسے مصرعے، جملے یا فقرے کو 'مادۂ تاریخ' کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے تقریباً تمام نامور اور قادر الکلام شعرا نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے۔

مجھے اس کتاب کی سب سے خاص بات یہ لگی کہ حالی کے کلام میں استعمال ہونے والے مشکل اور کلیدی الفاظ کے لیے ہر باب کے آخر میں 'حواشی' کے تحت ان کی تشریح اور توضیح درج کردی گئی ہے، جس سے کتاب کی اہمیت و افادیت دو چند ہوگئی ہے۔ یہ توضیح طلبا اور اساتذہ کے لیے یکساں مفید ہے۔ مجموعی طور پر حالی کی غزلیہ شاعری کی تفہیم کے لیے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ حالی کی نظمیں دلچسپی سے پڑھنے والوں کو ان کی نظموں سے متعلق ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مرتب اور قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی سے شائع کردہ دوسری کتاب کا بھی ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ تاکہ جدید تحقیق کی روشنی میں ہم حالی کے مکمل کلام سے واقف ہوسکیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ کتاب بھی ڈاکٹر سید تقی عابدی کی سابقہ کتابوں کی طرح قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

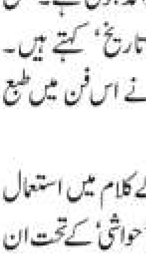

آئینِ ہند : اَن کہی کہانی

مصنف: رام بہادر رائے، مترجم: جاوید عالم

صفحات: 624، قیمت: 340 روپے، سنہ اشاعت: 2024

مبصر: نایاب حسن، A/22، سیما اپارٹمنٹ (گراؤنڈ فلور)، گلی نمبر 7، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

آزاد ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے کی کئی جہتیں ہیں، ان میں سے ایک اہم جہت یہ ہے کہ ہندوستانی آئین کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ 26 جنوری 1950 سے ہندوستان میں جو دستور زیرِ عمل ہے، اس کی تشکیل کا پروسیس کیا رہا؟ اسے کیسے بنایا گیا؟ کن لوگوں کا اس میں اہم کردار تھا؟ کب اس آئین سازی کی شروعات ہوئی؟ کتنے دنوں میں یہ آئین موجودہ شکل میں مکمل ہوا؟ اس کا اصل متن کس نے تیار کیا؟ کون اس مجلس دستور ساز کی صدارت یا سربراہی کر رہا تھا؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر دستورِ ہند کے 'نرماتا' یعنی خالق ہیں، مگر کیا حقیقت بھی یہی ہے؟ کیا یہ دستور اوریجنل تخلیق ہے یا اسے بنانے میں اس وقت موجود دنیا کے مختلف ملکوں کے دساتیر سے استفادہ کیا گیا ہے؟ کیا یہ آئین 1935 کی برطانوی حکومت کی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی کاپی ہے؟ اس کا بنیادی اسٹرکچر کیا ہے؟ اس کی تمہید کا مفہوم کیا ہے اور کیا یہ اول دن سے اسی شکل میں ہے یا اس میں کبھی تبدیلی بھی کی گئی ہے؟ اس آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی وکالت کس حد تک کی گئی ہے اور وہ حقوق کیا ہیں؟ دستور ساز اسمبلی میں کتنے ممبران تھے اور کیا اس آئین کا اجرا تمام ممبران کے اتفاق سے ہوا تھا؟ دستور ساز اسمبلی میں جب آئین کی تشکیل پر بحثیں ہورہی تھیں، تو اقلیتوں کے مسائل کو کس طرح ایڈریس کیا گیا؟ یہ اور اس موضوع سے متعلق مزید درجنوں سوالات کے نہایت دلچسپ اور معلومات افزا جوابات کے لیے مسٹر رام بہادر رائے کی کتاب 'آئینِ ہند: ان کہی کہانی' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

'آئینِ ہند: ان کہی کہانی' اصلاً ہندی زبان میں ہے اور اس کا نام 'بھارتیہ سنودھان: ان کہی کہانی' ہے، اوریجنل ورژن کی اشاعت 2022 کے وسط میں عمل میں آئی تھی اور اس کی تقریبِ اجرا میں وزیر اعظم مودی بھی آن لائن شریک تھے، انھوں نے تقریر بھی کی تھی، جو اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے، مترجم جاوید عالم ہیں۔ ترجمہ من حیث المجموع خوب صورت، سلیس اور رواں ہے۔

کتاب کی علمی اہمیت یہ ہے کہ اوپر ہم نے آئین ہند سے متعلق جو سوالات قائم کیے ہیں، اس میں ان سبھی کے جوابات ملتے ہیں اور اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ کے ان پہلوؤں سے آگاہی ہوتی ہے، جو واقعتاً اَن کہے ہیں یا جن کے بارے میں اس ملک کے زیادہ تر لوگ بالکل نہیں جانتے۔ رائے صاحب کی یہ کتاب خصوصاً آئین کی تشکیل کے تمام تر مرحلوں پر حقائق، دلائل اور شواہد کی روشنی میں نہایت معلومات افزا گفتگو کرتی ہے۔ جب آئین ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی، ان دنوں کے سیاسی حالات بھی ضمناً زیر بحث آئے ہیں اور اس پہلو پر بھی مصنف نے اچھی گفتگو کی ہے کہ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں کیوں شریک نہیں ہوئی، اس کے تحفظات کیا تھے اور کیا کانگریس کی کسی غلطی کا بھی اس میں رول تھا؟ پھر دستور ساز اسمبلی کی میٹنگوں کے دوران اس کے ممبران نے جو بحثیں کیں، آئین کے مختلف نکات پر ان کے درمیان جو باتیں ہوئیں، اس اسمبلی کے اہم ارکان کے مابین اسمبلی کی میٹنگوں کے اندر اور باہر اس حوالے سے جو تبادلۂ خیالات ہوتے رہے اور اسی دوران ملک جس رخ پر جارہا تھا اور برطانوی حکومت ہندوستانی عوام کے لیے جو منصوبہ بندی کررہی تھی؛ اس سب پر رام بہادر رائے نے بہت پرمغز مکالمہ قائم کیا ہے۔ اس دستور کی تشکیل میں گاندھی جی کا کیا رول ہے اور کیا اس میں گاندھیائی نظریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے؟ اس اہم سوال کا جواب بھی ہمیں اس کتاب میں ملے گا۔ پوری کتاب کے صفحات تو 624 ہیں، مگر اصل کتاب صفحہ نمبر 580 پر مکمل ہوجاتی ہے، بقیہ صفحات میں 1765 سے لے کر 2019 تک آئین سے متعلق واقعات کے سلسلہ وار اشارے ہیں۔ جب آئین کا مسودہ تیار ہوگیا، تو مسودہ کمیٹی کے سربراہ ڈاکٹر امبیڈکر نے 4 نومبر 1948 کو دستور کا فائنل مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا، اس کی تعریف و تعارف میں ایک لمبی تقریر کی اور اس کے بعد نومبر 1949 تک اس کے تمام پہلوؤں پر ممبران کی بحثیں ہوتی رہیں۔ اس کتاب میں صفحہ نمبر 321 سے 556 تک ان ممبران کی تقریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جب آئین کا مسودہ تیار ہوگیا، تو ابتدائی مرحلے میں اس میں ترمیم کی 7635 تجویزیں آئی تھیں، جن میں سے صرف 2473 تجویزوں پر غور کیا گیا، اسی طرح آئین کا پہلا مسودہ 243 دفعات اور 13 شیڈول پر مشتمل تھا، جو غور وخوض اور اضافوں کے بعد 395 دفعات اور 8 شیڈول میں بدل گیا۔ اسی طرح اس آئین کے 395 میں سے ڈھائی سو آرٹیکل حرف بہ حرف وہی تھے، جو 1935 میں

برطانوی کابینہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی شکل میں پاس کیا تھا۔ جب آئین کے مسودے کو فائنل ریڈنگ کے لیے دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا، یعنی اب اختتامی بحثوں کے بعد اسے پاس کیا جانا تھا، تو گو کہ بہت سے ممبران پہلی میٹنگوں میں بول چکے تھے، مگر اس مجلس میں بھی 299 میں سے 125 ممبران نے بولنے کے لیے صدر مجلس (ڈاکٹر راجندر پرساد) کی طرف پرچیاں بڑھادیں۔ اس کتاب میں ستر سے زائد ایسے ممبران کی تقریروں کے اقتباسات درج ہیں اور زیادہ تر تقریروں میں مختلف حوالوں سے آئین پر اعتراضات کیے گئے ہیں، اس کی خامیوں کو اجاگر کیا گیا ہے، جن لوگوں نے اس کی حمایت کی ہے، انھوں نے بھی مانا ہے کہ تشکیلی دور میں خامیوں کا رہ جانا ناگزیر ہے اور آنے والی نسلیں یا ہندوستان کی سرکاریں انھیں دور کرلیں گی۔

مصنف کا ماننا ہے کہ اسی بنیاد پر شروع سے ہی آئین میں ترمیم اور ردو بدل کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ رائے صاحب اس کتاب کے آخر میں دن اور تاریخ کی تعیین کے ساتھ بتاتے ہیں کہ کب کس نیتا یا دانشور نے آئین کی اصلاح یا تبدیلی کی بات کی یا اس پر لکھا حتی کہ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ 1987 میں گیان یگ آشرم نامی تنظیم نے ہندوستان کا ایک متوازی آئین بنایا تھا، اسی طرح اے بی وی پی کے مدھیہ پردیش چیپٹر نے 1998 میں 'نئے آئین کا خاکہ' شائع کیا تھا۔ اس سے پہلے دستور سازی کے دنوں میں بھی مانویندر ناتھ رائے نے 1944 میں ایک 'آزاد بھارت کا آئین' تیار کیا تھا، جبکہ جنوری 1946 میں شریمن نارائن اگروال نے 'آزاد ہندوستان میں گاندھیائی نظریات کا ہندوستانی آئین' بنایا تھا، اس کا دیباچہ گاندھی جی نے لکھا تھا۔ (ص:512)

دستور ساز اسمبلی میں ممبران کی تقریروں کے اقتباسات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کئی ایسی چیزوں کے بارے میں تشویش تھی جنھیں ان کے مطابق آئین میں کما حقہ جگہ نہیں ملی تھی، مثلاً بہت سوں کا اعتراض تھا کہ دیہات کو اس آئین میں اہمیت نہیں دی گئی، جبکہ زیادہ تر ہندوستانی آبادی گاؤں میں بستی ہے، پنچایتی راج کو اہمیت نہ دینے پر بھی بہت سوں کو اعتراض تھا، قومی زبان، قومی ثقافت، ہندوستان کے نام، اختیارات کے ارتکاز، بدعنوانی، پارلیمانی طرز حکومت، وحدانی بمقابلہ وفاقی ڈھانچہ، شہری حقوق، اقلیتوں کے حقوق، درج فہرست ذاتوں کے حقوق، گؤرکشا، عدلیہ، ذات پات، قومی ترانہ، وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبران کی تنخواہ وغیرہ جیسے موضوعات پر دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مصنف کی دقت نظری، تحقیقی لگن اور غیر معمولی دیدہ ریزی اس کتاب کی سطر سطر سے عیاں ہے، البتہ ایک جگہ ان سے Factual سہو ہوا ہے کہ انھوں نے بہار سے دستور ساز اسمبلی کے رکن تجمل حسین کو، جنھوں نے دستور ساز اسمبلی اور بنیادی حقوق و اقلیتوں کے حقوق پر بنائی گئی ایڈوائزری کمیٹی و سب کمیٹی کے جلسوں میں مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی پرزور مخالفت کی تھی، انھیں مسلم لیگ کا پرجوش لیڈر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے تقسیم کے بعد پاکستان جانے سے انکار کیا تھا۔ (ص:277) حالاں کہ صحیح یہ ہے کہ وہ پرانے کانگریسی تھے اور کانگریس ہی کے ٹکٹ پر دستور ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ (Personalities: A Comprehensive and Authentic Biographical Dictionary of Men who Matter in India، ص:136، مطبوعہ: ارونم اینڈ شیل 1950) اسی طرح صفحہ نمبر 277 اور 278 پر بیگم اعزاز رسول کا نام 'اعجاز رسول' بھی غلط لکھا ہوا ہے۔ نوابوں کے مشہور لوہارو خاندان سے تعلق رکھنے والی بیگم قدسیہ اعزاز رسول کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور وہ صوبجاتِ متحدہ سے منتخب ہونے والی دستور ساز اسمبلی کی واحد مسلم خاتون رکن تھیں، وہ بھی جمہوری بنیادوں پر مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کے حق میں نہیں تھیں۔

بہرکیف مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے موضوع پر غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ اردو میں ایسی کتابیں کم یاب ہیں، قومی اردو کونسل ایسی معلوماتی اور وقیع کتاب کی اشاعت کے لیے مبارک باد اور شکریے کی مستحق ہے، اس کے ترجمے کے لیے جناب جاوید عالم بھی تحسین و ستائش کے حق دار ہیں۔ رام بہادر رائے نے اس کتاب میں ہندوستان کی آئینی تاریخ پر نہایت بیش قیمت مواد جمع کردیا ہے، کتاب کا مطالعہ کرنے سے ان کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے اور ہر صفحے میں کچھ نہ کچھ نیا جاننے کو ملتا ہے، مراجع کی فہرست جو انھوں نے دی ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں انھوں نے کیسی جاں کاہی کا مظاہرہ کیا ہے، دستور ہند کی تاریخ و تشکیل کی مختلف جہات پر 67 ہندی اور 62 انگریزی کتابوں اور مصنفوں کی فہرست بذاتِ خود اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اسکالرز، اساتذہ اور طلبہ و قارئین کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ایک اہم کام انھوں نے یہ بھی کیا ہے کہ آخر میں ایک چارٹ کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے کن ممبران کے نزدیک کون سے نکات اہم تھے، جن پر انھوں نے خصوصی توجہ دی، ان پر بحث میں حصہ لیا یا ان کے حوالے سے آئین کے متعلقہ حصے میں جزوی یا کلی ترمیم کی تجویز پیش کی۔ رائے صاحب ایک کہنہ مشق رائٹر اور منجھے ہوئے صحافی ہیں؛ اس لیے ان کا اسلوب بھی بہت رواں دواں، سبک اور صاف ستھرا ہے، واقعات کی کڑیاں جوڑنے اور ان کے درمیان معنی خیز ربط پیدا کرنے میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے، اس طرح یہ کتاب مواد ہی نہیں، طرزِ پیش کش کے اعتبار سے بھی دلچسپ ہوگئی ہے۔ ہندوستان کی آئینی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے علاوہ عام علم دوست اشخاص کو بھی اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

تحقیق و تنقید

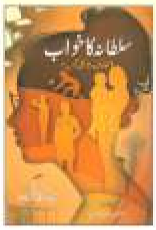

سلطانہ کا خواب: تعارف و تانیثی تجزیہ

مصنفہ: پروفیسر آمنہ تحسین، مترجمہ: ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی
صفحات: 84، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2024
مبصر: نسترن احسن فتیحی
M-43، دوسری منزل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 25

سلطانہ کا خواب: 'تعارف و تانیثی تجزیہ' ایک ایسی اہم کتاب ہے جسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ خواتین کے مطالعہ (Department of Women Studiess) کی ممتاز اسکالر پروفیسر آمنہ تحسین نے مرتب اور پیش کیا ہے۔ تانیثیت کے اسکالرشپ میں اپنی وسیع شراکت کے لیے مشہور، پروفیسر آمنہ تحسین نے اس کتاب کو رقیہ سخاوت حسین کی تانیثی فکر کو نمایاں کرنے کے لیے مرتب کیا ہے۔ رقیہ سخاوت حسین 1905 میں اپنی کہانی 'ڈریم آف سلطانہ' تصنیف کرنے والی ایک ایسی مصنفہ ہیں جن کی تحریروں میں تانیثی فکر نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ رقیہ سخاوت حسین اپنے وقت سے بہت آگے تھیں۔ خواتین کو بااختیار بنانا اور پدرانہ اصولوں کو چیلنج کرنا ان کی تحریروں کی نمایاں خوبی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی کے 'ڈریم آف سلطانہ' کا ایک نیا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جس سے 'ڈریم آف سلطانہ' کی رسائی وسیع تر سامعین تک ہوگی۔ رفیعہ شبنم عابدی کی طرف سے تحریر کردہ پیش لفظ، رقیہ سخاوت حسین کے کام کو وسیع تر تانیثیت کے دائرے میں رکھتے ہوئے نہ صرف ایک تاریخی اور ادبی سیاق وسباق فراہم کرتا ہے بلکہ کتاب کے لیے لہجے کا تعین بھی کرتا ہے۔

ابتدائی ابواب میں، پروفیسر آمنہ تحسین نے نہ صرف رقیہ سخاوت حسین کی زندگی اور کام کا تعارف پیش کیا ہے بلکہ 'سلطانہ کا خواب' کا تفصیلی تانیثی تجزیہ بھی فراہم کیا ہے۔ یہ تجزیہ تانیثیت کے نظریے سے جڑا ہوا ہے، جو ان طریقوں کا جائزہ لیتا ہے جن میں ادب صنفی عدم مساوات کی عکاسی اور چیلنج دونوں کرسکتا ہے۔ تانیثیت کا نظریہ ان طاقت کی حرکیات کو سمجھنے اور ان پر تنقید کرنے کی کوشش کرتا ہے جو خواتین کی ماتحتی کو برقرار رکھتی ہے اور ادب، ثقافت اور معاشرے میں خواتین کی نمائندگی کو تلاش کرتی ہے۔

اس تجزیے میں پروفیسر آمنہ تحسین نے لبرل فیمنزم کا فریم ورک استعمال کیا ہے۔ یہ فریم ورک قانونی اور سیاسی اصلاحات کے ذریعے صنفی مساوات کے حصول پر مرکوز ہے۔ 'سلطانہ کا خواب' میں خواتین کے زیر انتظام دنیا کا یوٹوپیائی نقطہ نظر لبرل نسائی نظریات کی عکاسی کرتا ہے، جو صنفی بنیاد پر پابندیوں کو چیلنج کرتا ہے جو معاشرے میں خواتین کے کردار کو محدود کرتی ہیں۔ یہ تجزیہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ کس طرح رقیہ سخاوت حسین ایک ایسی دنیا کا تصور کرتی ہیں جہاں روایتی صنفی کردار کو الٹ دیا جاتا ہے، اس طرح پدرانہ معاشرے کے بنیادی پہلوؤں پر سوالیہ نشان ہوتا ہے۔ کہانی ایک بنیادی تبدیلی کو پیش کرتی ہے جہاں خواتین اقتدار پر قابض ہوتی ہیں، جو کہ مرد کے زیر تسلط نظام کی خلاف ورزی کی عکاسی کرتی ہے۔

پروفیسر آمنہ تحسین دریافت کرتی ہیں کہ کس طرح 'سلطانہ کا خواب' نہ صرف مردانہ تسلط کو چیلنج کرتا ہے بلکہ تشدد اور جبر سے پاک معاشرے کی قیادت، تخلیق اور پرورش کرنے کی خواتین کی صلاحیت کو بھی منواتا ہے۔

نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت جنوبی ایشیا کے تاریخی تناظر پر غور کرتے ہوئے، تحسین کا تجزیہ پوسٹ نوآبادیاتی حقوق نسواں کے موضوعات کو بھی چھوتا ہے۔ یہ نقطہ نظر صنف، نسل اور نوآبادیاتی نظام کے باہمی تعلق پر تنقید کرتا ہے، اس بات کی کھوج کرتا ہے کہ ثقافتی اور سامراجی قوتوں کے ذریعے عورتوں کے جبر کو کس طرح بڑھایا جاتا ہے۔ نوآبادیاتی ہندوستان کے تناظر میں لکھا گیا 'سلطانہ کا خواب' نہ صرف صنفی مسائل بلکہ نوآبادیاتی حکمرانی کی طرف سے عائد کردہ وسیع تر سماجی پابندیوں کو بھی حل کرتا ہے۔

آمنہ تحسین کی کتاب 'سلطانہ کا خواب: تعارف اور تانیثی تجزیہ' ایک اہم کام ہے جو صنفی مساوات کا ایک بنیادی نقطہ نظر پیش کرتا ہے، جہاں روایتی کردار کو الٹ دیا جاتا ہے اور خواتین معاشرے کی رہنمائی کرتی ہیں۔ رقیہ سخاوت حسین کی کہانی اپنے وقت کے پدرانہ اصولوں کو چیلنج کرتی ہے، جس سے وہ جنوبی ایشیائی ادب کی ابتدائی نسوانی آوازوں میں سے ایک ہے۔ پروفیسر تحسین کی کتاب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح رقیہ سخاوت حسین کے کام نے اردو ادب میں نسوانی گفتگو کی راہ ہموار کی، جس میں خواتین کی 'خاموش آوازوں' کو روشنی میں لانے کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا جسے رقیہ سخاوت حسین نے وسعت دینے کی کوشش کی۔

اپنے جامع اور مدلل تانیثیت کے تجزیے کے ذریعے، پروفیسر تحسین یہ بتاتی ہیں کہ کس طرح رقیہ سخاوت حسین کا وژن نہ صرف اپنے وقت کے لیے انقلابی تھا بلکہ خواتین کے حقوق کے لیے جاری جدوجہد میں بھی اس کا تعلق ہے۔ رقیہ سخاوت حسین کے کام کو حقوق نسواں کی عینک سے پرکھتے ہوئے، پروفیسر تحسین سماجی تبدیلی کی تحریک دینے اور صنفی مساوات کی وکالت کرنے کے لیے ادب کی پائیدار طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

کتاب 'سلطانہ کا خواب: تعارف اور تانیثی تجزیہ' اردو ادب میں حقوق نسواں کی تاریخ میں ایک اہم شراکت کا وعدہ کرتی ہے۔ رقیہ سخاوت حسین کے بصیرت انگیز کام کو دوبارہ متعارف کراتے ہوئے، پروفیسر آمنہ تحسین نے ایک ایسا وسیلہ بنایا ہے جو تانیثی تنقید کا فریم ورک فراہم کرتا ہے اور اسکالرز، حقوق نسواں اور قارئین کی آنے والی نسلوں کو آگاہ اور متاثر کرتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف جنوبی ایشیا میں تانیثیت کی تاریخی جڑوں کو اجاگر کرتی ہے بلکہ سماجی اصولوں کو چیلنج کرنے اور نئی شکل دینے میں ادب کی تبدیلی کی صلاحیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

'سلطانہ کا خواب: تعارف اور تانیثی تجزیہ' نہ صرف ایک ادبی شاہکار کو ازسرنو زندہ کرتا ہے بلکہ سماجی اور ثقافتی اصولوں کو تبدیل کرنے میں ادب کی طاقت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ کس طرح ایک ادبی تخلیق اپنے وقت سے آگے نکل کر ایک ایسے معاشرتی ڈھانچے کی تعمیر کی تحریک فراہم کرسکتی ہے جو صنفی مساوات کی جانب گامزن ہو۔ پروفیسر آمنہ تحسین کی یہ کاوش مستقبل کی نسلوں کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے، جو نہ صرف ادب میں بلکہ معاشرتی تبدیلی کے عمل میں بھی ایک نمایاں کردار ادا کرسکتی ہے۔

غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

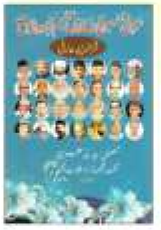

مصنف: فخرالدین عارفی

صفحات: 208، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: دربھنگہ ٹائمز پبلی کیشنز، دربھنگہ (بہار)

مبصر: ڈاکٹر محمد مظاہرالحق، شاہین منزل، محلہ نوگھروا

پوسٹ: مہندرو، سلطان گنج، پٹنہ۔ 800006 (بہار)

'غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے' فخرالدین عارفی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں پندرہ شعرا پر مضامین ہیں۔ مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، فضل حق عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی، سید شاہ حامد عظیم آبادی، پروفیسر عبدالمنان بیدل عظیم آبادی، علامہ جمیل مظہری، علامہ سید شاہ فضل امام واقف عظیم آبادی، مظہر امام، سلطان اختر، رمز عظیم آبادی، پروفیسر لطف الرحمن، شمیم فاروقی، کیف عظیم آبادی۔ اس کے بعد مصنف نے جو باب قائم کیا ہے وہ ہے حصہ نثر۔ اس باب میں کل پانچ شخصیات کو جگہ دی گئی ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر۔ اس کے بعد فخرالدین عارفی نے صحافت کے باب میں ایسے دو صحافی کا ذکر کیا ہے جنھوں نے صحافت کے گیسو سنوارنے میں زندگی کھپادی مثلاً سید محمد عمر فرید اور سید عبدالرافع۔

زیر تبصرہ کتاب میں تین اہم کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً پروفیسر عبدالمنان طرزی کی اہم کتاب 'دیدہ وران بہار' پروفیسر اعجاز علی ارشد کی مشہور زمانہ کتاب 'بہار کی بہار' اور ڈاکٹر قیام نیر کی شہرہ آفاق کتاب 'بہار میں تخلیقی نثر'۔

زیر تبصرہ کتاب کے آخر میں اوراق پارینہ کے عنوان سے اردو میں مشاعروں کی روایت اور عظیم آباد کے ایک یادگار مشاعرے کی روداد قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ اس باب سے دو واقعات رقم کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''عرب کے سب سے بڑے میلے عکاظ اور دوسرے اجتماع میں عام طور پر قصائد ہی پڑھے جاتے تھے اور جو قصیدہ زیادہ مقبول ہوتا یا پسند کیا جاتا وہ خانہ کعبہ کی دیوار پر چسپاں کر دیا جاتا یا لٹکا دیا جاتا۔'' (ص 202)

''18 اکتوبر 1902 کو بادشاہ منزل میں منعقد ہونے والا مشاعرہ کئی اعتبار سے بہت اہم تھا اور اردو زبان کی تاریخ میں آج تک اس مشاعرے کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ یہ مشاعرہ چھ دنوں تک چلتا رہا اور روزانہ گیارہ بجے دن سے شروع ہو کر گیارہ بجے رات کو ختم ہوتا تھا۔'' (ص 205)

پروفیسر عبدالمغنی کو اردو سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ فخرالدین عارفی کی اس تحریر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''پروفیسر عبدالمغنی جب بھی گفتگو کیا کرتے تھے تو وہ اردو زبان کے مسائل اور ان کے حل کے تعلق سے ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ روزانہ پابندی سے اردو کے ساتھ انگریزی اخبارات کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے اور جب بھی ان کو اخبار میں کوئی ایسی خبر نظر آتی جس کا تعلق اردو زبان سے ہوتا تو وہ فوراً اس تعلق سے اپنا بیان جاری کرتے اور متعلقہ وزیر کو خط بھی لکھا کرتے تھے۔ اکثر وزیر اعلیٰ کو بھی خط لکھا کرتے تھے جو اردو زبان کے کسی اہم مسئلے پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ گویا انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے خود کو بالکل وقف کر دیا تھا۔ میں نے کبھی اپنی زندگی میں ان کو کسی گھریلو کام کے تعلق سے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔'' (ص 130)

زیر تبصرہ کتاب میں فخرالدین عارفی نے جس پر بھی مضمون قلم بند کیا ہے بڑے تسلی سے کیا ہے۔ مضمون قاضی عبدالودود کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''قاضی عبدالودود کے والد کا نام قاضی عبدالوحید اور ان کے دادا کا نام قاضی عبدالمجید تھا۔ قاضی صاحب کی پیدائش ان کی ننیہال کا کو ضلع جہان آباد میں ہوئی جو اس وقت گیا ضلع میں ہوا کرتا تھا۔ قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم ان کے والد کی خواہش کے مطابق علوم قدیم سے ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا اور صرف 14 سال کی عمر میں وہ حافظ قرآن ہو گئے۔'' (ص 23-122)

مختصر یہ کہ فخرالدین عارفی کی کتاب 'غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے' ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ مذکورہ کتاب کی یہ پہلی جلد ہے۔ اس کی اور کئی جلدیں آنی ہیں۔ راقم الحروف بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ فخرالدین عارفی کی اس کاوش سے قاری، اکابرین ادب کے تعلق سے مستند معلومات حاصل کر سکتا ہے اور اسے اس کا بھی بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ دبستان عظیم آباد میں کیسے کیسے لعل و گہر ہوا کرتے تھے۔

فکشن زاویے

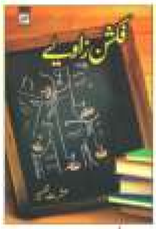

مصنف: عشرت ظہیر

صفحات: 208، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، دہلی۔ 95

مبصر: محمد اکرام، 6A-89، اسٹریٹ نمبر 1، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی

عشرت ظہیر کی شناخت فکشن نگار، ادیب اور صحافی کے طور پر ہوتی ہے۔ رسالہ 'آہنگ' سے ان کی طویل عرصے تک وابستگی رہی ہے۔ ان کے افسانے اور مضامین ہندوستان کے مشہور رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اختصار و ایجاز ان کی تحریروں کے نمایاں امتیازات ہیں۔

عشرت ظہیر کے اب تک چار افسانوی مجموعے: ابھرتی ڈوبتی لہریں (اکتوبر، 1979)، متوازی خطوط (1989)، خوشبوؤں کا جال (جون 2016)، خوابوں کا قیدی (2019) اور دو مضامین کے مجموعے 'نمود حرف' (2024) اور 'فکشن زاویے' شائع ہو چکے ہیں۔

'فکشن زاویے' عشرت ظہیر (سید شاہ محمد عشرت) کی تازہ ترین تصنیف ہے جو عرشیہ پبلی کیشنز سے شائع ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں ناول، ناولٹ، افسانے اور افسانچے پر کل 27 مضامین شامل ہیں۔

ناول میں: 'انارکلی' کی چیختی روح کا پُر جنم، عبدالصمد کے ناولوں کا فنی اختصاص، ناول روحزن: جنس اور محبت کا تضاد، 'پری ناز اور پرندے': عظمتِ رفتہ اور محبتوں کا قصہ، 'اماوس میں خواب' زندگی کی روشنی کا استعارہ، نئے دھان کا رنگ: زندگی کی تفسیر و تقدیر، ناول 'شہرذات' کا تنہا آدمی، ہجور آما: نوری بھی ناری بھی، تخم خوں: کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، 'شب ہجراں': مختصر ناول، لمبی کہانی جب کہ ناولٹ میں 'سرپٹ گھوڑا': امکانیت پسندی کا مینارۂ نور' جیسے مضامین شامل ہیں۔

اسی طرح افسانے میں عبدالمتین 'رنگوں کے تعاقب' میں، حسین الحق کے چند مقبول افسانے، سید محمد اشرف کا افسانہ 'یک بیاباں' 'ایک نوٹ'، مشرف عالم ذوقی کا افسانہ 'پانی': تجزیاتی مطالعہ، منظر کاظمی: 'لکشمن ریکھا' کی روشنی میں، شفق کا داستانی لہجہ اور امتیاز فن، علی امام

کے افسانے: نفی سے اثبات تک، فخرالدین عارفی کے افسانے، شفیع جاوید: رمزِ حیات کی تلاش میں، 'رات کی بات': ذہنی گرداب کا نگارخانہ، ڈاکٹر شاہد جمیل کے افسانوں میں عورت، اسلم سلازار کے افسانے کی پرواز: 'اسنوفال'، تنویراختر رومانی، سنہری قدروں کا امین، افسانوی مجموعہ 'کربِ ناتمام' ایک تاثر جب کہ افسانچے میں تنویراختر رومانی کے افسانچے اور مجموعۂ افسانچہ 'ہارا ہوا ملاح' کو اس کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

208 صفحات کی کتاب میں 27 مضمون کی شمولیت سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے کسی موضوع کی وضاحت کے لیے کس قدر محنت کی ہوگی۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جس میں فکشن نگار کی ایک ہی کتاب پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر کئی ایسے مضامین ہیں جن میں فکشن نگار کی کئی کتابوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ فکشن نگار کے حالاتِ زندگی اور اس کی تحریروں کے محاسن و معائب پر بھی جامع گفتگو کی گئی ہے۔ ایسا عشرت ظہیر اس لیے کرپاتے ہیں کہ وہ کسی کتاب پر اپنی رائے یا مضمون لکھتے وقت کتاب کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں جب کہ اس وقت پوری کتاب کا مطالعہ کرکے مضمون لکھنے والے شاذ و نادر ہی ہیں۔ اب تو بیشتر مضمون نگار کتاب کے پیش لفظ اور چند سطور پڑھ کر ہی مضمون تیار کرلیتے ہیں۔ یہ چلن اب عام بھی ہوتا جارہا ہے۔ ایسے مضمون سے نہ تو مضمون نگار کا بھلا ہوگا اور نہ ہی فن پارے کے ساتھ انصاف۔ ایسا کرنے والے تنقید کے بنیادی اصول سے بھی انحراف کرتے ہیں۔ عشرت ظہیر کے ذوقِ مطالعہ اور ارتکازیت کی ستائش بہرحال کرنی چاہیے۔ مگر ان کے اندر انکسار اس قدر ہے کہ وہ اپنے آپ کو تنقید نگار کے زمرے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اس بابت وہ ایک صفحے کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

''میں تنقید نگار نہیں ہوں۔ لہٰذا اس مجموعۂ مضامین 'فکشن زاویے' میں شامل تحریریں یقیناً تنقیدی زمرے میں نہیں آتیں۔ اس لیے ان میں تنقیدی ادب کی نوعیت کے لحاظ سے تخلیقی بصیرت اور کیفیت کی تلاش فعلِ عبث ہوگا۔

یہاں بڑے بڑے، مستند نقادوں کی طرح، غیرملکی زبان و ادب کے ممتاز فنکاروں اور ان کی کتابوں کے اقتباسات کے توسط سے تخلیقات کو پرکھنے کی سعی بھی نہیں ہے۔ میں نے قلم کاروں اور ان کی کاوشوں کی انفرادیت، موضوعات کی ندرت، اظہار بیان کے تنوع کو عہدِ حاضر کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔'' (فکشن زاویے، ص6)

عشرت ظہیر کی نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مضمون لکھتے وقت لمبی چوڑی تمہید سے گریز کرتے ہیں۔ بارہا یہ دیکھا جاتا ہے کہ کچھ قلم کار مضمون لکھتے وقت اتنی لمبی تمہید باندھتے ہیں کہ قاری کو اس سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ وہ اصل مضمون تک پہنچتے پہنچتے تھک ہار کر کتاب بند کردیتا ہے۔ یہ بھی نثر کا بڑا عیب ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں لمبی تمہید سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر کسی مضمون میں تمہید ہے بھی تو بہت ہی مختصر۔ بعض مضامین تو بغیر تمہید کے ہی شروع ہوجاتے ہیں۔ اس بابت ان کے ایک آدھ مضامین سے اقتباس پیش کرنا بہت ضروری ہے تاکہ قارئین صحیح معنوں میں ان کے اس ہنر سے واقف ہوسکیں۔ عشرت ظہیر رحمٰن عباس کے ناول 'ناول روحزن: جنس اور محبت کا تضاد' میں ان کا تعارف صرف ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے طور پر کراتے ہیں، پھر وہ سیدھے ناول پر آجاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''رحمٰن عباس کا ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ ناول 'روحزن' زندگی کی تپش اور حرارت کے مدوجزر اور زندگی کے رہسیہ کے اندھیرے اجالے سے عبارت ہے۔ ناول کی کہانی میں بارش، جنس اور محبت کے اظہار کا دلکش، حیران کن اور فکر انگیز استعاراتی نظام ہے۔'' (ایضاً، ص29)

شبیر احمد کے ناول 'ہجور آما: نوری بھی ناری بھی' میں وہ پہلا طریقہ اپناتے ہیں۔ شبیر صاحب کا تعارف چند الفاظ میں کرکے ناول پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

شبیر احمد گمبھیر اور روادار انسان ہیں۔ ان کے ناول 'ہجور آما' کی کائنات بھی گمبھیر مظاہر اور روادار پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، لیکن اس امر کے باوجود، اپنے ناول 'ہجور آما' میں شبیر احمد کہیں نہیں دکھتے...'' (ایضاً، ص70)

شاہد اختر کے ناول 'شہرزات' میں تو وہ بغیر کسی تمہید کے ناول پر گفتگو شروع کردیتے ہیں۔ موضوع کی شروعات اس طرح ہوتی ہے:

شاہد اختر کا ناول 'شہرزات' عہدِ حاضر کے منفی اندازِ فکر اور صورت حال کو اپنے جلو میں لیے آج کی معاشرتی اور سماجی زندگی، رشتوں، قدروں اور موجودہ صورت حال اور اس کے اسٹرکچر کے ٹوٹتے بکھرتے اور پائمال ہوتے ہوئے سلسلوں میں ایک تنہا آدمی (خرم) کی کہانی ہے...'' (ایضاً، ص63)

طوالت سے بچنے کے لیے ناتمام اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔ ناول کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور کارآمد ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے قارئین کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فکشن کی کتابوں کا علم حاصل کرسکیں گے اور عشرت ظہیر کی تحریروں کی سادگی و پرکاری سے بھی محظوظ ہوں گے۔

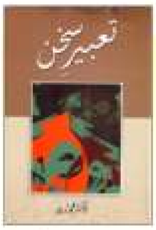

تعبیرِ سخن

مصنف: ڈاکٹر محمد زبیر

صفحات: 240، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیر، مغل پورہ، نزد مسجد زبیر، مئوناتھ بھنجن، مئو۔ 275101 (یوپی)

'تعبیرِ سخن' ڈاکٹر محمد زبیر کے انیس تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین ادب کی مختلف اصناف مثلاً تنقید، تحقیق، فکشن اور شاعری کا احاطہ کرتے ہیں اور بیشتر مضامین تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ صاحبِ قلم نے جس موضوع کو منتخب کیا ہے اس کے ساتھ انصاف کرنے کے ساتھ ہی تمام تشنہ پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضامین کے مطالعے سے مصنف کے تنقیدی شعور، شعری افہام و تفہیم اور تحقیق کے اصول و مباحث سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ موصوف نے تنقید نگار کی نگارشات اور فن پارے کے مطالعے کے بعد اپنی علمی بساط کے مطابق تنقیدی رائے پیش کی ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر شاہد حسین لکھتے ہیں:

''محمد زبیر تنقید و تحقیق کے بنے بنائے راستوں پر چلنے کے بجائے تجزیاتی عمل کے ذریعے رد و قبول کی منزل سے گزرتے ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اس میں کون کون سے پہلو تشنہ ہیں اور کون کون سے نکتوں پر ازسرِنو گفتگو کی ضرورت ہے۔ انہوں نے عموماً اپنا سروکار فنی مباحث سے رکھا ہے، اور اسی تناظر میں ادیبوں اور شاعروں کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔''

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے مشمولات پر نظر ڈالتے چلیں تاکہ مصنف کی

ادب کی مختلف اصناف سے دلچسپی کا بھی اندزہ ہوسکے۔ وارث علوی کی تنقیدی بصیرت، بمبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار: نجیب اشرف ندوی، بمبئی میں اردو کے تحقیقی ادارے، آزادی سے قبل بمبئی کا شعری منظر نامہ، تذکرہ شعرائے مئوناتھ بھنجن، اردو شاعری میں فارسی الفاظ وتراکیب کا تصرف، کلام فراق پر فارسی کے لسانی اثرات، شادعظیم آبادی کی شعری جہات، اثر انصاری کی غزلوں میں جمالیاتی عناصر، ڈاکٹر شمشادعنبر آفاقی کی نظم نگاری، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اور نقدِ سخن، عبداللہ کمال کے شعری کمالات، بشر نواز کا شعری سفر، علامہ اقبال کی نظم شعاعِ امید، انیس احمد انیس اور زیبائے غزل، عصر حاضر میں اردو زبان کے فروغ اور امکانات، اکیسویں صدی میں اردو شاعری (بمبئی کے حوالے سے) نیر مسعو ایک منفرد قصہ گو اور ابرار مجیب کے افسانوی امتیازات، مذکورہ عناوین میں اگرچہ کوئی جدت نہیں ہے، لیکن مضامین کے حوالے سے جو سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے وہ لائق مطالعہ ہے۔

زیرنظر کتاب میں شامل پہلا مضمون 'وارث علوی کی تنقیدی بصیرت' ہے۔ اردو ادب میں وارث علوی کی شناخت ایک بے باک نقاد کی حیثیت سے ہے۔ وہ بے لاگ گفتگو کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا تنقیدی اسلوب و انداز طنزیہ ہوتا ہے، لیکن تنقید کے اصول کے منافی نہیں ہوتا۔ وہ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے، لیکن ان کی تنقیدی زبان میں طنز کا پہلو غالب رہتا تھا، جس کے سبب ناقدین ان کی تنقیدی آرا کو قبول کرنے میں پس وپیش کا شکار ہیں اور اردو تنقید میں ان کو وہ مقام ومرتبہ نہ حاصل ہوسکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محمد زبیر نے لکھا ہے:

''وارث علوی کی تنقید حقیقت پسندانہ اور منصفانہ رویوں پر مبنی ہے، لیکن اسلوب میں طنز واستہزا کی فراوانی بعض ناقدین کے لیے گراں بار ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے اکثر ناقدین ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کے معترف تو ہیں لیکن انھیں معتبر مقام دینے میں کوتاہ نظری اور غیر ایماندارانہ رویے سے کام لیا ہے۔''

وارث علوی کا تنقیدی رویہ کہیں کہیں بہت سخت ہوجاتا ہے، لیکن اس میں بہت اہم بات پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک جگہ طنزیہ اسلوب اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالی پورے آدمی تھے جب کہ ہم لوگ ادھورے آدمی ہیں۔ ہمارے پاس نظامِ اقدار نہیں، تاریخی تناظر نہیں، روایت کا شعور نہیں، کھرے کھوٹے کے پیمانے نہیں۔ روشن خیالی کی جگہ تنگ نظری اور انتہا پسندی ہے.............ہم اثرات قبول نہیں کرتے نقالی کرتے ہیں۔ تنقید نہیں کرتے رائے زنی کرتے ہیں، نظریہ سازی نہیں کرتے حزبی اور گروہی اعلان نامے شائع کرتے ہیں۔ تنقیدی کتابیں نہیں لکھتے تعصبات کے دفتر سیاہ کرتے ہیں۔''

''بمبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار: نجیب اشرف ندوی'' ایک تحقیقی مضمون ہے، جس میں بمبئی کی اردو تحقیق میں نجیب اشرف ندوی کی تحقیقی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، اوران کے تحقیقی کارناموں کے پیش نظر انھیں بمبئی میں اردو تحقیق کا علم بردار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد زبیر لکھتے ہیں:

''بمبئی میں اردو تحقیق کا سرا جب ہم تلاش کرتے ہیں تو نجیب اشرف ندوی سے قبل باضابطہ کوئی اردو تحقیق دیکھنے کو نہیں ملتی۔ بمبئی کے اداروں اور کالجوں سے وابستگی کے دوران انھوں نے اس صنف ادب کی طرف نہ صرف خصوصی توجہ کی بلکہ طلبا اور محققین کو تحقیق کی طرف رغبت بھی دلائی اور اس خوبی کے ساتھ اس صنف ادب کی طرف مائل کیا کہ ان کے اندر ذوق وشوق کے جذبے نے تحقیق کی راہ ہموار کردی اور بمبئی میں اردو تحقیق کا کارواں چل پڑا۔''

'آزادی سے قبل بمبئی کا شعری منظر نامہ' مذکورہ مضمون میں آزادی سے قبل کے بمبئی کے شعری منظر نامے پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس وقت کے تمام شعرا کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، جنھوں نے بمبئی کے شعری منظر نامے کو روشن وتابناک بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم مجروح سلطان پوری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد زبیر لکھتے ہیں:

''مجروح کی شاعری کا سرمایہ بہت مختصر ہے۔ وہ بسیار گوئی کے قائل نہیں تھے، اپنی شاعری کو بار بار نکھارا اور سنوارا، اور خوب سے خوب تر کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں غزل کی قدیم روایات 'سخن با یار گفتن' کو برقرار رکھتے ہوئے وقت اور حالات کے پیش نظر ترقی پسندانہ انداز برتنے کی سعی کی ہے جس سے ان کی غزلوں کی معنویت کی سطح مزید بلند ہوگئی ہے۔''

'کلام فراق پر فارسی کے لسانی اثرات' یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد مضمون ہے، جس میں کلام فراق کو لسانی حوالے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور مضمون 'اثر انصاری کی غزلوں میں جمالیاتی عناصر' بھی پیش ہے۔ یہ مضمون تجزیاتی نوعیت کا ہے، موصوف نے اثر انصاری کی غزلوں میں پائے جانے والے جمالیاتی عناصر کو شعری محاسن اور فنی خوبیوں کے ساتھ اجاگر کرنے کی سعی کی ہے، اوران کی شعری خصوصیات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''اثر انصاری کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع اور خیالات کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں، اسے معیار عطا کرنے کے لیے نئی لفظیات اور نرالی بندشوں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہی لفظیات اور بندشیں ان کے کلام میں احساسِ جمال کی زائیدگی کا سبب بنتی ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں نئی لفظیات اور بندشوں کو ایک منفرد طریقے سے برتنے کی سعی کی ہے، جوان کی شعری جمالیات کی اظہاریت کا بہترین وسیلہ ہے۔''

متذکرہ بالا مضامین کے علاوہ کتاب میں شامل دیگر مضامین کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ڈاکٹر محمد زبیر کی تنقیدی زبان اور اسلوب بھی سادہ اور سلیس ہے۔ البتہ کسی کسی مضمون میں تکرار پیدا ہوگئی ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ کتاب بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ سبھی مضامین میں قارئین کے لیے مواد موجود ہے، امید ہے کہ یہ کتاب ادب کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے کارگر ثابت ہوگی۔

مضامین

نقوش ٹونک

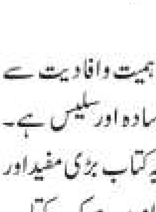

مصنف: مختار ٹونکی
صفحات: 200، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024
مبصر: سید ساجد علی ٹونکی
نیو علی منزل، محلہ رجبن، ٹونک 304001 (راجستھان)

زیرنظر کتاب مختار ٹونکی کے سلسلہ اشاعت کی تیسویں کڑی ہے۔ ادبی حلقوں میں مختار صاحب کی شناخت راجستھان کے معروف شاعر، ادیب، نقاد، محقق، مزاح نگار، فکشن نگار اور ماہر ادب اطفال کی حیثیت سے ہے۔ اب تک موصوف کی آٹھ کتب

طنز ومزاح پر دس کتب تنقید، تحقیق اورادبی تبصروں پر چھ کتب ادب اطفال پر ایک مونوگراف اور بقیہ شاعری پر مشتمل ہیں۔

جہاں تک نقوشِ ٹونک کا تعلق ہے اس میں زیادہ تر مضامین ٹونک کی علمی وادبی شخصیات پر مشتمل ہیں۔ جن اہم شخصیات پر مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے ان میں ٹونک ریاست کے بانی نواب امیرالدولہ کے چند درخشاں پہلو، ٹونک کے پہلے صاحب دیوان شاعر احمد علی خاں رونق، 'آثار مالوہ' کے مصنف اور سرونج کے معرف شاعر جناب سید احمد مرتضٰی نظر، نسخۂ حمیدیہ کے مرتب جناب مفتی انوارالحق، استاد داغ کے ایک ہونہار شاگرد بھائی جان عاشق، ٹونک کے معروف شاعر حافظ عبدالحیٔ خاں رعنا، تحقیق کے باوا آدم پروفیسر محمود خاں شیرانی، ٹونک کے صاحب دیوان شاعر جناب محمد صدیق صائب، محمد مصطفٰی خاں جوہر ٹونکی، ٹونک کے معروف قاری، خطاط اور شاعر جناب سلیم اللہ واصف، ہندوستان کے عظیم شاعر اور دہلی اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری جناب مخمور سعیدی، راجستھان کی اولین صاحب دیوان شاعرہ صالحہ پروین، اردو دوہوں کے معروف شاعر جناب فراز حامدی اور ٹونک کے نوجوان شاعر اور ماہر طبیب جناب ڈاکٹر سخاوت شمیم (مرحوم) پر تحریر کردہ مضامین شامل ہیں۔

اس کے علاوہ زیر نظر کتاب میں جن اہم موضوعات پر مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان میں ریاست ٹونک کے چوتھے نواب محمد ابراہیم علی خاں خلیل کے شعری مجموعے 'خیابانِ خلیل' کے کہاوتی اسلوب کا تجزیہ، ٹونک کا معروف کتب خانہ 'مولانا آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' ٹونک میں اردو نعت گوئی کا تاریخی ارتقا، ٹونک کا طنزیہ ومزاحیہ ادب، ٹونک میں عید میلادالنبی کی روایت، چاربیت ایک لوک صنفِ سخن، سقوط ریاست ٹونک جیسے عنوانات شامل ہیں۔

مختار ٹونکی صاحب کی نثر سادگی مگر پرکاری لیے ہوئے ہے۔ زبان وبیان پر آپ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ روزمرہ محاوروں کا برجستہ استعمال اور نئی اصطلاحات کے تخلیقی فن سے بھی آپ پوری طرح واقف ہیں۔ آپ کی یادداشت قوی اور مطالعہ وسیع ہے۔ حالانکہ آپ اپنی عمر کی پچاسی بہاریں دیکھ چکے ہیں اس کے باوجود آپ کا قلم رواں دواں ہے۔ جس تیزی سے آپ کی تخلیقات منظر عام پر آرہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی آپ کے قلم میں بہت روشنائی باقی ہے۔

مختار ٹونکی نے اپنی کسی بھی کتاب پر کبھی دیباچہ، پیش لفظ، تقریظ وغیرہ نہیں لکھوائی وہ خود بھی عام طور پر اپنی کتابوں میں اپنے تاثرات شامل نہیں کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ کسی بھی ادبی فن پارے کے محاسن ومعائب بیان کرنے کا حق صرف قاری کو ہونا چاہیے نا کہ مصنف، مرتب یا کسی ہم نوا کو۔ اس کتاب کو بھی آپ نے براہِ راست اپنے مضمون سے شروع اور مضمون پر ہی ختم کیا ہے۔

جناب مختار ٹونکی کے نثری اسلوب کے تجزیے کے پیش نظر آپ کے مضامین سے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جارہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

''حضرتِ رونق بہت یارباش اور متواضع انسان تھے۔ صحیح معنوں میں وہ قدردانِ علم وفن اور شعر وسخن تھے۔ استادِ سخن حضرت ناسخ کی شاعری کے قائل تھے اسی لیے جب آپ نے لکھنؤ کا دورہ کیا تو ناسخ سے خاص طور سے ملاقات کی تھی۔

اسی طرح جب داغ دہلوی جے پور تشریف لائے تو ان کی ضیافت میں آپ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آپ بعد میں ٹونک چھوڑ کر تم جے پوری ہوگئے تھے۔ چونکہ ٹونک کے نوابی خاندان کے آپ چشم وچراغ تھے اسی لیے اہالیانِ جے پور انھیں چشم ماروشن، دل ماشاد کی طرح رکھتے تھے۔''

(ٹونک کا پہلا صاحب دیوان شاعر: رونق، ص13)

ٹونک کے گلزارِ شعروسخن میں اس وقت ویسے ہی بہت سی بلبلیں نغمہ سنجیوں میں مصروف ومقبول تھیں۔ رعنا کی شمولیت سے ترنم ریزیاں اور بڑھ گئیں۔ مشاعروں کی گہما گہمی اور شعرا کے جمگھٹوں میں اضافہ ہوگیا۔ (کتاب زیست کا عنواں بن گئے رعنا، ص86)

ویسے یہ بات تو مسلمہ ومصدقہ ہے کہ اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں شیرانی خاندان کی بڑی دین ہے۔ اختر شیرانی نے شاعری کے میدان میں دھوم مچائی تو وہیں ان کے والد محترم پروفیسر محمود خاں شیرانی نے فن تحقیق کی شمع روشن کی۔ لاریب اردو میں باقاعدہ تحقیق کا آغاز انہی کی ذاتِ جستجو صفات سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ضاء الدین دیسائی نے محمود شیرانی کو اردو تحقیق کا مصلح اول، معمار اول اور نقاشِ اول قرار دیا ہے۔'' (تحقیق کا باوا آدم: محمود خاں شیرانی، ص98)

''مخمور سعیدی کو وراثت میں دولت تو وافر نہیں ملی مگر شاعری کی دولت ضرور ہاتھ آئی۔ ان کے دادا جناب میر عالم خاں زخمی تخلص کرتے تھے۔ آپ کے والد جناب احمد علی خاں نازش اور آپ کے چچا بیدل تخلص کیا کرتے تھے۔ مخمور سعیدی شاعر کیوں نہ بنتے، شعر کہنے کا جذبہ ان میں فطری اور موروثی طور پر ودیعت ہوا تھا۔ لہٰذا مخمور بن کر پہلے جوہر ٹونکی سے رجوع کیا پھر استاذ الشعرا حضرت بسمل سعیدی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوکر مخمور سعیدی ہوگئے۔ (مخمور سعیدی شخص اور عکس، ص159)

کتاب کا ٹائٹل کور دیدہ زیب ہے۔ فرنٹ پیج پر ٹونک کی چار تاریخی عمارتوں کی تصویریں ہیں۔ ان میں شاہی جامع مسجد ٹونک، عربی وفارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، قصرِ زرنگار (سنہری کوٹھی) اور شہر کے گھنٹہ گھر کی تصاویر شامل ہیں۔ بیک کور پر مختار ٹونکی کی ستائیس کتابوں کی فہرست مع موضوعات کے شامل اشاعت ہے۔

مجموعی طور پر کتاب اچھی اور مفید ہے۔ امید ہے کہ نہ صرف ریسرچ اسکالرس اس کتاب سے استفادہ کریں گے بلکہ ادبی حلقوں میں بھی اس کی پذیرائی ہوگی۔

تبصرہ

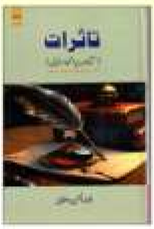

تاثرات

مصنف: انوارالحسن وسطوی

صفحات: 280، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: المصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: ڈاکٹر عطا عابدی، معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)

'تاثرات' انوارالحسن وسطوی کی دسویں کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی 9/ کتابیں 'صدائے دل' (1987)، 'مجلہ ' اردو ٹیچرس کانفرنس (1997)، 'انجمن ترقی اردو، ویشالی کی خدمات' (2010)، 'رشحاتِ قلم' (مجموعۂ مضامین، 2011)، 'نقوشِ قلم' (مجموعۂ مضامین، 2015)، 'نیرنگِ قلم' (مجموعۂ مضامین، 2018)، 'انعکاسِ قلم' (مجموعۂ مضامین، 2019)، 'آتی ہے ان کی یاد' (یادِ رفتگاں، 2020) اور 'قمر اعظم ہاشمی' (مونوگراف، 2022) شائع ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست سے انوارالحسن وسطوی کا قلم وقرطاس سے رشتے ورابطے کی معنویت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قلم

وقرطاس سے مصنف کا رشتہ گہرا اور فعال تو ہے،لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے حوالے سے ان کی جو مسلسل بے لوث تحریکی خدمات ہیں اور ان کی شخصیت میں جو خاکساری اور محبوبیت ہے وہ کم، بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'تاثرات' کو مصنف نے کتابوں پر اظہارِ خیال قرار دیا ہے۔ 'تاثرات' میں 52/کتابوں پر ان کے تبصراتی مضامین ہیں۔ یہ 52/کتابیں مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ یہ موضوعات 'گوشہ' کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، جو اس طرح ہیں: گوشۂ قرآن کریم، گوشہ نعت پاک، گوشہ تحقیق وتنقید، گوشہ مونوگراف و رسائل، گوشہ شاعری، گوشۂ یادِ رفتگاں وقائماں، گوشۂ ادبِ اطفال، گوشۂ مصاحبہ، گوشۂ صحافت اور آخر میں 'گوشۂ متفرقات'۔ آخرالذکر گوشے میں خطوط، یادنامے، عام معلومات، ازدواجی زندگی، شخصی نقوش اور سائنسی موضوع پر کتابیں ہیں۔ 'تاثرات' میں سب سے زیادہ 15/تبصرے 'گوشۂ تحقیق وتنقید' میں ہیں۔ اس کے بعد 7/تبصرے 'مونوگراف ورسائل' پر ہیں۔ 'یادِ رفتگاں وقائماں' سے متعلق 6/کتابوں پر تبصرے ہیں۔ 4-4/کتابیں نعتِ پاک، شاعری اور ادبِ اطفال کی ہیں۔ 'مصاحبہ' سے متعلق 3/کتابیں، 'قرآنِ کریم' سے متعلق 2/کتابیں اور 'صحافت' سے متعلق 1/کتاب پر تبصرے کیے گئے ہیں۔

'تاثرات' کے مطالعے سے ہر کتاب پر سیر حاصل گفتگو کے اہتمام کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ ہر تبصرہ دل جمعی سے سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ ان تبصروں پر غور کرنے سے ایک خاص نظام کا احساس ہوتا ہے۔ اس نظام کے تحت سب سے پہلے متعلقہ کتاب کے مصنف کا تعارف وتذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتاب میں شامل مصنف کے دیباچہ اور دیگر اہلِ نظر کے مضامین وتاثرات کے اقتباسات کے ذریعے کتاب کی افادیت کے پہلو روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں مبصر نے اپنے مطالعے کا حاصل اپنے خیالات اور تاثرات کے ذریعے پیش کیا ہے۔ کئی کتابوں کی قیمت اور ملنے کے پتے بھی آخر میں شامل تبصرہ کیے گئے ہیں۔ تاکہ شائقین اپنی سہولت کے مطابق ان کتابوں کو حاصل کر کے پڑھیں۔ ان چار نکاتی نظامِ تبصرہ کے ذریعے مبصر نے کتاب کی تمام بنیادی معلومات پیش کرتے ہوئے قارئین کو دعوتِ مطالعہ دینے کی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ مصنف نے متعلقہ تمام کتابوں کی خصوصیات فراخ دلی سے اجاگر کی ہیں۔ مصنف کی فراخدلی کا ایک بڑا سبب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ ''وہ ان کتابوں کے مطالعے کے لیے اوروں میں دلچسپی پیدا کرنے کا طالب ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ مبصر نے واضح انداز میں اپنے اس موقف کا اظہار کیا ہے کہ '' گلستاں کی سیر پھولوں کے حُسن ،اس کی رنگینی اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہونے کے لیے کرتا ہوں، کانٹوں کی تلاش کے لیے نہیں۔'' مبصر کے اس موقف کا محرک کتاب کی مثبت صورت گری کے ذریعے قارئین میں متعلقہ کتابوں کے تئیں ترغیب وتحریک کی فضابندی کا جذبہ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ جن کمیوں کی نشاندہی بہت ضروری تھی ان سے اغماض برتا گیا ہے۔ بلکہ ایسے مقامات پر کمیوں کی نشاندہی اور کہیں نشاندہی کے ساتھ نیک مشورے بھی دیے گئے ہیں:

1 ''مونوگراف' میں 'ابتدائیہ' بقلم مصنف تحریر ہونا تھا، لیکن پتہ نہیں کس سبب سے صفحہ سادہ رہ گیا ہے۔'' (ص:121)

2 ''شعرا پر لکھے مضامین کی اس لمبی فہرست میں جھارکھنڈ کے شہرِ آہن (جمشید پور) کے مشہور ومقبول شاعر 'شائق مظفر پوری' پر کوئی مضمون نہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔'' (صفحہ:148)

3 ''رحمٰن جامی سے اتنی قربت کے باوجود مظہر وسطوی نے اپنی تحریر میں پتہ نہیں کیوں موصوف سے شرفِ تلمذ ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔'' (صفحہ:170)

4 ''خدابخش لائبریری کو اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی شائع کرنا چاہیے تاکہ ملک کے غیر اردو داں شہری بھی اس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکیں۔'' (صفحہ:54)

5 ''ضرورت ہے کہ مفتی صاحب کی ملّی، تعلیمی، سماجی اور صحافتی خدمات پر بھی کام کیا جائے۔'' (صفحہ:103)

'پیش لفظ' میں مصنف کتاب ہٰذا نے کتابوں پر اظہارِ خیال کے دو فائدے بتائے ہیں۔ مصنف کی حوصلہ افزائی وپذیرائی اور اپنی معلومات میں اضافہ۔ مصنف کا طرزِ تحریر رواں دواں اور شگفتہ وسادہ اسلوب کے تحت ہے۔ ہر تبصرہ مصنف کی وسیع القلبی کا احساس کراتا ہے۔ یعنی کسی تعصب وتنگ نظری سے ماورا ہو کر یہ تبصرے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کے آغاز میں پیشِ لفظ کے بعد شفیع مشہدی کا 'تاثر' اور پروفیسر علیم اللہ حالی کا 'استقبال' کتاب ہٰذا کے مصنف انوارالحسن کی تحریکی وادبی خدمات کا اعتراف نامہ ہیں۔ شفیع مشہدی نے بجا طور پر انھیں 'مجاہدِ اردو' یا 'عاشقِ اردو' کا خطاب دینے کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے انوارالحسن وسطوی کی تخلیقی وتنقیدی سرگرمیوں اور ادبی ولسانی پہلوؤں پر ان کی کارکردگیوں کو ہم عصر تحریروں کا ایک ریکارڈ قرار دیا ہے۔

آخر میں ہر گوشے سے ترتیب وار دو۔ دو کتابیں ملاحظہ ہوں، تاکہ 'تاثرات' سے واضح تاثرات کے کچھ اور نقوش کا اندازہ ہو سکے۔ 'قرآن پاک کی اردو تفاسیر' (ڈاکٹر سید شاہ حیدر رضوی)، 'قرآن کریم سے مکالمہ' (ڈاکٹر اختر عادل گیلانی)، 'انتساب' (قوس صدیقی)، 'اظہارِ مدینہ' (پروفیسر فاروق احمد صدیقی)، 'تنقیدی مسئلے' (پروفیسر نجم الہدیٰ)، 'اردو شعرا کی حب الوطنی' (اکبر رضا جمشید)، 'مونوگراف: پروفیسر عبدالمغنی' (ڈاکٹر ریحان غنی)، 'مونوگراف: غلام سرور' (پروفیسر احسان اشرف)، 'سمندر بانٹتا ہے' (اثر فریدی)، 'ہم عصر شعری جہات' (بدر محمدی)، 'مردِ صحافت: شمس الہدیٰ استھانوی' (ڈاکٹر اسلم جاوداں)، 'ضیائے ولی (مولانا قمرِ عالم ندوی)، 'بچوں کی کتابیں: تعارف وتبصرہ' (ڈاکٹر عطا عابدی)، 'بچوں کے سنگ' (ڈاکٹر احسان عالم)، 'انطباق' (نثار احمد صدیقی)، 'دوبدو' (انور آفاقی)، 'جدید اردو صحافت کا معمار: قومی آواز' (سہیل انجم)، 'آدھی ملاقات' (مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی)، 'کھٹی میٹھی یادیں' (ڈاکٹر منصور احمد اعجازی)۔ کتابوں کے یہ نام بطور مثال ہیں۔ ان کتابوں سے بھی 'تاثرات' کے موضوعات وافادات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کتاب 'تاثرات' جن 52/کتابوں سے ملاتی ہے وہ کتابیں مصنف کے حُسنِ انتخاب اور بلند وپاکیزہ ذوقِ مطالعہ کا احساس دلاتی ہیں۔ اردو کے لیے زمینی وتحریکی سطح پر سرگرم رہنے کے باوجود تصنیف وتالیف کا کام بھی دل جمعی سے کرنا بڑی بات ہے۔ اس بڑی بات کے لیے انوارالحسن وسطوی ہم سب کی مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں۔

ترتیب

اردو ادب میں تکرار الفاظ: ایک جائزہ

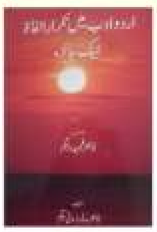

مصنف: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، مرتب: ڈاکٹر مہ نور زمانی بیگم
صفحات: 142، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: ملنسار اطہر احمد، 414-AI، گنگا بلاک،
نیشنل گیمز ولیج کورامنگلا، بنگلورو۔ 560047 (کرناٹک)

دکنیات اور لسانیات کے حوالے سے ادب کے سنجیدہ حلقوں میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے حینِ حیات میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں 'میسوری اردو اور نئے' اور 'شعور زبان' جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔ 'اردو ادب میں تکرار الفاظ: ایک جائزہ' اُن کی تازہ تصنیف ہے جسے ان کی رحلت کے بعد ان کی عزیز شاگردہ اور جانی پہچانی ادیبہ و محقق ڈاکٹر مہ نور زمانی بیگم نے اپنے مفصل مقدمے کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا موضوع ہے 'تکرار الفاظ' بقول مولوی عبدالحق الفاظ کی تکرار اردو زبان کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کے آخر میں شامل اپنے مضمون میں مولوی عبدالحق نے یہ بتایا ہے کہ حروفِ ربط وعطف کو چھوڑ کر کلام کے تمام اجزا اسم، صفت، ضمیر، فعل اور تمیز ایک ساتھ ہی مکرر استعمال میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنی کتاب میں اردو زبان کی اس خصوصیت کا اردو ادب کے حوالے سے نہ صرف تفصیلی جائزہ لیا ہے بلکہ کثیر تعداد میں اس کی مثالیں بھی کتاب میں شامل کی ہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی تحقیق اور مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں نے تکرار الفاظ کی خصوصیت کو طرح طرح سے اپنی تخلیقات میں استعمال کر کے ان کے معنوی حسن میں اضافہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے تعارف میں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ''تکرار الفاظ کا استعمال مفرد الفاظ کے ساتھ بھی کیا گیا ہے اور مرکب الفاظ کے ساتھ بھی، میں نے اس کتاب میں صرف شاعری میں مفرد الفاظ کی تکرار کا مطالعہ پیش کیا ہے اور اردو ادب کی ابتدا سے لے کر دور حاضر تک کی شعری تخلیقات میں اس کے استعمال کی مثالیں پیش کی ہیں۔''

فخر الدین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اردو کی پہلی شعری تصنیف مانی جاتی ہے۔ چنانچہ فہمیدہ بیگم نے اس پہلی شعری کتاب سے لے کر دور حاضر تک کے بیشتر معروف اور کم معروف شاعروں کے کلام سے مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے شاعروں کے کلام سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اردو کے مشہور ادبی مراکز سے دور رہے ہیں۔

اردو شاعروں نے شعری ضرورت کے تحت اشعار کے مصرعوں کی ابتدا میں تو کہیں درمیان میں اور کہیں آخر میں الفاظ کا مکرر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ نے اردو شاعری میں تکرار الفاظ کے استعمال کو نہ صرف تین زمروں سابقہ، وسطیہ اور لاحقہ میں تقسیم کیا ہے بلکہ اس کی بہترین مثالیں بھی درج کی ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ نے غزل سے لے کر لوک گیت تک اردو کی تمام مقبول شعری اصناف سے مثالیں منتخب کی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں چونکہ تکرار الفاظ کا جائزہ اردو شاعری تک محدود ہے اور نتیجتاً صرف شعری مثالیں ہی دی گئی ہیں تو فطری طور پر قاری کا ذہن صنعتِ تکریر/تکرار کی طرف جاتا ہے جو اردو شاعری کی ایک صنعت ہے۔ کتاب کی مرتب ڈاکٹر مہ نور زمانی نے اپنے مقدمے میں علامہ اقبال کے سولہ منتخب اشعار میں تکرار الفاظ کا اچھا اور کامیاب تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ تکرار الفاظ سے شعری کلام کے حسن، معنویت اور کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سے شاعر کے ذہن اور جذباتی کیفیات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

زیر نظر کتاب سے متعلق اردو کے نامور نقاد حقانی القاسمی کا مبسوط مضمون بھی اس میں شامل ہے جس میں انھوں نے کتاب میں شامل مواد کی تمام خصوصیات کا احاطہ کیا ہے۔ موصوف کے ادبی وتنقیدی مضامین کا اسلوب تخلیقی ہوتا ہے۔ ان کے مضمون کا عنوان ہے 'تکرار الفاظ: ایک نیا موضوعاتی جزیرہ' ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اس کتاب میں تکرار الفاظ کے حوالے سے صرف شعری جزیرہ دریافت کیا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے تحریک پا کر اردو کے ریسرچ اسکالر اس موضوع پر تحقیقی کام کے ذریعہ نثری جزیرے بھی دریافت کریں گے۔

رشید حسن خاں کے تحقیقی و تدوینی متعلقات

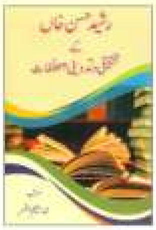

مرتب: ابراہیم افسر
صفحات: 396، قیمت: 550 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: ابراہیم افسر
مبصر: محمد فیضان اللہ
ریسرچ اسکالر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

مرتب نے مقدمہ میں سب سے پہلے اردو کی مشہور شخصیات کے حوالے سے تحقیق کی تعریف کی ہے، پھر رشید حسن خاں اور خواجہ احمد فاروقی کے مابین سرقہ کے معاملے کو واشگاف کیا ہے، ساتھ ہی خاں صاحب کی تحقیق و تدوین کے معروف و مقبول خیالات و آرا کو اس کتاب میں جمع کر کے کتاب کو تحقیق سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے مرجع بنا دیا ہے۔

ابتدائی صفحات میں خاں صاحب، کے مضامین پر گفتگو کی ہے، اور حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اول تو کہا ہے، لیکن 'پنجاب میں اردو' کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو ملحوظ نہ رکھنے پر ان کی پکڑ بھی کی ہے، اس کے باوجود انھوں نے تحقیق کے شعبے میں شیرانی کو شبلی، حالی اور آزاد پر فوقیت دی ہے، شبلی کے اسلوب کو مشتعل وخطیبانہ، تو آزاد کو افسانوی اسلوب کا شیدائی قرار دیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی دعوی کیا ہے کہ شبلی، حالی، اور آزاد کو تحقیق سے ذہنی مناسبت نہیں تھی (جس پر شاید بہت سے اہل نظر کو کلام ہو)

شیرانی صاحب کو محقق تو تسلیم کیا ہے لیکن تدوین میں ان کا دور کا بھی علاقہ نہیں ہے کے مدعی ہیں جبکہ عرشی کی تدوینی صلاحیت کے معترف ہیں۔ تدوین میں عرشی کو استاد معنوی تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ انھوں نے تدوین کے آداب، صحت متن، ترتیب متن، تعلیقات وحواشی وغیرہ عرشی صاحب سے سیکھے تھے۔ عرشی کی طرح قاضی عبدالودود کو بھی استاد معنوی مانا ہے، خاں صاحب انفرادی تحقیق کے بجائے اجتماعی تحقیق کے حامی ہیں۔

'شہرت، روایت اور تحقیق' میں اس بات پر گرفت کی ہے کہ شہرت اور روایت بھی کبھی کبھار تحقیق کا درجہ حاصل کر لیتی ہے لیکن سچائی سامنے آنے پر شہرت یا روایت دلائل کی عدم موجودگی میں عرش سے فرش پر آ جاتی ہے، روایتیں کس طرح بدلتی ہیں اس کی مثال میں زہر عشق، سحر البیان، میر حسن اور آصف الدولہ سے متعلق الگ الگ بیانات کو پیش کر کے یہ رائے قائم کی ہے کہ روایت کو تجزیہ و تقابل کے بعد قبول کیا جائے گا۔

'غیر معتبر روایتیں' میں لکھا ہے تحقیق و تدوین میں دو مشکلیں زیادہ پریشان کن ہیں۔(1) غیر معتبر روایتیں (2) الحاقی کلام۔

دوسرا حصہ تدوین سے تعلق رکھتا ہے، جس میں 18 مضامین ہیں۔ 'منشائے مصنف کا تعین' میں مصنف کے منشا کے مطابق اصل متن کو پیش کرنے پر زور دیا گیا ہے اور یہی تدوین کا مقصود اصلی ہے، 'تدوین اور اعراب نگاری'، 'دکنی ادب کی تدوین کے بعض مسائل' اور 'دکنی ادب کے نصاب کی ترتیب سے متعلق چند باتیں' یہ سابقہ مضمون کی توسیع ہے اس میں ایک طرف مولوی عبدالحق و محی الدین قادری زور کی دکنی خدمات پر تعریفی کلمات ہیں، تو دوسری جانب آپسی چشمک کے باعث جب بھی دونوں حضرات نے تدوین کے اصولوں سے انحراف کیا تو اس پر گرفت بھی کی۔

شیرانی اردو تحقیق کے روایت ساز تھے۔ شیرانی کی تاریخی اہمیت کے دو حصے کیے ہیں۔ عہد اور محرکات، دوسرے میں شیرانی کی تحقیقی روایت کے بعض اجزا پر کلام۔

فارسی تذکروں کے تراجم پر اجمالی گفتگو کی اور اس طرف بھی توجہ دلائی کہ لوگ فارسی کی طرف راغب تو ہوتے ہیں لیکن اکثریت تحقیق تو دور معمولی شناسائی سے بھی محروم ہوتی ہے۔ دستور الفصاحت اور مجموعہ نغز کو چھوڑ کر بقیہ تذکروں کے تصحیح متن میں احتمال ہے۔

یونیورسٹیز میں تحقیق کی کثرت اور تیز رفتاری کو پستی و کم معیاری کے زمرے میں شامل کرتے ہوئے اولین تربیت گاہ کو آسان پسندی، اور غلط اندیشی کا دبستان گردانتے ہیں، جب کہ تحقیق کے لیے ضروری معلومات اور تحقیقی مزاج کا ہونا بنیادی عنصر ہے، اس کے بعد بہت ہی اہم مرحلہ ہے موضوع کے انتخاب کا۔

ان اساتذہ و پروفیسران پر نقد ہے جو طلبہ کی رہ نمائی نہیں کرتے، اس کے کئی اسباب ہیں جیسے کہ وہ دوسرے انتظامی امور کے ممبر ہونے کی وجہ سے طالب علم کو وقت نہیں دے پاتے یا پھر ان میں تحقیقی اہلیت ہی نہیں ہوتی۔

ایک مضمون میں نگراں و ممتحنین کی غیر ذمے دارانہ رویے کو موضوع بنایا ہے، مثال میں ابو اللیث صدیقی کے 'لکھنؤ کا دبستان شاعری' میں مصنف نے غرائب اللغات کو خان آرزو کا بتایا ہے جبکہ وہ کتاب عبدالواسع ہانسوی کی ہے۔

محقق کو مالی منفعت سے سروکار نہ ہو نہ کسی اور چیز سے غرض کیونکہ تحقیق، کلاسیکی موسیقی کے مشابہ ہے کہ جس طرح کلاسیکی موسیقی میں عجلت، آسان پسندی، اور خفیف الحرکاتی کو مطلق دخل نہیں، بے حد ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے، اور آدمی اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے، جب دیکھو اسی خیال میں رہتا ہے، ایک ہی دھن، ایک ہی لگن۔

محققین کی چار قسمیں کی ہے اول وہ جو انفرادی طور پر تحقیقی فریضے کو انجام دے رہے ہیں، دوسری اداروں سے وابستہ حضرات، تیسری استاذ الاساتذہ کی ہے جو بلند مقامی کے باعث اتنے مصروف ہیں کہ تحقیقی کام کو وقت نہیں دے پاتے اور ان کے تحقیقی کارناموں میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے تو اس شاہ کار کی کیا حالت ہوگی اندازہ لگا لیجیے، چوتھی قسم ان طلبا کا گروپ ہے جن کی تربیت صحیح نہیں ہوتی تو ان کے کارنامے تو گھٹیا ہوں گے ہی۔ اجتماعی تحقیق کے لیے مناسب فضا، اور باصلاحیت ایڈیٹر کے پرزور حامی ہیں اور پھر آخر میں انفرادی تحقیق کو اجتماعی تحقیق پر ترجیح دی ہے۔ 'غیر معتبر حوالے' میں حوالے کی تین قسمیں بتائی گئیں ہیں، مستند کو معتبر بھی کہا جاتا ہے اور یہی قابل قبول ہے۔ الگ الگ اصطلاح کے باوجود استدلال کے وقت مشکوک اور غیر مستند کو ایک ہی درجے میں رکھا ہے۔ یعنی دونوں سے حاصل شدہ نتائج نا قابل قبول ہوں گے۔ حوالے کی قبولیت کے لیے شرط ہے کہ روایت میں تسلسل ہو، تسلسل کا انقطاع نہ ہو۔

پھر یہ محل نظر رہے گا کہ روایت ذاتی معلومات پر مبنی ہے؟ راوی معتبر ہے یا نہیں؟ غلط فہمی یا جانب داری سے معرا ہے کہ نہیں؟ یا اسی طرح کسی اور محرک کا اثر تو نہیں؟۔ روایت کے صحت انتساب کا جب تک یقین نہ ہو روایت قبول تو دور پیش تک نہ کرنا چاہیے، حافظے سے مدد تو لینا چاہیے لیکن آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کرنا چاہیے، اسی طرح کتاب دیکھے بغیر حوالہ بھی نہیں دینا چاہیے، تحقیق کی زبان کو آرائش اور مبالغے سے پاک ہونا چاہیے خاص کر صفاتی الفاظ۔

اعراب نگاری کے سلسلے میں کوئی اصول نہیں بنایا جا سکتا ہے۔) خاں صاحب اپنے مضمون 'دکنی ادب کے نصاب کے بارے میں' میں مولوی عبدالحق اور زور صاحب کے تدوینی کارناموں کو پست تدوینی معیار گردانتے ہیں، اس کا سبب عجلت پسندی و معاصرانہ چشمک بتایا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ صحیح متن ہمارے پاس نہ کے برابر ہے۔ 'تدوین کے مسائل' میں یہ باور کرایا ہے کہ تدوین میں اصل چیز ہے صحت متن، بقیہ متعلقات ہیں۔ تدوین میں لسانی شعور کی اہمیت بنیادی ہے۔ مدون کو مقدمہ اور اصل متن کے فرق اور اس کی اہمیت سے واقف ہونا چاہیے۔ 'اردو میں تدوین کے پچاس سال' میں آزادی کے بعد تدوین میں ان رجحانات کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے جو اہم و قابل اعتنا ہیں مثال میں معیاری اور قابل ذکر کاموں کو پیش کیا ہے اور کم معیاری کو بھی واضح کیا ہے۔ کسی متن کو اس طرح پیش کرنا جس طرح مصنف نے آخری بار اسے لکھا تھا، اس عمل کا نام 'تدوین' ہے اور یہ تحقیق سے مختلف عمل ہے متضاد نہیں۔ تحقیق کا مقصد حقائق یا یوں کہیے کہ واقعات کی ضروری تفصیلات کے ساتھ صحیح شکل کی بازیافت ہے۔ 'تنقید' کوئی کتاب، وہ نثری مجموعہ ہو یا شعری مجموعہ، اس کی ادبی قدر و قیمت کیا ہے، یہ تنقیدی عمل ہے۔ 'قابل اعتماد متن کی تلاش' میں خاں صاحب نے دیوان غالب نسخۂ اول کو اہمیت دی ہے جب کہ نسخۂ ثانی کو کالعدم قرار دیا ہے، اس کی وجہ اختلاف متن کی بارہ اور اختلاف املا کی مثالیں ہیں۔ 'صحت متن کی اہمیت' میں ہے کہ عام قاری ہو یا شارح دونوں متن کے اصل الفاظ کے پابند ہوں گے، متن ہمیشہ مصنف سے منسوب رہے گا اسی طرح اشعار میں قطعیت کے ساتھ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا صحیح متن کیا ہے۔ 'نصابی کتابوں میں املا، رموز اوقاف اور علامات کا مسئلہ' نصابی کتابوں میں املا کی درستگی پر زور دیا ہے خاص کر املا کی صحت، تلفظ کے تعین، توقیف نگاری کے التزام اور علامات کے استعمال کو جز لازم قرار دیا ہے۔'' اودھ کی نمائندہ مثنوی گلزار نسیم کی تدوین میں خاں صاحب نے چکبست و شرر کے معرکے کا تذکرہ کیا ہے، اور دونوں کی بے جا تختی اور ایک

دوسرے کے خلاف دلائل میں اصول سے تجاوز کرنے پر گرفت کی ہے اور اس میانہ روی کے ساتھ اپنا موقف سامنے رکھا ہے کہ موقف کو پیش کرنے میں کسی کی طرف جھکاؤ سے خود کو بچا لیا ہے۔'' بہ سلسلہ تدوین کلام غالب غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع دیوان غالب کے آخری شعر کو پیش کر کے املے کو موضوع بنایا ہے کہ منشائے مصنف کی خاطر یہاں اشعار کے اصل متن (جو اس وقت کے رائج رسم الخط کے موفق تھا) کو تبدیل کر کے نئے رسم الخط میں لکھا ہے، اس کے علاوہ غالب کے کچھ دعوے جو املا سے متعلق ہیں کو دوسرے ادبا کے دلائل سے غلط ثابت کیا ہے اور تدوین غالب کے لیے ایسے چار پانچ افراد کی کمیٹی تشکیل کا نظریہ پیش کیا ہے جو اس فن میں ماہر ہوں۔ 'دیوان درد' میں خواجہ صاحب کو صوفی تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کے بحیثیت صوفی شاعر والی رائے سے اختلاف کرتے ہیں بلکہ ان کی رائے میں درد کے جن اشعار میں تصوف کی اصطلاح نظم ہوئی ہیں ان میں شعریت کم ہے جبکہ عشقیہ اشعار میں شعریت زیادہ ہے۔ آخری مضمون 'تحقیق و تدوین کے رجحانات' میں آزادی کے بعد سے اپنے عہد تک کے تحقیق و تدوین سے متعلق سرگرمیوں پر طائرانہ روشنی ڈالی ہے۔

شاعری

لذت سنگ

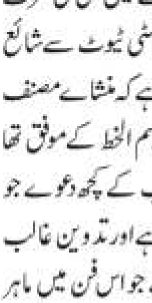

شاعر و ناشر: ڈاکٹر معصوم شرقی

صفحات: 272، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ایم نصر اللہ نصر، شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A، ستین بوس روڈ بلاک C، باکل تلہ، ہاوڑہ۔ 711109 (مغربی بنگال)

'لذتِ سنگ' اپنی منفرد شناخت رکھنے والے شاعر و ادیب ڈاکٹر معصوم شرقی کا عمدہ اور لائق صد ستائش شعری مجموعہ ہے۔ موصوف درجن بھر کتابوں کے خالق و مالک ہیں۔ جن میں غزلیات، تحقیق و تنقید، تذکرہ، ادبی مضامین اور نظمیں و رباعیات شامل ہیں۔ یہ ان کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔

272 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اصناف سخن کی کئی جہتوں ہیئتوں میں کلام موجود ہیں۔ جہاں تک حمد، نعت اور مناجات کا تعلق ہے تو ان اصناف پر طبع آزمائی کر کے شاعر نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ تقدیسی شاعری میں بھی کمال رکھتا ہے۔ اسے منقبت و مناجات کا شعور بھی ہے نیز غزلیات کا ماہر تو ہے ہی لیکن تقدسِ سخن سے بھی اسے خصوصی رغبت ہے۔ مثالیں دیکھیں۔

عطا بندے کو لطف خاص سے حفظ و اماں کر دے　　تو جس دم چاہے اپنی رحمتوں کو سائباں کر دے
مالک دو جہاں تو ہی مشہود ہے　　سچ ہے تو ذرے ذرے میں موجود ہے
کوئے نبی نگاہ میں ہے آج بھی مری　　بیٹھا ہوں میں نظارۂ جنت لیے ہوئے
میری پُر عجز دعاؤں میں اثر ہو جائے　　تو جو چاہے تو شبِ غم کی سحر ہو جائے

جہاں تک ان کی غزل گوئی کا تعلق ہے تو اس میدان کے وہ شہسوار رہے ہیں۔ رخش خامہ کو خوب دوڑایا ہے اور نوادرات غزل کی ڈھیر لگا دی ہے۔ ان کے اشعار میں عصری آگہی، بشری مسائل، جدت کاری اور ندرت نگاری کی بہترین مثالیں موجود ہیں جن میں تازگی، تنوع، شائستگی اور شگفتگی کے لوازمات کثرت سے ملتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سرِ مقتل بھی قتل و خوں کا منظر بول اٹھتا ہے　　جو قاتل کی زباں چپ ہو تو خنجر بول اٹھتا ہے
تباہی کو ہمارے حکمراں پردے میں رکھتے ہیں　　مگر ہر سمت بربادی کا منظر بول اٹھتا ہے
ہم ایسے ساکنانِ شہر ہیں جو شعلہ پیکر ہیں　　ہوا کا گرم جھونکا جسم چھو کر بول اٹھتا ہے
اس دورِ خلفشار میں جینا محال ہے　　زندہ اگر ہے کوئی تو اس کا کمال ہے

موصوف نے خود لکھا ہے:

''عصری حسیت آج کے ہر نئے فنکار کی پہچان ہے جو نئے نئے جلوں کے ساتھ نئی نئی علامتوں کا روپ دھار کر نت نئے پیکروں کے لباس میں ہر نئے ادیب و شاعر کی تخلیق میں نظر آتی ہے۔ اپنے عہد اور سماج کی سچائیوں کو اپنی غزلوں کا آئینہ دکھائے بغیر کوئی شاعر اپنی انفرادیت ثابت نہیں کر سکتا۔'' (عرض سخن ص 16)

بیشک اس مجموعے میں جو اشعار شامل ہیں ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں عالمی حقائق اور مسائل حیات کی خوبصورت نقاشی کی گئی ہے۔ سماج کو آئینہ بھی دکھایا گیا ہے اور پند و نصائح کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ مبالغہ آرائی سے دامن کو بچایا گیا ہے اور تصنع وتفرع سے گریز بھی کیا گیا ہے۔ زندگی کے مشاہدات اور واقعات کی روداد بھی پیش کی گئی ہے۔

شاعری کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ غزل میں شاعر کے جذبات و مشاہدات اور تجربات و محسوسات کی عکس ریزی اس کے معیار کو بلند کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہی کیا ہے اور زندگی کے مثبت پہلوؤں کی تلاش اس عہد بے قرار میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ معانی آفرینی کے اعتبار سے ان کی شاعری میں عصری بے قراری اور بشری بے چینی کے علاوہ سادگی، خلوص، دردمندی اور دلنوازی کے نقوش نمایاں ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

امیر شہر کے در پہ نہ جبہ سائی کر　　فقیر جس کا ہے اس در کی تو گدائی کر
صحرائے زندگانی کا معمار میں ہی تھا　　جس نے کیا تھا راہ کو گلزار میں ہی تھا
بیٹھا کبھی نہ راہ میں جو اوڑھ کے تھکن　　وہ تیز گام قافلہ سالار میں ہی تھا

ان اشعار کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ شاعر نے کھلی آنکھوں سے ہمہ تن گوش ہو کر اپنے گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور گہرائی سے زمینی حقائق کا مطالعہ کیا ہے اور معاشرے کے رشتوں کی شکست و ریخت زندگی کو عکس ریز کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ بیشک موصوف کی شاعری میں فکری جہات کی فراوانی اور شعور افروز طبیعت کی روانی دیکھی جا سکتی ہے۔ اسلوبیات کے معاملے میں ان کو مہارت حاصل ہے۔ زبان شستہ اور شائستہ استعمال کرتے ہیں۔ تراکیب و استعارے کی جدت کاری میں ماہر نظر آتے ہیں۔ زیر مطالعہ کتاب میں شامل بیشتر اشعار قاری کے ذہن و دل کو چھوتے ہیں اور انھیں ذہنی سکون اور روحانی خوشی عطا کرتے ہیں۔

میں جی رہا ہوں ترے لطف بے پناہ کے ساتھ　　کرم کو خاص ہے نسبت تری نگاہ کے ساتھ
شاخیں جدا جدا ہیں گلِ تر الگ الگ　　سارا چمن تو ایک ہے منظر الگ الگ
کرتا ہے کون دوسروں کے غم کا احتساب　　ہر شخص اپنے غم کے حسابوں میں قید ہے

بیشک موصوف کی شاعری لائق مطالعہ اور قابل ستائش ہے۔ انھوں نے روشنائی سے نہیں بلکہ خونِ جگر سے خامہ فرسائی کی ہے اور اپنے اشعار کی حنا بندی کی ہے۔ اس کے باوجود اہالیانِ شعر و سخن نے انھیں نظر انداز کر رکھا ہے۔ بقول شاعر۔

بے ہنر دے نہ سکے داد ہنر کی معصوم　　جو ہنر مند تھے وہ قدر ہنر کرتے رہے
فکر و فن میرے سنورتے ہیں اسی میں معصوم　　آئینہ میرا تخیل جو دکھاتا ہے مجھے

نغمہ عرفان عشق

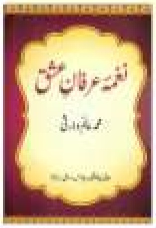

شاعر: محمد عالم وارثی
صفحات: 204، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2024
رابطہ: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، علی گڑھ، ممبئی
مبصر: ایم رئیس فاروقی (ایڈوکیٹ)
11/368، للیتا پارک، لکشمی نگر، دہلی۔ 92

زیر تبصرہ کتاب 'نغمۂ عرفان عشق' اردو کے شاعر محمد عالم وارثی کا شعری مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا انتساب اپنے والد گرامی شاہ محمد سلیمان وارثی کے قدموں میں، اپنی والدہ محترمہ حیبا خاتون کے قدموں میں اور شریک حیات عشرت جہاں کے نام اور اپنی بچیوں کے نام کیا ہے۔ ابتدا میں پیغام محبت نئی نسل کو اس طرح دیا ہے۔

نسل نو کو میں نیا گام دیے جاؤں گا　　اپنے بچوں کو یہ انعام دیے جاؤں گا
میرا شیوہ تو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں　　میں محبت ہی کا پیغام دیے جاؤں گا

شاعر کچھ اپنے بارے میں، عنوان سے اظہار خیال کرتے ہیں:

''میرے گھر میں ایک صوفی بزرگ حضرت بابا مست شاہ وارثیؒ ہوئے ہیں کا آستانہ مبارک وارث نگر (سون نگر) بارون، اورنگ آباد (بہار) میں موجود ہے۔

یہ فیضان بزرگان دین میرا ذہن شعروشاعری کی جانب بچپن ہی کے دور سے لگنا شروع ہوگیا تھا۔ شروعاتی دور میں میں اپنے گاؤں کی میلاد کی محفلوں، جلسہ و غیرہ کے پروگراموں میں نعت و منقبت پڑھا اور سنایا کرتا تھا۔ اور ساتھ ہی رمضان المبارک کا یہ طرز قصیدہ وغیرہ لکھنا شروع کر چکا تھا۔ میں اکثر میلاد شریف کی محفلوں میں اپنے برادر اکبر جناب محمد ظہیر الحسن خادم وارثی کا کلام پڑھا کرتا تھا جو کہ اپنے دور کے ایک اچھے صوفی شاعر رہے ہیں۔ جناب ناصح صاحب نے میری ذہانت اور شعر و ادب کا لگاؤ دیکھ کر کچھ شعر وغیرہ کہنے کا حوصلہ دیا اور شعر کہنے کے باریک گر بھی بتائے۔ انھیں تمام ادبی ماحول کے حوالے سے مجھے بھی شعر کہنے کا حوصلہ ملا اور میں کچھ ہی دنوں کی محنت مشق سے غزل نعت ومنقبت کہنے لگا۔ ایک بات ہمیشہ ناصح صاحب کہتے تھے کہ شاعری میں ہمیشہ مشاقی ہونی چاہیے۔ جس کا میں نے برابر خیال رکھا اور بعد میں باقاعدہ اصلاح جناب ناصح صاحب سے لینے لگا اور انہی کو اپنا شعری استاد بنالیا۔

اردو ادب میں محمد عالم وارثی کی شناخت اچھے شاعر کی ہے جنھوں نے ادب میں اپنی تخلیق کو محور و مرکز بنایا ہے۔ ان کی غزلوں کے کچھ اشعار حوالے کے طور پر پیش ہیں۔

رہزنی، لوٹ، اغوا اور دہشت گری　　روز اخبار میں یہ خبر دیکھیے
دامن عزم وعمل ہو جو اگر ہاتھوں میں　　راستہ خود تمھیں منزل کا پتہ دیتا ہے
کارواں جو تیز رو تھا رہ گیا منزل سے دور　　رہبروں میں آج کے جو کج روی باقی رہی
مجھ کو زمانہ کچھ نہ سمجھتا　　غم جو نہ بستے میرے جگر نہیں
اپنا دشمن نہ کیوں اسے سمجھے　　جس کی ہستی مٹا گئے آنسو
فکر یہ ہے کہ کب زمانے کو　　عشق کا احترام آئے گا
بس جاؤ تم جگر میں　　دل کی گلی ویران پڑی ہے
سوچ سمجھ کر پاؤں بڑھانا　　رستوں پر بارود بچھی ہے
اردو ہندی دو بہنیں ہیں　　اک شہزادی اک ہے رانی
گلے سے اسے خود لگانا پڑے گا　　لپٹتی نہیں سادگی چلتے پھرتے

جیسا کہ سبھی جانتے اور مانتے ہیں کہ اردو کی شعری اصناف میں غزل ہر دور میں بتدریج نئے نئے مراحل طے کرتی رہی ہے۔ بظاہر سننے اور پڑھنے میں جس قدر آسان صنف نظر آتی ہے۔ اسی قدر اپنے فنی پیکر میں مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اگر فنی طور پر عبور حاصل ہو بھی جائے تو اسلوب کے نقطۂ نظر سے اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کے لیے شاعر کو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ کیونکہ بے شمار شعرا کے ہجوم میں اپنی انفرادیت بنانا اور اسے قائم رکھنا آسان کام نہیں ہے۔

شام کے سائے

شاعر: سعید اختر اعظمی
صفحات: 160، قیمت: 200 روپے
ناشر: اپلائیڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: اسعد اللہ، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

'شام کے سائے' جناب سعید اختر اعظمی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جن کی شاعری مختلف شعری اصناف کے ارد گرد طواف کرتی ہے۔ نظم، غزل، قطعہ، رباعی، سہرا، رخصتی اور الوداعیوں کا حسین گلدستہ سجا کر وہ اپنے قارئین کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ تاہم انھیں غزل سے خاص لگاؤ ہے اور اس میں غزلیات کو ہی یکجا کیا گیا ہے۔

سعید اختر کی غزلیہ شاعری میں ہمیں ایسے بہت سے تشبیہات و استعارات مل جاتے ہیں جو موجودہ دور یا جدید رجحانات کے نہ صرف عکاس ہیں بلکہ حالات کے پیش نظر اپنے قارئین اور سامعین کے دلوں کے لیے تسکین کا سامان بہم پہونچاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے کلاسیکی رچاؤ اور شاعری کے تمام لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے اپنی شاعری کو سجایا ہے۔ اس مجموعے کی ابتدا، حمد اور نعت نبویؐ کے نذرانے سے کی گئی ہے۔ جب کہ پہلی غزل غالب کی زمین میں کہی گئی ہے۔ کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن میں کلاسیکیت کی مکمل جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

عجب تھا محفل خوباں میں حسن کا عالم　　نظر جھکی رہی، دل کا سلام ہو نہ سکا
تمھارے ہجر نے بخشی ہے ایسی تنہائی　　سوائے یاد کوئی اہتمام ہو نہ سکا

سعید اختر بسا اوقات لفظوں کے ہیر پھیر سے بھی معنی آفرینی پیدا کر دیتے ہیں، اس طرح سے قاری کو بڑی دلکشی محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ شعر کے جادوئی سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بہت تنہا ہے دل، آباد ہوگا تیری یادوں سے
ابھی سورج نہیں ڈوبا، ذرا سی شام ہونے دو
چراغوں کو ہواؤں کی رفاقت راس آئی ہے
اندھیرے ہوں گے شرمندہ، ضیا کو عام ہونے دو

چھوٹی بحر میں غزل کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، تاہم اختر صاحب کو اس پر بھی عبور حاصل ہے اور انتہائی مشکل سے مشکل بات کو بہت ہی آسانی اور چابکدستی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال دیتے ہیں یہ مصرعہ دیکھیے۔

یکجا میں کس طرح کروں لفظ و خیال کو　　پہنچا نہیں ابھی ہے تخیل کمال کو
بزم سخن میں تذکرہ ان کا ہے ہر طرف　　اختر غزل میں برتا ہے حسن غزال کو

انسان جب اپنے وطن اور اپنوں سے دور ہوتا ہے۔ دیار غیر میں بھلے ہی بھی

آرام مل جائے لیکن اس آرام دہ حالت میں بھی اسے اپنوں کی یاد مسلسل ستاتی ہے اوراس کا اظہار اختر صاحب کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔

نفس نفس تجھے جیتے ہیں زندگی ہر پل　　　خبر ہمیں بھی ہے یہ عمر مختصر ہے میاں
دیار غیر، رفاقت تری ہے کچھ دن کی　　　بلا رہا ہے مرا گاؤں، واں پہ گھر ہے میاں

ہمیں یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں کہ اختر سعید اعظمی صاحب کا یہ شعری مجموعہ ان کی بے پناہ شعری تخلیقات کا غماز ہے اور کلاسکیت کا ترجمان بھی۔ موجودہ دور کے شعرا سے یہ شکایت عام طور پر سننے کو ملتی ہے کہ کلاسیکی رنگ ندارد۔ تاہم قارئین اس شعری مجموعے سے یا یوں کہا جائے کہ دیوان سے مایوس نہیں ہوں گے کیوں جناب اختر نے اس کی ترتیب میں 'دیوان' کے مروجہ اصولوں کا خیال رکھا ہے۔ اس دیوان میں آپ کو زمانے کی ہر ستم ظریفی کی عکاسی ملے گی۔ خون دل سے جو بھی تحریر لکھی جائے گی پائندہ تر اور تابندہ تر ہوگی۔ مبصر اس موقع پر صاحب دیوان کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے بقیہ کام قارئین کے حوالے کرتا ہے۔ چلتے چلتے ایک شعر آپ کے حوالے۔

اختر ترا ہے ذکرِ سخن اُن کی بزم میں　　　مسرور دل ہے آج، نئی بات ہوگئی

رسائل و جرائد

ادبی جرنل (خصوصی پیش کش: جھارکھنڈ کے اردو شعرا و ادبا کی ادبی خدمات)

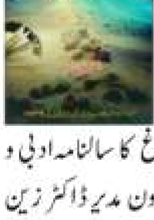

مدیر: ڈاکٹر ہمایوں اشرف
صفحات: 552، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2023
ناشر: شعبہ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ۔ جھارکھنڈ
مبصر: ڈاکٹر خان محمد رضوان
ڈی۔ 307 ایم ایم آئی پی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

'ادبی جرنل' شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ کا سالنامہ ادبی و تحقیقی جرنل ہے۔ جس کے مدیر ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور معاون مدیر ڈاکٹر زین رامش ہیں۔ اس دستاویزی رسالے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس نوعیت کے خالص ادبی یک موضوعی رسائل و جرائد نے تحقیق و تنقید کے ذوق کو نہ صرف پروان چڑھایا ہے بلکہ معیارِ فن کو بھی باقی رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ خصوصی ادبی جرنل چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ یعنی اداریہ جسے مدیر ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے تحریر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے خوبصورت طریقے سے ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد، اس کے اثرات اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں قابلِ قدر خدمات کا بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد معاون مدیر ڈاکٹر زین رامش کا مضمون 'جھارکھنڈ کی خواتین افسانہ نگار اور ان کا نسائی شعور' کے عنوان سے معلوماتی اور اہم مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے جھارکھنڈ کے عصری منظرنامے اور افسانہ نگار خواتین کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا ایک معلوماتی مضمون 'جھارکھنڈ کے غیر مسلم اردو افسانہ نگار' کے عنوان سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ جھارکھنڈ کے غیر مسلم افسانہ نگاروں میں گربچن سنگھ، ہربنس سنگھ دوست، رابندر سنگھ لکھاری، پریم چند کلین، آزاد گرداس پوری، سورج سنگھ کرن، جوگندر سنگھ دیپ، مرلی منوہر، کے ڈی ملہوترا، دلجیت سنگھ آزاد اور جوگا سنگھ انور وغیرہ اہم ہیں۔ جن کے بغیر جھارکھنڈ کی افسانہ نگاری کی تاریخ کو مکمل نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں شہر آہن کے شعری مجموعے (احمد بدر)، اردو ادب کے حوالے سے جھارکھنڈ میں طنز و مزاح (نٹ کھٹ عظیم آبادی)، جھارکھنڈ میں اردو نظم نگاری اکیسویں صدی میں (حسن چشتی) اور 'جھارکھنڈ میں اردو افسانہ کا جائزہ' (ناز آفرین) کا مضمون بھی قابلِ مطالعہ اور اہم ہے۔ اس کا دوسرا حصہ 'جھارکھنڈ: شاعری کے حوالے سے' ہے۔ جس کے تحت چوبیس مضامین شامل ہیں۔ سبھی مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں مگر میں یہاں صرف چند کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ 'وہاب دانش کی نظمیں' کے عنوان سے پروفیسر کوثر مظہری نے خوبصورت مضمون تحریر کیا ہے۔ انھوں نے وہاب دانش کی نظموں کے متنوع کینوس کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ اس اہم شاعر کی نظموں میں کثیر الجہتی، لفظیات کا نادر برتاؤ، طرز اظہار کی ندرت انھیں کس طرح ن م راشد کے ہم رکاب کر دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جھارکھنڈ کے صاحب کرامات شعرا میں وہاب دانش، پرکاش فکری اور صدیق مجیبی ایسے شاعر ہیں جن پر خاطر خواہ کام نہیں ہوسکا ہے بلکہ ان کا جو حق تھا اس کا اقل قلیل بھی ابھی ادا نہیں ہوا ہے۔ 'سرور ساجد کی غزل گوئی' کے عنوان سے ڈاکٹر قاسم فریدی نے عمدہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر قاسم فریدی نے اپنے مضمون میں جو اشعار کوٹ کیے ہیں ان کو پڑھ کر یک گونہ خوشی کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ پروفیسر سرور ساجد نہ صرف ایک مخلص انسان بلکہ وہ خوبصورت لب و لہجے کے منفرد شاعر بھی ہیں۔ ان کا شعری منطقہ وسیع اور تخیل کی پروازی اپنی مثال آپ ہے۔ 'انور ایرج کی غزلیں' ڈاکٹر عطا عابدی کا لائق مطالعہ مضمون ہے۔ یہ سچ ہے کہ انور ایرج ایک سچا اور صداقتوں کو زبان دینے والا شاعر ہے۔ ان کی شاعری ادب کے کسی بھی فکری خانے میں مقید ہونے کی روادار نہیں، وہ اپنی فکر کے شاعر ہیں۔ ان کا فکری کینوس ہم عصر شعری رویے سے مستعار نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی فطرت کی اپج ہے۔ ان کا بیانیہ ہم عصروں سے منفرد اور نمایاں ہے۔ اس حصے میں شامل باقی مضامین بھی لائق تحسین ہیں۔ اس جرنل کا تیسرا حصہ 'جھارکھنڈ: فکشن کے حوالے سے' کے عنوان سے ہے۔ جس میں کل 19 مضامین شامل ہیں۔ جن میں عشرت ظہیر کا مضمون 'منظر کاظمی: لکشمن ریکھا کے تناظر میں' بے حد عمدہ اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر رونق شہری کا مضمون 'خوابوں کے درمیاں' علاقائی ناولوں میں ایک اہم اضافہ، لائق مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مضمون 'اسلم جمشید پوری کا افسانوی رنگ' جہان معنی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر عمران عراقی کا مضمون 'میرے دیش کی مٹی' کے عنوان سے ہے جو کہ محنت سے لکھا ہوا مضمون ہے۔ سبھی مضامین معلوماتی اور اہم ہیں۔ جرنل کا چوتھا حصہ 'جھارکھنڈ: تحقیق و تنقید کے حوالے سے' ہے جس میں 17 اہم مضامین شامل ہیں۔ ڈاکٹر سرور حسین کا مضمون 'وہاب اشرفی کی شعریات نقد' پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ وہاب اشرفی کے مطالعے کا دائرہ قدیم ادبی روایات سے لے کر جدید ادبی روایت سے مملو ہے۔ وہاب صاحب تنقید کو مشکل ترین عمل سمجھتے تھے اور ادب میں آفاقیت کے بھی قائل تھے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد شارب کا مضمون 'ماہر ابوالکلامیات: جمشید قمر' کے عنوان سے ہے، جمشید قمر کے تعلق سے یہ بھرپور مضمون ہے۔ ڈاکٹر شارب نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ڈاکٹر جمشید قمر کی کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اس حصے میں ڈیٹا بیس کام کے طور پر کاجل پروین نے 'شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات برائے پی ایچ ڈی' (ڈگری ایوارڈ یافتہ) کے عنوان سے اہم کام کیا ہے۔

انھوں نے بڑی دقت نظر سے 1997 سے 2022 تک جن اسکالرز نے تحقیقی کام انجام دیے ہیں ان کی مکمل تفصیل یہاں درج کی ہے۔ اسی طرح وحیدہ رحمٰن نے 'شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی میں جاری تحقیقی کام برائے پی ایچ ڈی ڈگری' کے موضوع عرق ریزی کے ساتھ مواد اکٹھا کرنے کی سعی کی ہے۔ اس حصے کے دیگر مضامین بھی قابلِ مطالعہ ہیں مگر سب کا تذکرہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ اس جرنل کا پانچواں حصہ 'شعبے کے مطبوعہ تحقیقی مقالے' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا مضمون 'بہار اور جھارکھنڈ میں اردو غزل:1960 کے بعد: ایک جائزہ'، غالب نشتر کا مضمون 'سرور حسین کی فکشن تنقید' اور محمد ذاکر حسین کا مضمون 'علامہ ارشد القادری: حیات وخدمات۔ ایک جائزہ' قابل قدر ہے۔ اس کا چھٹا حصہ 'شعبے کی ادبی وتہذیبی سرگرمیاں' کے عنوان سے ہے۔ جس میں شعبے کی سرگرمیوں پر ایک معلوماتی نوٹ درج ہے۔ میں اس خوبصورت اور غیر معمولی اہمیت کے حامل جرنل کی اشاعت پر ڈاکٹر ہمایوں اشرف اور ڈاکٹر زین رامش صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دو ماهی 'افسانه نما' (خصوصی شمارہ برائے خواتین)

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر شہاب افسر خان، مدیر: محمود شاہد
صفحات: 104، قیمت: 60 روپے
سنہ اشاعت: مارچ-اپریل 2024
ناشر: افسانہ نما، 12/168، ایم آر اسٹریٹ، کڑپہ۔ 516001 (آندھرا پردیش)
مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی۔ 25

مرزا محمد رفیع سودا کا ایک شعر ہے۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر　　　اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

حضرت سودا کو کیا پتا تھا کہ آگے چل کر افسانچے جیسی ایک صنف وجود میں آئے گی اور یہ افسانچہ ایک بہترین اظہاری متبادل قرار پائے گا۔ افسانچے کی صنفی شناخت کیا ہے، اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ایجاز واختصار صرف کلام کی معنویت نہیں بلکہ عہد حاضر کی ضرورت بھی ہے۔ شاعری کی طرح نثری بیانیوں کو بھی حشو وزوائد سے پاک ہونا چاہیے۔ Superflous Words اور اطناب آمیز الفاظ وخیال سے گریز بہت ضروری ہے کہ اب 'طلسم ہوش ربا' اور 'داستان امیر حمزہ' کا دور نہیں رہا، وہ دن اور تھے جب 'بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے' والی کیفیت تھی۔ مگر یہ دور کم کلمات میں مفاہیم بسیار کا ہے۔ Concise Writing بھی ایک ہنر ہے۔ نطشے نے بہت اچھی بات کہی تھی کہ 'میں دس جملوں میں وہ کچھ کہنا چاہتا ہوں جو لوگ پوری پوری کتابوں میں نہیں کہہ پاتے۔'

اردو میں یک صنفی رسالوں کی روایت رہی ہے۔ کچھ رسالے صرف شاعری، قانون، طب یا طنز وظرافت سے مختص رہے ہیں۔ 'افسانہ نما' بھی اسی روایت کی ایک کڑی ہے اور اس رسالے نے مختصر مدت میں اپنی شناخت بھی قائم کرلی ہے۔ یہ خالص افسانچوں پر مشتمل برصغیر کا پہلا رسالہ ہے۔ اس کے کئی شمارے شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔ یہ شمارہ خواتین کے افسانچوں سے مختص ہے کیونکہ زبان وتہذیب کے فروغ میں خواتین کا جو کردار رہا ہے اس کا مکمل اعتراف کسی بھی عہد میں شاید ہی کیا گیا ہو۔ یہ شکوہ بجا ہے کہ عورتوں کو تعلیم اور تخلیق دونوں سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر اب منظر نامہ تبدیل ہوا ہے آج کا دور خواتین کے لیے بادِ نو بہار کی حیثیت رکھتا ہے اور خواتین کی تخلیقی خدمات کا اعتراف بھی کیا جارہا ہے کیونکہ اساسی طور پر زبان وادب کے تحفظ میں خواتین کا کردار زیادہ اہم ہے۔ ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خیال کی اہم کتاب 'مغل اور اردو' میں جمیل مظہری کاظمی ایم اے کلکتہ نے ایک بہت اہم اشارہ کیا ہے کہ ''خواتین کی بدولت ہی اردو بنی اور انہی کی زبان اب تک نتھری سمجھی جاتی ہے... یہ ہماری عورتیں ہی ہیں جنھوں نے بیرونی اثرات سے اس زبان کو اب تک محفوظ رکھا اور یہ ہماری عورتیں ہی ہیں جنھیں اپنی اردو پر ہم سے بہت زیادہ حق حاصل ہے۔'' شاید یہ خصوصی شمارہ اسی حقیقت کا ایک اعتراف نامہ ہے۔ اس میں پوری دنیا کی خواتین کی کہکشاں ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس، پاکستان، عمان، کویت، سعودی عرب جیسے ممالک سے جہاں خواتین افسانچہ نگاروں کی نمائندگی ہے وہیں ہندوستان کی 28 ریاستوں میں سے 13 ریاستوں اور ایک Union Territory سے تعلق رکھنے والی خواتین اس شمارے میں موجود ہیں۔ صرف اروناچل پردیش، آسام، چھتیس گڑھ، گوا، گجرات، ہریانہ، ہماچل پردیش، جھارکھنڈ، کیرالہ، منی پور، میگھالیہ، میزورم، ناگالینڈ، پنجاب، سکم، تری پورہ، اتراکھنڈ جیسی ریاستیں اس میں شامل نہیں ہو پائی ہیں۔

اس خصوصی شمارے کے انتخاب، ترتیب وتدوین کا کام مسقط عمان کی عذرا علیم نے انجام دیا ہے اور اپنے اداریے میں خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے عمدہ گفتگو کی ہے۔ 'حد ادراک' کے عنوان سے ڈاکٹر فریدہ تبسم کی ایک بصیرت افروز تحریر بھی شامل ہے جس میں انھوں نے خواتین کی تخلیقیت کے حوالے سے بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ ''دورِ حاضر میں خواتین کے ادب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اب، ہر موضوع پر کھل کر لکھتی ہیں اور اسے تخلیق میں تحلیل کرکے خوبصورتی سے قلم بند کررہی ہیں۔ افسانہ ہو کہ افسانچہ، موضوعات کی انفرادیت اور جدید مسائل وموضوعات پر ارتکاز کررہی ہیں۔ سماجی، سیاسی، معاشی ومعاشرتی برائیوں کی عکاسی خواتین کے شعور و آگہی اور بصیرت کا بین ثبوت ہے۔ ان مسائل کا مشاہداتی اظہار عصری تقاضوں کے تحت پیش کررہی ہیں۔'' ڈاکٹر یاسمین اختر نے 'افسانچے کے خدوخال' کے عنوان سے اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ لالہ رخ بخاری کی تحریر 'عورت تاریخ کے آئینے میں' ایک نئے زاویے سے روشناس کراتی ہے۔ طاہرہ کاظمی کی تحریر کا عنوان ہی بہت چونکانے والا ہے۔ 'اگر عورت بچہ نہ پیدا کرے تو'۔ اس خصوصی شمارے میں خواتین کے افسانچے شامل ہیں۔ یہ تمام افسانچے خواتین کی تخلیقی اور فکری جولانی کا مظہر ہیں۔ ان میں طول فضول اور تمہید طولانی سے بچنے کا جو ایک کارگر نسخہ پیش کیا گیا ہے اس نسخے کو آزمانے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ اختصار وایجاز کا عہد ہے، جہاں الفاظ اور خیال کا بے جا زیاں شاید وقت اور تخلیقی توانائی کی توہین ہے۔ افسانچوں کے علاوہ اس میں ڈاکٹر یاسمین اختر سے کوثر روز کا انٹرویو اور رقیہ جمال کے افسانچوں کے مجموعے 'غول' پر عذرا علیم کا تبصرہ ہے۔ تاثرات کے تحت ڈاکٹر شائستہ یوسف، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اور شگفتہ شفیق کی تحریریں شامل کی گئی ہیں جن سے رسالے کی معنویت، افادیت اور اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ محمود شاہد صاحب نے 'افسانہ نما' کے ذریعے افسانچے کو فروغ دینے کی جو کوشش کی ہے یقینی طور پر اس کوشش میں انھیں کامیابی ضرور ملے گی کہ دراصل طوالت سے اب صرف قاری کو نہیں بلکہ قلمکاروں کو بھی وحشت ہونے لگی ہے۔ ■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت و رفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل میں 'قومی خلائی دن' پر پروفیسر سریش چندرا کا لیکچر

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں National Space Day پر ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی شروعات ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک)، قومی اردو کونسل کے استقبالیہ کلمات سے ہوئی۔ انھوں

نے آج کے خطیب اور موضوع کا تعارف کرایا۔ اس موقعے پر پروفیسر سریش چندرا (ڈپٹی ڈائرکٹر امیٹھی یونیورسٹی) نے چندریان کی تاریخ اور اس کی اہمیت وافادیت پر مختصر روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے اور ہمارے ملک کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ 23 اگست 2023 کو چندریان 3 کا وکرم لینڈر چاند کے قطب جنوبی پر کامیابی کے ساتھ اترا اور اس طرح امریکہ، چین اور سوویت یونین کے بعد ہندوستان کامیابی کے ساتھ چاند پر پہنچنے والا چوتھا ملک بن گیا، چندریان-3، 14 جولائی 2023 کو لانچ کیا گیا تھا اور تقریباً اکتالیس دنوں کے سفر کے بعد اس کی کامیاب سافٹ لینڈنگ ہوئی، اس لیے آج کے دن کو Day of Pride and Proud کہا جائے تو بالکل بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے چندریان-2، 22 جولائی 2019 کو لانچ کیا گیا تھا لیکن لینڈ کرتے وقت بعض تکنیکی وجوہات کی بنا پر یہ 6 ستمبر 2019 کو کریش کر گیا، اس لیے چندریان 3 میں کچھ تبدیلی کی گئی جس کی وجہ سے اس کی سافٹ لینڈنگ آسان ہوگئی اور چندریان 3 کامیابی کے ساتھ لینڈ کر گیا، سب سے پہلے چندریان۔1، 22 اکتوبر 2008 کو لانچ کیا گیا تھا اور یہ مشن کامیاب بھی ہوا تھا، یہ اسرو کی بڑی کامیابی تھی، پروفیسر سریش چندرا نے اسرو کی تاریخ اور اس ادارے کی اہمیت پر بھی گفتگو کی، انھوں نے لینڈر وکرم، پرگیان، پلانیٹ، گرہ وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی اور سامعین کے سوالات کا جواب بھی تسلی بخش دیا۔ محترمہ ذیشان فاطمہ نے شکریے کی رسم ادا کی۔ اس پروگرام میں کونسل کا پورا عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 اگست 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں مولوی محمد باقر دہلوی پر خطبہ

نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے زیر اہتمام اردو کونسل کے صدر دفتر میں پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر پر یادگاری خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ خطبہ مشہور صحافی معصوم مرادآبادی نے دیا جبکہ صدارت سینئر صحافی اور ادیب اسد رضا نے کی۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے ڈائرکٹر قومی کونسل ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ معاشرہ اور سماج میں صحافی کا کردار بہت اہم ہوتا ہے اسی کے ذریعے عام لوگوں میں

بیداری آتی ہے۔ ادیب اور صحافی لوگوں کی ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، مادر وطن کی آزادی میں بھی صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب باضابطہ صحافیوں کے کردار پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے، اردو کے ممتاز صحافیوں پر جامعات میں بھی تحقیق ہونی چاہیے۔ آج مولوی باقر جیسے عظیم صحافی اور مجاہد کو یاد کیا جانا چاہیے اور ان کے کارناموں سے لوگوں کو واقف کرانا چاہیے ان ہی مقاصد کے تحت آج کے خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ معصوم مرادآبادی نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والا صحافی اسی اردو زبان نے پیدا کیا تھا، جس کی کوکھ سے انقلاب زندہ باد کے نعرے نے جنم لیا تھا۔ اس جید صحافی اور شہید اعظم کا نام تھا مولوی محمد باقر۔ اردو والے عام طور پر 'آب حیات' والے مولانا محمد حسین آزاد کے نام سے تو واقف ہیں لیکن کم ہی لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ان کے والد مولوی محمد باقر اردو کے ایک جید صحافی تھے۔ اور انھوں نے پہلی جنگ آزادی میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ انھیں یہ سزا اپنے ہفتہ وار 'دہلی اردو اخبار' میں پہلی جنگ آزادی کی والہانہ اور سچی رپورٹنگ شائع کرنے کے جرم میں دی گئی تھی۔ انھوں نے مزید کہا کہ انقلاب 1857 کے دوران سب سے زیادہ جری کردار 'دہلی اردو اخبار' نے ادا کیا۔ 17 مئی کو ہفتہ وار 'دہلی اردو اخبار' کا شمارہ منظر عام پر آیا تو اس کے صفحات انقلاب کی خبروں سے لبریز تھے۔ سینئر صحافی اسد رضا نے صدارتی کلمات میں کہا کہ مولوی باقر مجاہد قلم تھے، اتحاد بین المذاہب والمسالک میں مولوی باقر کا اہم کردار رہا ہے۔ ڈائرکٹر شمس اقبال قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس عظیم صحافی کو یاد کرنے کے لیے خطبہ کا انعقاد کیا۔ کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے اظہار تشکر کیا۔

اس موقعے پر جے این یو اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے طلبا کے علاوہ ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، انتخاب عالم (ریسرچ آفیسر)، شاہنواز محمد خرم (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر)، محمد اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر امتیاز احمد (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) اور کونسل کے دیگر عملہ اور ملازمین موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2024

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن نئی دہلی کے طلبہ کے ساتھ انٹریکشن

نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے طلبہ کے لیے ایک انٹریکشن پروگرام کیا گیا جس میں طلبہ کے ساتھ وہاں کے اساتذہ بھی شریک ہوئے۔ پروگرام میں طلبہ سے بات کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر شمس اقبال نے کہا کہ جرنلزم آج کی ضرورت ہے اور جرنلزم اعتماد کی چیز ہے، اس لیے آپ جتنا زیادہ دوسرے ادارے کے لوگوں سے ملیں گے اور کتابوں کا مطالعہ کریں گے اتنی ہی آپ میں خوداعتمادی آئے گی اور اپنے میدان میں کامیاب وکامران ہوں گے۔ جرنلزم کی باریکیوں کو سمجھنے اور اس کے علاوہ پبلشنگ کے طور طریقوں کو بھی جاننے کی کوشش کیجیے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ صحافت وادی پرخار ہے اور صحافت کا بنیادی کام ویرانے کو آباد کرنا ہے، انھوں نے روزنامچہ اور ڈائری لکھنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ صرف صحافتی نظریات اور تھیوریز پڑھ کر صحافت نہیں آسکتی بلکہ اس کے لیے عملی مشق وممارست ضروری ہے، اس وقت آپ کے لیے ضروری ہے کہ صحافت کے متعلق جو اساسی اور بنیادی نوعیت کی کتابیں ہیں انھیں پڑھیں تاکہ آپ صحافت وابلاغ کے جملہ طریقۂ کار اور ذرائع اظہار سے کما حقہ واقف ہوسکیں، اس دوران طلبہ نے صحافت اور پبلشنگ سے متعلق سوالات کیے۔ اس پروگرام میں نائب مدیر ڈاکٹر عبدالباری، آئی آئی ایم سی کے استاد محمد ثاقب، ابھیشیک سنگھ، پون سنگھ، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر اجمل سعید اور محمد توثیق وغیرہ بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 ستمبر 2024

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

ترقی یافتہ ہندوستان میں خواتین کا کردار

نئی دھلی: نائب صدر جگدیپ دھنکھڑ نے طلبا کو نئے پارلیمنٹ ہاؤس کا دورہ کرنے اور ہندوستان کے

ترقی یافتہ ملک بننے کے سفر میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ نائب صدر جمہوریہ دہلی یونیورسٹی کے بھارتی کالج میں منعقدہ 'ترقی یافتہ ہندوستان میں خواتین کا کردار' کے عنوان سے ایک پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کر رہے تھے۔ اس موقعے پر ان کی اہلیہ ڈاکٹر سدیش دھنکھڑ بھی موجود تھیں۔ تقریب کے دوران کالج کے طلبہ، اساتذہ اور عملے سے خطاب کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے ہندوستان کی ترقی میں خواتین کے تبدیلی لانے والے تعاون پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اس تالے کی کنجی ہے جس کے ذریعے ترقی کے دروازے کھلتے ہیں۔ انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ خواتین کی نمائندگی میں نمایاں پیش رفت کی ستائش کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ لوک سبھا اور ریاستی مقننہ میں خواتین کے لیے ایک تہائی ریزرویشن گیم چینجر ثابت ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اقدام پالیسی سازی میں انقلاب لائے گا اور اس بات کو یقینی بنائے گا کہ درست لوگ فیصلہ سازی کے عہدوں پر ہوں۔ پرگرام کی صدارت کرتے ہوئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کہا کہ دہلی یونیورسٹی نے حال ہی میں جاری کردہ نیشنل انسٹی ٹیوشنل ریکنگ فریم ورک (این آئی آر ایف) میں چھٹا مقام حاصل کیا ہے جو گزشتہ سال کی 11ویں پوزیشن سے بہت زیادہ ہے۔ وائس چانسلر نے ملک میں خواتین کے تحفظ کی صورت حال پر بھی تشویش کا اظہار کیا اور سب پر زور دیا کہ وہ خواتین کے لیے بہتر ماحول پیدا کرنے کے لیے کوششیں کریں۔ پروگرام کے آغاز میں بھارتی کالج کی چیئرپرسن پروفیسر کویتا شرما اور پرنسپل پروفیسر (ڈاکٹر) سلونی گپتا نے نائب صدر اور دیگر تمام معززین کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعے پر کالج فیکلٹی کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 اگست 2024

آزادی کا تصور

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام یوم آزادی کے موقعے پر 'آزادی کا تصور' کے موضوع پر ایک سمپوزیم

کا انعقاد کیا گیا۔ سمپوزیم کی صدارت سینئر صحافی اور ایڈیٹر رام بہادر رائے نے کی۔ سمپوزیم میں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نامور افراد نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے اکیڈمی کے سکریٹری کے سری نواس راؤ نے کہا کہ آزادی ہمارا بنیادی حق ہے۔ اس کی کئی شکلیں ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ مساوات کے قریب ترین ہے۔ ڈاکٹر برجیش شرما نے کہا کہ آزادی کا تصور اسی وقت پورا ہوگا جب سب کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ معروف تھیٹر ڈائریکٹر چترنجن ترپاٹھی نے کہا کہ اظہار رائے کی آزادی سب سے اہم ہے اور یہ ہماری بقا کے لیے فیصلہ کن ہے۔ معروف ماہر تعلیم جے ایس راجپوت نے کہا کہ ہمارا آزادی کا تصور مہاتما گاندھی کے گرد گھومتا ہے۔ ہماری تعلیم میں قربانی کی اہمیت، معاشرے میں ایک دوسرے کی مدد کرنا وغیرہ جیسی زندگی کی بہت سی اقدار کو اجاگر کیا جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ استاذ کا احترام کرنا بہت ضروری تھا، ہم وہ بھی نہیں کر سکے۔ مشہور وکیل کملیش جین نے کہا کہ آزادی کا کوئی مطلب نہیں ہے جب تک سب کے لیے انصاف نہ ہو۔ سینئر صحافی اور گاندھی پیس فاؤنڈیشن کے صدر کمار پرشانت نے کہا کہ آزادی کے ساتھ بہت سی ذمے داریاں آتی ہیں۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہم آزادی کے ساتھ آزادی کی بات کر سکتے ہیں۔ مشہور مصنفہ اور دلت سماجی کارکن انیتا بھارتی نے کہا کہ شخصی آزادی کے علاوہ سماجی آزادی بھی بہت ضروری ہے۔ مشہور صحافی شیوکمار رائے نے کہا کہ آزادی کے تصور میں ہمیں ہندوستان کی آئینی حدود کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اجتماعی زندگی میں بھی آزادی کا ادراک ضروری ہے۔ شوبھنا نارائن نے کہا کہ آزادی کے درخت کی دیکھ بھال ہماری ذمے داری ہے، تبھی یہ مستقبل میں محفوظ رہے گا۔ مشہور صحافی اور اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس کے صدر رام بہادر رائے نے کہا کہ سیاسی آزادی اور آئین کی تشکیل ملک کے لیے ایک بڑا واقعہ تھا۔ پروگرام کے آخر میں حاضرین کے سوالات کے جوابات بھی دیے گئے۔ پروگرام کی نظامت ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر انوپم تیواری نے کی۔ اس موقعے پر مختلف علوم وفنون سے وابستہ اہم شخصیات کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبا موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اگست 2024

عربی ادبیات کے فروغ میں ہندوستانی خواتین کا کردار

نئی دھلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی اور اسلامی فقہ اکیڈمی کے اشتراک سے 'عربی ادبیات کے فروغ میں ہندوستانی خواتین کا کردار' کے موضوع پر دو روزہ سمینار

کا افتتاح کیا گیا۔ افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے ڈی یو کے ڈین آف کالجز پروفیسر بلرام پانی نے کہا کہ تعلیمی و سماجی سطح پر ہر دور میں خواتین کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ خاندان کی قیادت خاتون کرتی ہے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں ان کا نمایاں رول ہے۔ استقبالیہ کلمات میں صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے مہمانان کا تعارف پیش کیا اور موضوع کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی فقہ اکیڈمی کی جانب سے تجویز کردہ اس اہم موضوع کو شعبۂ عربی نے پسند کیا۔ اسلامی فقہ اکیڈمی کے سکریٹری اور ممتاز عالم دین مولانا عتیق احمد بستوی نے پروگرام کے مہمان اعزازی کے طور پر اپنے افتتاحی خطاب میں ہندوستان میں عربی زبان کی قدیم تاریخ کا حوالہ دیا اور کہا کہ ماضی میں ہندوستان کی خواتین نے عربی زبان و ادب کے میدان میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں اسکول آف اوپن لرننگ کی ڈائریکٹر پروفیسر پائل ماگو نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے شعبۂ عربی کو ہندوستانی تہذیب کا سرچشمہ قرار دیا۔ شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی استاذ پروفیسر تسنیم کوثر نے پروگرام میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مغل سلطنت کی شاہی بیگمات اور ریاست بھوپال کی نمایاں خواتین کی عربی و اسلامی علوم میں نمایاں خدمات کا احاطہ کیا۔ پروفیسر نیرا اگنی مترا، چیئرپرسن انٹرنیشنل ریلیشنز دہلی یونیورسٹی نے حضرت رابعہ بصری سے لے کر آج تک کی خواتین کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مسلم خواتین نے ہر دور میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ پروگرام کی صدر پروفیسر عائشہ کمال ڈین فیکلٹی آف آرٹس و صدر شعبۂ عربی برکت اللہ یونیورسٹی نے خواتین کی علمی حصے داری بڑھانے کے لیے حکومتی اسکیموں کا حوالہ دیتے ہوئے بھوپال کی چار شاہی بیگمات کی عربی خدمات کا تذکرہ کیا۔ افتتاحی پروگرام کی نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر محمد اکرم نے کی اور مفتی احمد نادر نے شکریہ کی تحریک پیش کی۔ اس دوران دو متوازی سیشن میں 9 مقالے مختلف موضوعات پر پیش کیے گئے۔

سمینار کے دوسرے دن شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی (ڈی یو) میں 'عربی ادبیات میں ہندوستانی خواتین کا کردار' کے اختتامی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر محسن عثمانی سابق صدر شعبہ عربی، ڈی یو نے کہا کہ انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے میں خواتین کے کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ سیشن کے مہمان خصوصی محمد بن عبداللہ الصواط استاذ فقہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ نے عربی و اسلامی علوم و فنون میں ہندستانی علما کی نمایاں خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شاہ ولی اللہ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے علما کی علمی خدمات اسلامی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ پروفیسر عبدالماجد قاضی سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر عبیدالرحمٰن طیب سینٹر فار عربک و افریقین اسٹڈیز جے این یو، ڈاکٹر ثمینہ تابش شعبہ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور ڈاکٹر محمد قاسم عادل شعبہ عربی ذاکر حسین کالج ڈی یو نے اس سمینار کی اہمیت و افادیت پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ اختتامی سیشن میں نظامت کی ذمے داری پروفیسر نعیم الحسن سابق صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے کی جب کہ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے مہمان گرامی اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر اصغر محمود نے اس دو روزہ سمینار کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس سمینار میں افتتاحی سیشن کے علاوہ آن لائن و آف لائن کل چھ اکیڈمک سیشن میں 38 مقالات پیش کیے گئے۔ صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ اس اہم موضوع پر سمینار کے دیگر علمی فوائد و نتائج کے علاوہ ایک بڑی حصولیابی یہ رہی کہ اس نے مسلم خواتین کے حوالے سے غلط فہمی پر مبنی کئی مفروضوں کا جواب بھی دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 اگست 2024

چوتھا مشیر الحسن یادگاری خطبہ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کی جانب سے گزشتہ روز چوتھا مشیر الحسن یادگاری خطبہ

منعقد کیا گیا۔ مشہور مورخ پروفیسر تنیکا سرکار نے یہ خطبہ دیا۔ پروفیسر سرکار جے این یو سے سبکدوش ہونے کے بعد اشوکا یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے ییل، شکاگو اور گوتھین جین یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ خطبے کا موضوع 'ویڈوا مولیشن ان دی کولونیل آرکائیو: ارلی نائن ٹینتھ سنچری ڈیبیٹس' تھا۔ خطبہ بیش قیمت قدیم دستاویزات اور گہرے تجزیے پر مبنی تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد شکیل نے پروگرام میں بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروگرام میں مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر زویا حسن اور پروفیسر اقتدار محمد خان، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز جامعہ ملیہ اسلامیہ شریک تھے۔ وائس چانسلر نے علمی فضا کو فروغ دینے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خاص طور پر اسے فروغ دینے میں پروفیسر مشیر الحسن کی غیر معمولی خدمات کو اجاگر کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ سرکار نے صنفی انصاف کو بہتر کرنے کے لیے متعدد اسکیمیں چلائی ہیں اور یونیورسٹی بھی صنفی مساوات کو یقینی بنانے کے لیے پابند عہد ہے۔ پروفیسر اقتدار محمد خان اور پروفیسر فرحت نسرین نے پروفیسر مشیر الحسن کے متعلق گفتگو کی۔ لیکچر میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ پروفیسر مشیر الحسن کی حیات اور کارناموں سے تحریک پانے کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 اگست 2024

محی الدین ابن عربی کی شخصیت

نئی دہلی: اسلامک اسٹڈیز ایسوسی ایشن کے صدر جوزف وکٹر ایڈون ایس جے نے محی الدین ابن عربی پر منعقدہ ویبینار کے پس منظر میں کہا کہ تصوف، تمام مذاہب میں موجود ہے، یہ ایک طاقتور روحانی قوت ہے۔ اسے کسی علمی ذرائع سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ یہ حقیقت کی تفہیم ہے جو روایتی شعور سے بالاتر ہے۔ ایک صوفی ایک اندرونی روشنی کی پیروی کرتا ہے، جو اس وقت مضبوط ہوتی جاتی ہے جب وہ خود کو دنیاوی خواہشات سے الگ کرتا ہے۔ حقیقی صوفیا خدا کی محبت سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہ محبت صوفی کے دل میں رہتی ہے، جو اسے مصائب یا آزمائش کو برداشت کرنے کے قابل بناتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں اور مسیحی برادری میں اس طرح کے افہام و تفہیم کو فروغ دینے کے لیے اس طرح کے ویبینار پر زور دیا۔ قابل ذکر

ہے کہ چند روز قبل اسلامک اسٹڈیز ایسوی ایشن کے زیراہتمام محی الدین ابن عربی کی شخصیت پر وبینار میں اسپین کی لویولا یونیورسٹی کے پروفیسر جیم فلا کیر ایس جے نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ محی الدین ابن عربی نہ صرف ایک صوفی، فلسفی، شاعر اور روحانی شخصیت کے حامل تھے بلکہ ان کی تصانیف کا اسلامی دنیا اور اس سے باہر بھی گہرا اثر مرتب ہوا۔ 'محی الدین ابن عربی کے تصوف کو مسیحی 'خراج عقیدت' کے نام سے اس وبینار میں پروفیسر جیم فلا کیر ایس نے اس کی زندگی کے مختلف گوشہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابن عربی فلاطینوس کے فلسفیانہ نظریات سے متاثر تھے اور انھوں نے یونانی فلسفہ اور مشرقی علوم کے ایک مشہور مرکز شہر اسکندریہ میں فلسفہ کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ابن عربی اور فلاطینوس دونو ں ہی وحدت الوجود کا نظریہ رکھتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اگست 2024

اردو غزل اور اسلامی اقدار

نئی دھلی: اسلامی اقدار نئی غزل کے روشن استعارے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خدا کا تصور، اس کی وحدانیت

اور تاریکی میں خدا کے روشن ہونے کا استعارہ نئی غزلوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تجلی اور نور کو اس پرآشوب عہد میں نئے غزل گویوں نے اپنے فکر کا حصہ بنائے رکھا ہے۔ نئی غزل کا غالب میلان الحاد اور انکار کی بجائے اللہ کی ربوبیت اور اس کے وجود کا اقرار ہے۔ تصوف کی روایت سے متاثر ہوکر نئی غزل میں بھی خودی، خودداری، ترک دنیا، ایثار، قناعت پسندی اور قلندری وغیرہ کا عنصر اپنی پوری قوت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ادارۂ ادب اسلامی ہند، حلقہ دہلی کے زیراہتمام کانفرنس ہال مرکز جماعت اسلامی ہند میں پہلے توسیعی خطبے میں پروفیسر کوثر مظہری نے کیا۔ اس توسیعی خطبے کا عنوان 'اردو غزل اور اسلامی اقدار' تھا۔ پروفیسر حسن رضا نے صدارتی خطبے میں کہا کہ حیات وکائنات کے تمام مظاہر کی اصل بنیاد تصورِ اقدار پر ہے۔ کسی بھی زبان، ادب اور تہذیب کا تصور قدر جیسا ہوگا اسی بنا پر اس کا وجود اور ظہور ہوگا۔ اسلام کا بھی اپنا ایک تصور اقدار ہے جس کی بنیاد توحید، رسالت اور آخرت ہے۔ اس موقعے پر معروف ادیب پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اس خطبے کا عنوان اور اس خطبے کے مباحث عمومی ادبی فضا سے مختلف ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس موضوع پر باضابطہ ایک سمینار کا انعقاد کیا جائے۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ حلقہ دہلی کی جانب سے پہلا توسیعی خطبہ ہے۔ اس خطبے کے خطیب، صدر اور معزز حاضرین موجودہ ادبی منظرنامے میں تخلیقی اور تنقیدی سطح پر غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ مصدق مبین نے نظامت کی۔ اس خطبے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات شریک ہوئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اگست 2024

جشن صحافت

نئی دھلی: ایکسچینج فار میڈیا گروپ کے زیراہتمام نئی دہلی واقع انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں 'جشن صحافت' کے عنوان سے پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا، جس میں 'اردو جرنلزم 40/انڈر 40' کے تحت قومی سطح پر 40 اردو صحافیوں کو ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس تقریب میں مہمانان خصوصی کے طور پر سابق چیف الیکشن کمشنر، حکومت ہند ڈاکٹر ایس وائی قریشی، مرکزی وزیر مملکت ایس پی سنگھ بگھیل اور سابق مرکزی وزیر اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نومنتخب صدر سلمان خورشید موجود تھے۔ افتتاحی خطبہ دیتے ہوئے ایس وائی قریشی نے زبان اردو کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے تقریب کے انعقاد کے لیے ایکسچینج فار میڈیا گروپ کی ستائش کی اور چیئرمین انوراگ بترا، سینئر ایڈیٹر روحیل امین کو مبارکباد پیش کی۔ ایس وائی قریشی نے اعتراف کیا کہ اردو زبان کے قارئین کی تعداد کچھ کم ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف غیر مسلم حضرات جو اردو کی خدمت کررہے ہیں، اس سے اردو زبان کو مزید فروغ مل رہا ہے۔ سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید نے جشن صحافت کے انعقاد کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ گنگا جمنی تہذیب کی زبان ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کا اہم کردار رہا ہے اور اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مرکزی وزیر مملکت ایس پی سنگھ بگھیل نے اردو زبان کو شیریں زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو ایسی زبان ہے کہ جس کو بولنا، لکھنا اور پڑھنا بھی نہیں آتا ہے، اس کو بھی سننے میں مزہ آتا ہے۔ اس کے علاوہ سینئر صحافی اور سابق راجیہ سبھا رکن شاہد صدیقی اور سابق سفیر وسابق رکن پارلیمنٹ م افضل نے بھی اردو صحافت سے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔ اس سے قبل مختلف سیشن کا انعقاد کیا گیا جس میں پدم شری پروفیسر اختر الواسع، روزنامہ انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر یامین انصاری، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر انور عالم پاشا، جامعہ ہمدرد کے پروفیسر فرحت بصیر خان، ڈاکٹر ہریش بھلہ، عنبرین خان، عائشہ دہرا، ڈاکٹر شفیع ایوب، سدھیر مشرا، سینئر صحافی بھوپیندر چوبے، سلام ٹی وی کے ایڈیٹر طارق فریدی وغیرہ نے اردو صحافت سے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔ نظامت معروف شاعر معین شاداب اور کشفی شمائل نے کی۔ قابل ذکر ہے کہ ایوارڈ کے 40 فاتحین میں سے روزنامہ انقلاب کو بھی 3 ایوارڈ دیے گئے جس میں دہلی سے رپورٹر فضیل احمد، وسیع الرحمٰن عثمانی اور لے آوٹ ڈیزائنر محمد دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ قومی آواز سے وابستہ محمد تسلیم، سلام ٹی وی سے ارم خان، بھارت ایکسپریس سے نثار احمد اور رحمت کلیم ودیگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اگست 2024

اقبال اکادمی دہلی کے زیراہتمام مذاکرہ کا انعقاد

نئی دھلی: اقبال اکادمی دہلی کی جانب سے تسمیہ آڈیٹوریم میں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرے میں علامہ اقبال کے آخری مجموعۂ کلام 'ارمغان حجاز' کی معروف نظم 'بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو' کے شعر 'افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر- ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا' کو موضوع بحث بنایا گیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے افتتاحی کلمات میں شعر کے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کے کلام سے چند اشعار پیش کیے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے صدارتی کلمات میں شعر فہمی کے تعلق سے گفتگو کی، ڈاکٹر سید ظفر محمود نے

اپنے خطاب میں زور دیا کہ نوع بشر کو قومی اور ملی سطح پر اجتماعی فکر کو بروئے کار لانا چاہیے، مگر عمل انفرادی طور پر بھی جاری رہنا چاہیے۔ پروفیسر اختر حسین کاظمی نے اپنے مختصر خطاب میں علامہ اقبال کے کلام کے فکری پہلو پر توجہ دلائی۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے علامہ اقبال کے کلام کو فلاسفی آف لائف سے تعبیر کیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے زیر بحث شعر کے مفہوم کی وسعت پر اظہار خیال کیا۔ مذاکرے میں منور حسن کمال، ڈاکٹر شکیل اختر، ارشد قادری، آصف اعظمی، ڈاکٹر سرفراز جاوید، پروفیسر ابوبکر عباد، علی احمد ادریسی اور ریسرچ کے طالب علم محمد فیصل، محمد تنویر اور محمد سرفراز وغیرہ نے بھی اپنے اپنے خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے اقبال کی دو غزلیں سنائیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اگست 2024

یک روزہ قومی سمینار

دھلی: 13 اگست کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک روزہ قومی اردو سمینار منعقد ہوا جس کی میزبانی سولیٹیر

لیٹریچر فاؤنڈیشن (نئی دہلی)، کتاب پبلی کیشنز (ممبئی)، اور کمال پبلی کیشنز (جبلپور) نے مشترکہ طور پر کی۔ اس یادگار تقریب میں نامور ادیب و شاعر، سابق وائس چیرمین دہلی اردو اکیڈمی، ڈاکٹر خالد محمود صاحب کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں 'بابائے مولوی عبدالحق' ایوارڈ سے نوازا گیا، جو سولیٹیر لیٹریچر فاؤنڈیشن کی طرف سے پیش کیا گیا۔ تقریب میں 'اردو آنگن ممبئی' کا خاص شمارہ، جو ڈاکٹر محمود شیخ کے نام منسوب تھا، جاری کیا گیا، اور کمال پبلی کیشنز کی تین کتابوں سمیت کتاب ممبئی کی دو کتابوں کی بھی تقریب رونمائی انجام دی گئی۔ وحشی سعید (کشمیر) کی حیات و فن پر مبنی ڈاکٹر رضوان انصاری کی تصنیف بھی اس موقعے پر پیش کی گئی۔

جناب فیروز کمال (جبلپور)، جناب امتیاز گورکھپوری (ممبئی) اور محترمہ پروین شغف (نئی دہلی) نے اس تقریب کا انعقاد اور انتظام کیا۔ تقریب کو تین نشستوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلی دو نشستوں میں مختلف مقالے پیش کیے گئے۔ افتتاحی خطاب محترمہ پروین شغف نے کیا، اس کے بعد جناب فیروز کمال نے استقبالیہ خطبہ دیا۔ پہلی نشست کی نظامت پروین شغف نے کی اور صدارت محترم چندر بھان خیال کے سپرد تھی، اس میں حقانی القاسمی اور طیب نعمانی نے مقالے پیش کیے۔ جبکہ دوسری نشست کی صدارت جناب خالد محمود نے کی اور نظامت کے فرائض جناب طیب نعمانی نے انجام دیے۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سیفی سرونجی نے شرکت کی۔ اس سیشن میں آتش رضا شیخ پوروی اور پروین شغف نے مقالات پیش کیے۔ آخری نشست میں عرفان اعظمی کی نظامت اور جناب متین امروہی کی صدارت میں ایک کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں کئی نامور شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ شریک شعرا میں امتیاز گورکھپوری، ریاض منصف، اقبال نادر، آتش رضا شیخ پوری، خلیل اسلم طیب نعمانی، پروین شغف، راشد راہی، سلسل تواری، محو جبلپوری، ریتو کوشک، اور شائستہ مہ جبیں شامل تھے۔ تقریب کا اختتام ڈاکٹر امتیاز گورکھپوری کے اظہار تشکر پر ہوا، جس کے بعد شرکا کے لیے عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا، جو کمال پبلی کیشنز، کتاب پبلی کیشنز اور سولیٹیر لیٹریچر فاؤنڈیشن کی جانب سے پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز: پروین شغف

غالب اکیڈمی کی ماہانہ نثری نشست

نئی دھلی: گزشتہ روز غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک نثری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو اور ہندی کے ادیبوں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ چشمہ فاروقی نے اپنی کہانی 'نیکی کا صلہ' پڑھ کر سنائی جس میں گھریلو اور سماجی ماحول کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے مشہور صحافی 'رضوان اللہ فاروقی کی تبصرہ نگاری' پر ایک مضمون پیش کیا۔ ثروت عثمانی نے 'آرگنائزر کے آداب' کے عنوان سے ایک انشائیہ پیش کیا جس میں پروگرام منعقد کرانے کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی۔ گولڈی گیت کار نے سماجی رشتوں پر ایک کہانی سنائی۔ عزہ معین نے 'جامعہ سے دہلی کے احوال' پر ایک انشائیہ پیش کیا۔ معروف ادیبہ ریتو استھانہ نے 'بندھن کچے دھاگوں کا' کے عنوان پر نیہا اور انوراگ بھائی بہن کی کہانی سنائی، مشہور کہانی کار ڈاکٹر پریتا پنوار نے 'آ گیا کاری ماں باپ' کے عنوان سے ایک کہانی پیش کی۔ دل کے ڈاکٹر مانو اور بچوں کے ڈاکٹر سلیکھا کی کہانی کو بیان کیا۔ آج کے سماج میں بچوں کی تربیت پر یہ بہت اچھی کہانی تھی۔ اس نشست میں مشہور مصنفہ نیلم باورامن نے 'کتاب چور' کے عنوان سے ایک کہانی سنائی جو گھر میں کام کرنے والی نوکرانی کا بیٹا آئی اے ایس کی تیاری کے لیے کتاب چوری کرتا ہے۔ پکڑے جانے پر قبول کرتا ہے کہ ہم نے روپیہ پیسہ کی چوری نہیں کی کتاب کی چوری کی ہے، پڑھنے کے لیے اسے چوری نہیں کہا جاتا۔ شمع کوثر نے 'عشق' کے عنوان سے ایک عمدہ کہانی پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 27 اگست 2024

آسام

غالب کے خطوط کی ادبی اور ثقافتی اہمیت

سلچر: دو روزہ بین الاقوامی غالب سمینار بعنوان 'غالب کے خطوط کی ادبی اور ثقافتی اہمیت' کا افتتاحی اجلاس بپن چندر پال آڈیٹوریم، آسام یونیورسٹی، سلچر میں منعقد ہوا۔ یہ سمینار غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے شعبۂ اردو، آسام یونی ورسٹی کے اشتراک سے کیا۔ سمینار کا افتتاح آسام یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر راجیو موہن پنت نے کیا۔ افتتاحی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ غالب ہندستان کے سب سے مقبول شاعر ہیں، ان کی شاعری کا جادو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے سر چڑھ کے بولتا ہے خواہ وہ کوئی بھی زبان استعمال کرتا ہو۔ افتتاحی اجلاس کے صدر اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کا قیام جن مقاصد کے تحت عمل میں آیا تھا یہ ادارہ پورے جوش اور جذبے کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی جناب آر چندرناتھن، سابق ڈائرکٹر

جنرل، میگھالیہ پولیس نے کہا کہ غالب کی شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی جدت اور تاثیر ہے۔ غالب نے اپنے لیے جس وسیلے کو بھی منتخب کیا اس میں تقلید سے زیادہ نئے تجربے کو راہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر ہو یا نظم ایک نئے رجحان کو پیش کرتی ہے۔ اس اجلاس میں دہلی کے سابق لیفٹیننٹ گورنر عالی جناب نجیب جنگ نے بھی مہمان اعزازی کی حیثیت سے آن لائن شرکت کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا بنیادی مقصد غالب اور عہد غالب سے متعلق لٹریچر کو شائع کرنا اور اس پر نئے سرے سے غور و فکر کی راہ ہموار کرنا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو مرتبہ دہلی سے باہر سیمینار کا انعقاد کرتا ہے۔ اس مرتبہ یہ سیمینار آسام میں ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر جاوید رحمانی، صدر شعبۂ اردو، آسام یونیورسٹی نے کہا کہ غالب کا مطالعہ تنہا غالب کا مطالعہ نہیں ایک پوری روایت کی تفہیم ہے۔ شعر کی تفہیم کا شاید ہی کوئی زاویہ ہو جس کے ذریعے غالب کا کلام نہ دیکھا گیا ہو۔ یہی معاملہ ان کی نثر کا بھی ہے۔ ان کی قرأت و تفہیم ادبی، سماجی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے لیکن اس میں ابھی گفتگو کے بہت سارے امکانات موجود ہیں۔ پروفیسر پیوش پانڈے نے کہا کہ ہم نے غالب کو ایک فلسفی کے طور پر پڑھا ہے اور انھوں نے ہمیں بہت جگہ گمراہیوں سے بچایا ہے۔ غالب کے خطوط اردو نثر کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ غدر کے حالات ہوں یا دہلی کی تہذیبی زندگی ہر زاویے سے ان خطوط کی اہمیت مسلم ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں شعبۂ پرفارمنگ آرٹس و محفل کے فنکاروں نے کلام غالب پیش کیا۔ سیمینار کے ادبی اجلاس 8/ اگست کی صبح 10 بجے سے بپن چندر پال آڈیٹوریم میں منعقد ہوئے۔

پہلے اجلاس کی صدارت شعبہ ہندی، آسام یونیورسٹی کے صدر پروفیسر کرشن موہن جھا اور پروفیسر گنگا بھوشن نے کی۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر جھا نے کہا کہ غالب کے خطوط کا مطالعہ کیوں ضروری ہے اس کا جواب ہر اس شخص کے پاس ہے ان خطوط کا جو مطالعہ کر رہا ہے لیکن ان خطوط کو پڑھنے کے کچھ خطرے بھی ہیں جن کی طرف توجہ رہنا ضروری ہے۔ پروفیسر گنگا بھوشن نے کہا کہ خطوط ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں لہٰذا یہ کئی مرتبہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتے ہیں جن کو ہم کسی سبب سے ظاہر کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر رشید احمد (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش) نے 'خطوط غالب اور اخلاقیات'، پروفیسر عبدالرزاق نے 'خطوط نگاری کی اہمیت اور غالب کے خطوط'، جناب نور احمد نور نے 'خطوط غالب کی اہمیت'، محترمہ فرحین خانم نے 'غالب کا اسلوب نثر' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالرزاق نے کی۔ اس اجلاس میں صدر شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی (بنگلہ دیش) پروفیسر محمد غلام ربانی نے 'جدید اردو نثر کی ترقی میں خطوط غالب کا حصہ'، پروفیسر کرشن موہن جھا نے 'خطوط غالب کی اہمیت'، ڈاکٹر جاوید رحمانی نے خطوط غالب میں دلی کی کروٹیں'، ڈاکٹر رضی شہاب نے 'خطوط غالب میں دوستانہ مراسم کی صورتیں'، ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی نے 'خطوط غالب میں موجود اردو اشعار کی شرح'، ڈاکٹر ابو ایمن رضوان الحق خاں نے 'غالب کے فارسی خطوط کی ادبی و تہذیبی اہمیت' اور جناب راحیل فریدی نے 'خطوط غالب میں ظرافت کے رنگ' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد غلام ربانی، پروفیسر محمد بشیر۔ کے۔ اور ڈاکٹر دیپیند و کمار نے کی۔ اس اجلاس میں جناب لبیب عبداللہ (ڈھاکہ) نے 'مطالعہ غالب کی اہمیت'، ڈاکٹر مرلی باسا نے 'غالب کا شخصی مرقع ان کے خطوط میں'، ڈاکٹر منیش تومر نے 'ہندی اردو کی روایت اور غالب'، ڈاکٹر محمد انصر نے 'خطوط غالب اور 1857' اور جناب نجم الاسلام نے 'غالب کے خطوط کی ادبی و ثقافتی اہمیت' کے موضوع پر مقالات پیش کیے۔ سیمینار کے بعد مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔

پریس ریلیز: شعبۂ اردو، آسام یونیورسٹی

اتر پردیش

سید محمد اشرف سے ملاقات اور بزم افسانہ کا انعقاد

علی گڑھ: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام معروف فکشن نگار سید محمد اشرف سے ملاقات اور بزم افسانہ میں سید محمد اشرف نے کہا کہ ان کی کہانیوں میں

ان کے خاندانی ادبی ماحول کا بہت اثر ہے اور قصباتی زندگی اور اس کے ماحول سے ان کی کہانیاں متاثر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میری کہانیوں میں جانوروں کے کردار آپ کو جا بجا ملیں گے جو سماج میں ہونے والے واقعات کی عکاسی کرتے نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بتایا کہ زوال پذیر اقدار اور تہذیبی روایات کی پامالی پر ان کی بہت سی کہانیاں ہیں جن کو سماجی منظرنامے پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کی کہانی پر قرۃ العین حیدر نے کہا تھا کہ جب اس دنیا کی پنچ تنتر لکھی جائے گی تو سید محمد اشرف کی چند کہانیاں ضرور شامل کی جائیں گی۔ ساہتیہ اکادمی کے نائب سکریٹری کمار انوپم نے کہا کہ سید محمد اشرف اس عہد کے نامی کہانی کار ہیں اور ان کے افسانوں نے افسانوی ادب میں کئی بڑے خوشگوار اضافے کیے ہیں انھوں نے بتایا کہ یہ پروگرام ساہتیہ اکادمی کا ایک بڑا پروگرام تصور کیا جاتا ہے جس میں ہندوستان کے بڑے ادیب اور کہانی کار اپنے فن کے بارے میں بتاتے ہیں۔ صدارت کرتے ہوئے البرکات ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر پروفیسر سید محمد امین نے کہا کہ البرکات میں یہ ایک تاریخی دن ہے کہ جب اشرف کی افسانوی کاوشوں کا حکومت کی ایک تنظیم اعتراف کرتے ہوئے اشرف کی زبانی اشرف کی کہانی سنوار رہی ہے۔ انھوں

نے بتایا کہ سید محمد اشرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لٹریری کلب کے سکریٹری اور علی گڑھ کی ثقافتی انجمنوں کے سکریٹری بھی رہے ہیں اور اردو سے سول سروسز میں کامیابی حاصل کرنے والے وہ پہلے امیدوار تھے۔ علی گڑھ کے سابق ایم ایل اے وویک بنسل نے سید محمد اشرف کو علی گڑھ کی ادبی اور تہذیبی پہچان بتاتے ہوئے کہا کہ سید محمد اشرف نے ہندوستان میں اپنے قلم سے علی گڑھ کی روایتوں کو روشن کیا ہے اور بلاشبہ وہ علی گڑھ کا فخر ہیں۔ اس موقعے پر سید محمد اشرف کی تین کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ساتھ ہی سید محمد اشرف نے اپنی کہانی لکڑبگھا چپ ہوگیا بھی سامعین کو پڑھ کر سنائی۔ سید محمد اشرف کی فنی صلاحیتوں کے حوالے سے اس پروگرام میں پروفیسر اے آر قدوائی، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر غضنفر جیسے معروف ادیبوں اور کہانی کاروں نے اپنے خیالات کا ظہار کرتے ہوئے سید محمد اشرف کو افسانوی ادب کا ایک ممتاز، منفرد اور معروف افسانہ نگار قرار دیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، ادبا و شعرا شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اگست 2024

ادبی و ثقافتی پروگرام

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام ایک ادبی و ثقافتی پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت صدر شعبہ اردو پروفیسر محمد طاہر نے کی۔ ڈاکٹر محمد ضرار نے بطور مہمان خصوصی اپنے خطاب کے دوران طلبا و طالبات کے ذریعے پیش کیے گئے ادبی و ثقافتی پروگراموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے ادبی و ثقافتی پروگرام کا انعقاد بہت ضروری ہے کیونکہ اس طرح کے پروگرام طلبہ و طالبات کے اندر مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے تمام ذمے داران کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کامیاب پروگرام کے انعقاد پر مبارکباد دی۔ اس سے قبل بی اے اور ایم اے کے طلبہ و طالبات نے مختلف عناوین پر اپنی تقریریں، غزلیں، نظمیں اور انشائیے و مقالے پیش کیے جن میں بطور خاص ایم اے سال دوم کے طالب علم حافظ عمیر شاہد نے تعلیم نسواں کے موضوع پر بہترین انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، انھوں نے اپنی تقریر میں ضلع اعظم گڑھ کے ان اہم اداروں کا تذکرہ کیا جن میں بچیوں کی تعلیم ہوتی ہے اور وہ ادارے تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہبہ عبدالرحمٰن نے 'تعلیم کے تئیں ہماری ذمے داریاں' رقیب یوسف نے 'اسلام اور سائنس' کے موضوع پر تقریریں کیں، مولوی عبدالعزیز نے 'مجھ کو میرے اعزہ سے بچاؤ' کے عنوان پر بہترین انشائیہ پیش کیا۔ یہ انشائیہ اتنا دلچسپ اور طنز و مزاح پر مشتمل تھا کہ پوری مجلس قہقہہ زار بن گئی۔ اس دوران محمد فرحان نے مختلف حالات و واقعات کو غزل اور نظم کی شکل میں پیش کیا۔ پروگرام کے آخر میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد طاہر نے جملہ طلبہ و طالبات کو اپنے گرانقدر مفید مشوروں سے نوازا اور بہترین پروگرام پیش کرنے پر ان کو مبارکباد دیتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض بلال قمر نے انجام دیے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 اگست 2024

شاہ جہاں کے عہد میں فارسی ادب

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ فارسی نے شاہ جہاں کے دور میں فارسی ادبیات کی تخلیق کے موضوع پر ایک روزہ بین الاقوامی سمینار منعقد کیا۔ افتتاحی سیشن سے خطاب کرتے ہوئے اے ایم یو میں تاریخ کے پروفیسر ایمریٹس عرفان حبیب نے کہا کہ یہ شاہ جہاں کے دور میں ہی تھا کہ دبستانِ مذاہب جیسی کتاب 1652 میں ایک پارسی فرقے کے سربراہ خسرو اسفند یار نے مرتب کی جس کی سترہویں صدی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد تصنیف ہے جس میں مختلف مذاہب بشمول یہودیت، عیسائیت، بدھ مت، زرتشت اور اسلام کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ اس عہد کی ایک خاص بات شاہ جہاں کے بیٹے داراشکوہ کی جانب سے 52 اپنشدوں کا ترجمہ تھا جس نے یورپی دانشوروں کو اپنے منفرد فلسفیانہ تصورات سے حیران کردیا۔ پروفیسر عرفان حبیب نے شاہ جہاں اور اس کے پر دادا اکبر کے درمیان نظریاتی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شاہ جہاں اپنے پر دادا کا بہت احترام کرتا تھا، لیکن دونوں کا نقطہ نظر بہت مختلف تھا۔ انھوں نے کہا کہ ان اختلافات کی جھلک دو اکبر ناموں اور پادشاہ نامہ کی سرکاری تاریخ نویسی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر انور خیری (یونیورسٹی آف کابل) نے کہا کہ جب بھی شاہ جہاں نے وسطی ایشیائی فوجی مہمات کی نگرانی کے لیے افغانستان کا دورہ کیا تو اس نے متعدد یادگاروں، مساجد اور باغات کی بنیاد رکھی جو آج بھی جدید افغانستان کے منظرنامے پر موجود ہیں اور اس خطے کی ثقافتی زندگی کو تقویت بخشتے ہیں۔ اپنے خطبہ استقبالیہ میں شعبہ فارسی کی صدر اور بین الاقوامی سمینار کی کوآرڈینیٹر پروفیسر رعنا خورشید نے کہا کہ مغل بادشاہ فنون، فن تعمیر اور ادب کی کثیر جہتی سرپرستی کے لیے جانے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم ستمبر 2024

تلنگانہ

اردو یونیورسٹی میں ڈیجیٹل کتب خانوں پر قومی کانفرنس

حیدرآباد: سید حامد سنٹرل لائبریری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام 'اے آئی پر مبنی ڈیجیٹل کتب خانے: رسائی اور دریافت کا ارتقا' کے زیر عنوان ایک قومی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر دیویکا مدالی، ڈائرکٹر انفلبنیٹ سنٹر مہمانِ خصوصی تھیں اور پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارت کی۔ اپنے خطاب میں پروفیسر دیویکا مدالی نے مصنوعی ذہانت کے ارتقا اور لائبریری اور معلومات کے شعبے پر اس کے گہرے اثرات کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مستقبل میں جہاں لائبریریوں کا تکنیکی فروغ ہوگا وہیں صارفین کو بہتر خدمات و تجربات کی فراہمی کے لیے اے آئی کا استعمال لازمی طور پر ہوگا۔ پروفیسر دیپک گرگ نے اپنے کلیدی خطبے میں لائبریریوں میں استعمال ہونے والے اے آئی کی مختلف ایپلی کیشنز کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ انھوں نے متعدد امور انجام دینے کے لیے AI کے استعمال کی اہمیت پر زور دیا جس سے لائبریری کی مختلف خدمات کو تقویت مل سکے گی۔ پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے صدارتی خطاب میں لائبریرین کی ذمے داری کو اجاگر

کرتے ہوئے تعلیمی اداروں میں لائبریریوں کے اہم کردار پر زور دیا۔ انھوں نے لائبریرین حضرات پر زور دیا کہ وہ ڈیجیٹل دور کے ابھرتے ہوئے تقاضوں کے مطابق مصنوعی ذہانت کو اپنائیں۔ ڈیجیٹل کتب خانوں کے موضوع پر منعقدہ اس قومی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے آخر میں پروفیسر اشتیاق احمد، رجسٹرار نے شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اختر پرویز، سابق یونیورسٹی لائبریرین، جو اس وقت جامعہ ہمدرد لائبریری کے ذمے دار ہیں، نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر فیصل مصطفیٰ، پروگرام ڈائرکٹر اور انچارج لائبریرین، مانو نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعے پر نمبس (knimbus4.0) نام کے ایک سرچ انجن کا اجرا عمل میں لایا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 اگست 2024

'ہندوستانی تہذیب اور اردو شاعری' پر شمیم طارق کا توسیعی خطبہ

حیدرآباد: ''ہندوستانی تہذیب اور اردو شاعری میں وہی تعلق ہے جو گوشت اور ناخن میں ہے۔ ایک کو

سمجھے بغیر نہ دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز محقق، شاعر، نقاد اور کالم نگار جناب شمیم طارق نے اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی طرف سے منعقدہ توسیعی خطبہ بہ عنوان 'ہندوستانی تہذیب اور اردو شاعری' میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری اور اردو تہذیب میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ زبان کو سمجھنے کے لیے تہذیب کو سمجھنا ضروری ہے۔ کثرت میں وحدت ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانیت کی روح ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ کے ہر دور میں اختلاف میں اتفاق کے نمونے ملتے ہیں۔ جناب شمیم طارق نے عہد قدیم سے دورِ حاضر تک کے شعرا کے کلام میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب اور فراق وغیرہ کا کلام پورا کا پورا ہندوستانیت میں رنگا ہوا ہے۔ آج پاکستان میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں بھی ہندوستانی تہذیب کا رنگ نمایاں ہے۔

پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے صدارتی خطاب پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نہ صرف اردو زبان بلکہ اردو اور مشترکہ تہذیب کا گہوارہ ہے۔ اردو کی پوری شاعری ہندوستانی تہذیب کے متنوع رنگوں کی عکاسی کرتی ہے۔ دکنی شعرا نے ہندی و سنسکرت کے علاوہ دیگر علاقائی الفاظ سے اردو کا دامن وسیع کیا۔ جگنو بھی سنسکرت کا لفظ ہے۔ ایسے الفاظ کی کثیر تعداد ہے جو آج اردو کے ہو گئے ہیں۔ ہندوستان ایک بے حد متنوع ملک ہے اور اس کے متنوع کلچر کی مکمل نمائندگی اردو زبان کرتی ہے۔ ابتدا میں پروفیسر عزیز بانو، ڈین اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات نے خیر مقدمی تقریر کی۔ انھوں نے جناب شمیم طارق کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس اہم موضوع پر خطاب کے لیے ممبئی سے مانو کیمپس حیدرآباد تشریف لائے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو اور پروگرام کے کوآرڈینیٹر پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے موضوع اور مہمان کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زبان نے بہت تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں اور ہندوستان میں لنگوا فرینکا بن گئی۔

جلسے میں پروفیسر صدیقی محمد محمود اور مختلف شعبہ جات کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر فیروز عالم، اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو نے نظامت کی اور اظہار تشکر کا فریضہ ڈاکٹر افتخار احمد، اسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ فارسی نے ادا کیا۔ ایم اے عربی کی طالبہ ماریہ محفوظ کی دلکش قرأت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔

رپورٹ: پروفیسر عزیز بانو، ڈین، اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات، حیدرآباد، 21 اگست 2024

اعزاز و اکرام

عالمی یوم اردو ایوارڈز 2024 کا اعلان

نئی دھلی: عالمی یوم اردو ایوارڈز کمیٹی کی ایک میٹنگ دریاگنج میں پروفیسر عبدالحق کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں پروفیسر توقیر احمد خاں (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)، جاوید اختر (سابق چیف سب ایڈیٹر، یو این آئی اردو سروس)، معصوم مرادآبادی (ایڈیٹر روزنامہ جدید خبر، نئی دہلی)، محمد عارف اقبال (ایڈیٹر اردو بک ریویو، نئی دہلی)، اسرار احمد اجینی (کو آرڈی نیٹر، عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی) اور محمد ادریس گورکھپوری شامل تھے۔ میٹنگ میں مجوزہ ناموں پر غور کرنے کے بعد عالمی یوم اردو ایوارڈ 2024 کا اعلان کیا گیا۔ رسالہ سائنس کی دنیا، نئی دہلی کے سابق ایڈیٹر محمد خلیل کو اردو زبان میں سائنسی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر محمد شفیع علیگ عالمی یوم اردو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، دہلی یونیورسٹی شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر علی احمد ادریسی کو علامہ اقبال ایوارڈ برائے ادب کے علاوہ انجم نعیم کو مولوی محمد باقر عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے صحافت، مولانا محمد رحمانی (دہلی) کو مولانا ابوالکلام آزاد عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے فروغ تعلیم و تربیت، نعیمہ جعفری پاشا (دہلی) کو نور جہاں ثروت عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے اردو زبان و ادب، اے یو آصف (دہلی) کو امداد صابری عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے صحافت، وسیع الرحمٰن عثمانی (دہلی) کو مولانا محمد مسلم ایوارڈ برائے صحافت اور انوار الوفا اعظمی (دہلی) کو مرزا غالب عالمی یوم اردو ایوارڈ برائے شاعری کے علاوہ تقریباً 23 افراد ایوارڈ یافتگان کی فہرست میں شامل ہیں۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے تمام ایوارڈ یافتگان کو پیشگی مبارکباد دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2024

مولانا محمد اسجد ربانی قاسمی

پانی پت: عربی ادب اور شعبۂ صحافت میں نمایاں کارکردگی کی وجہ سے خطۂ میوات کے نوجوان عالم دین مولانا محمد اسجد ربانی قاسمی المیواتی کو جلد ہی غالب اکیڈمی میں قومی اردو ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ واضح ہو کہ قومی اردو شکشک کرمچاری سنگھ (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام

قومی اردو ٹیچر ایوارڈ پروگرام ہر سال دہلی میں منعقد کیا جاتا ہے جس میں ہندوستان کی تمام ریاستوں کے 100 اساتذہ وملازمین کو دستور میں شامل کبھی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کے لیے اپنے شعبے میں نمایاں کام کرنے والوں کو نیشنل اردو ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔ اسی زمرے میں مولانا محمد امجد ربانی قاسمی الیواتی کو نوازا جارہا ہے۔ منظور شدہ اتھارٹی نے جو مکتوب ان کے پاس بھیجا ہے، اس میں لکھا ہے کہ علاقہ میوات میں اردو صحافت میں کارہائے نمایاں کی وجہ سے آپ کو مقررہ تاریخ پر ایوارڈ دیا جائے گا۔ واضح رہے کہ مولانا محمد امجد ربانی قاسمی عربی زبان کے بھی ماہر ہیں۔ اس انتخاب سے علاقہ خصوصاً محبین اردو میں خوشی کا ماحول پایا جارہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اگست 2024

رسم اجرا

غضنفر: افسانوں کے روزن سے

کشن گنج: اوریکل انٹرنیشنل اسکول چکلہ کشن گنج میں طیب فرقانی کی دوسری کتاب 'غضنفر: افسانوں کے روزن سے' کی شاندار رونمائی کی تقریب منعقد کی گئی

جس میں کشن گنج دیناجپور اور اطراف کے شعرا وادبا نے شرکت کی، معروف قلم کار احسان قاسمی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ احسان قاسمی نے کہا کہ طیب فرقانی، جو کہ پیشے سے معلم اور دل سے اردو زبان و ادب کے بےلوث خادم ہیں، کی یہ کتاب ان کی ادبی خدمات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ان کی پہلی کتاب ابن صفی: کردار نگاری اور نمائندہ کردار بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ تقریب میں آن لائن اور آف لائن دونوں طریقوں سے مذاکرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں ادبی دنیا کی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ آن لائن سیشن میں جناب غضنفر، جناب رفیع حیدر انجم، ڈاکٹر خالد مبشر، پروفیسر ثروت خان، اور ڈاکٹر ریشما قمر نے اپنی قیمتی خیالات کا اظہار کیا اور کتاب کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ رونمائی کے بعد دوسری نشست میں احسان قاسمی، ماسٹر عبدالواحد مخلص، مشتاق احمد گوہر، ممتاز نیر، اظہار انور، مفتی ذاکر حسین نوری، نثار دیناج پوری، محسن نواز دیناج پوری، ماسٹر امان اللہ، شاہنواز بابل اور اوریکل انٹرنیشنل اسکول کے ڈائرکٹر سفیر الدین راہی نے کتاب پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے طیب فرقانی کی اس کاوش کو سراہا اور ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ تقریب کے تیسرے مرحلے میں ایک مختصر شعری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت مہمان شاعر احسان قاسمی نے فرمائی، جب کہ جہانگیر نایاب نے نظامت کے فرائض خوش اسلوبی سے نبھائے۔ شعری نشست میں مفتی ذاکر حسین نوری، نثار دیناج پوری، محسن دیناج پوری، شاہنواز بابل، ممتاز نیر، دودھ اونٹی، آفتاب اظہر صدیقی چھتر گاچھ، آرزو صابر کشن گنج، حسان احسن برچوندی، کمیل بلیاوی، جہانگیر داور، جہانگیر نایاب اور احسان قاسمی نے اپنی شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس تقریب میں بہار اور بنگال کے ادبا اور شعرا کا حسین سنگم دیکھنے کو ملا۔ اس موقعے پر پورنیہ اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام شائع شدہ کتاب طارق جمیلی: یاد آئے گی مری طرز ادا میرے بعد کی بھی رسم رونمائی ہوئی اور اہل ذوق کے درمیان کتاب تقسیم کی گئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اگست 2024

عتیق مظفر پوری: حیات وخدمات

نئی دهلی: انجمن ترقی اردو (ہند) اور سائبان فاؤنڈیشن کے اشتراک سے سینئر صحافی جاوید رحمانی کی مرتب کردہ کتاب 'عتیق مظفر پوری: حیات وخدمات' کا اجرا اردو ادب وصحافت سے وابستہ اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ قابل ذکر ہے کہ جاوید رحمانی معروف صحافی وشاعر عتیق مظفر پوری کے فرزند ہیں جنھوں نے اپنے والد کی نویں برسی کے موقعے پر 400 صفحات پر مشتمل کتاب مرتب کی ہے۔ اس موقعے پر سمینار بعنوان 'اردو صحافت کے چیلنجز اور امکانات' کا اہتمام کیا گیا جس میں دانشوروں نے تفصیلی گفتگو کی۔ جاوید رحمانی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ آج کا یہ جلسہ کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں صحافت، سیاست اور ادب سے وابستہ بڑی اہم ترین شخصیات کی شرکت نے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مرحوم عتیق مظفر پوری نے پوری زندگی اردو اور اردو صحافیوں کی آبیاری کی ہے۔ صدارت کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مرحوم عتیق مظفر پوری ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ مرحوم نے اپنی پوری زندگی میں صرف کام پر یقین رکھا، کبھی شہرت کی تمنا نہ کی۔ م افضل نے کہا کہ مرحوم عتیق مظفر پوری ہمارے اخبار سے لمبے عرصے تک وابستہ رہے۔ عتیق مظفر پوری نے صحافت کو کبھی پیشہ نہیں سمجھا بلکہ وہ عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ آج اردو گھر کے آڈیٹوریم میں ادب وصحافت سے وابستہ اہم ترین شخصیات کا یکجا ہونا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ مرحوم عتیق مظفر پوری کتنے نیک دل اور اصول پرست شخصیت کے مالک تھے۔ سینئر صحافی شنکر گپتا نے موجودہ اردو صحافت کے چیلنجز اور امکانات پر اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کئی معنوں میں صحافت آزاد نہیں ہے۔ مہمان خصوصی شاہد صدیقی نے کہا کہ مرحوم عتیق مظفر پوری بڑے اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ آج جاوید رحمانی نے ان پر کتاب مرتب کر کے ایک نیک بیٹا ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ عتیق مظفر پوری کی شاعری میں بڑی پختگی تھی۔

پروفیسر محمد خواجہ اکرام الدین، ڈاکٹر سید فاروق، سراج الدین قریشی، پروفیسر محمد کاظم، زیڈ کے فیضان، مسعود خان، حاجی قمرالدین، ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے عتیق مظفر پوری کی حیات وخدمات پر گفتگو کی۔ شاعر ڈاکٹر معین شاداب نے نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 اگست 2024

برہانپور سے 5 کتابوں کا اجرا

برہانپور: دارالسرور سوسائٹی کے کاموں پر اگر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو بہت صاف ستھرے طریقے

سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک مثبت نظریے اور مثبت لائحہ عمل کے تحت کام کر رہے ہیں۔ ایسے تمام معاملات میں جہاں نظریات مثبت ہوں لائحہ عمل واضح اور مثبت ہو، ہماری اخلاقی، سماجی، ملّی ذمے داری ہے کہ ہم ان کے مشن کا ساتھ دیں، ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اس طرح کا اظہار خیال سرسید تحریک کے علمبردار، شعبۂ قانون سیواسدن کالج برہانپور کے سابق پروفیسر ایڈوکیٹ خلیل احمد انصاری علیگ نے مورخہ 20 جون 2024 کو سعیدہ ہاسپٹل کیمپس میں دارالسرور ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام تقریب اجرا میں کیا۔ برہانپور کے مشہور شاعر و ناقد محترم طاہر نقاش نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمارے معاشرے اور تہذیب کو بچانے اور اس کی ترویج و اشاعت میں اردو زبان و ادب کا انتہائی اہم رول رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی ترقی و بقا کے لیے کون کون سے اقدام کیے جاسکتے ہیں، انھیں عملی جامہ پہنایا جائے۔ انھیں ہر ممکن تعاون فراہم کیا جانا چاہیے۔ ایڈووکیٹ ایس اے قادر صاحب نے بھی اپنی تقریر میں سوسائٹی کے کاموں کی ستائش کی اور ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔

اس تقریب اجرا کا افتتاح سماجی کارکن محترم دنیش شرما کے ہاتھوں ہوا اور شمع افروزی محترم اجے رگھونشی صاحب کے ہاتھوں سے کی گئی۔ محترم حمید الحق انصاری اور محترم جمیل اصغر صاحبان نے اس پروگرام کی سرپرستی فرمائی اور محترم اکرام انصاری صاحب (جنرل سکریٹری آل انڈیا مومن کانفرنس) نے صدارت فرمائی۔ اس تقریب اجرا میں دارالسرور سوسائٹی کے بینر تلے اشاعت پذیر ہونے والی 5 کتابوں کا اجرا مختلف شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جن میں لفظوں کی کائنات (شاعر: بسم اللہ عدیم) کا اجرا ایڈووکیٹ یونس پٹیل کے ذریعے، آئینہ خانہ فکر (مصنف: ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری) کا اجرا محترم رفیق گل محمد کے ذریعے، ارتباط (مصنف: بسم اللہ عدیم) کا اجرا محترم ضیا انعامدار کے ذریعے، جاورہ میں اردو نعت گوئی کا ارتقا (تحقیق محترمہ ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری) کا اجرا محترم واجد اقبال کے ذریعے اور عاصی فائقی فن اور شخصیت (مرتب: تنویر رضا برکاتی) کا اجرا محترم کمال انصاری کے ذریعے عمل میں آیا۔

سوسائٹی کے چیئرمین تنویر رضا برکاتی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے سوسائٹی کی غرض و غایت اور اجرا ہونے والی کتابوں اور اس کے مصنفین کا بہترین تعارف پیش کیا۔ نیز مستقبل قریب میں سوسائٹی کی جانب سے شائع ہونے والی برہان پور کی قدیم فارسی، عربی کتابوں کے اردو ترجمے کی بابت اظہار خیال کیا اور ان کتابوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے برہان پور کی سیاسی، ادبی شخصیات کثیر تعداد میں موجود تھیں۔

پریس ریلیز: تنویر رضا برکاتی، برہانپور، 23 اگست 2024

قطعات آزاد

لکھنؤ: ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی زبان کا ادب ہو سماج کی بہتری اور ملک کی ترقی میں ادب کا بے حد اہم کردار ہوتا ہے۔ شاعر و قلم کار اپنے کاموں سے ادب و سماج کی خدمت کرتے ہیں۔ جو بہت اہم کام ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم کام اس کو دوسروں تک پہنچانا ہے جس کو ڈاکٹر سلیم احمد نے بخوبی انجام دیا ہے۔ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار ریاستی وزیر اقلیتی بہبود، حج و وقف دانش آزاد انصاری نے آج اپنی رہائش گاہ پر کہنہ مشق شاعر آزاد ضمیر انصاری کے قطعات پر مبنی کتاب 'قطعات آزاد' کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ واضح رہے کہ آزاد ضمیر انصاری ہر موقعے پر اس کی مناسبت سے قطعات لکھتے تھے۔ ان کے ان موضوعاتی قطعات کو ڈاکٹر سلیم احمد نے جمع کرنے کا مشورہ دیا، کچھ قطعات جمع بھی ہوئیں، لیکن اسی درمیان اچانک آزاد ضمیر کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر سلیم احمد نے اپنے ادارہ 'ادبی نشیمن' کے توسط سے اس کام کو مکمل کرایا اور اسے شائع کرا کر ادبی ذخیرہ میں اضافہ کیا۔ اس موقعے پر ایڈیٹر ادبی نشیمن اور کتاب کے مرتب ڈاکٹر سلیم احمد نے مرحوم آزاد ضمیر انصاری کے شعری ذوق اور موزوں طبیعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے کہ مرحوم کی دیرینہ خواہش کو میں نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ امید ہے ذوق علم و ادب کو کتاب پسند آئے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 اگست 2024

گھٹا کا رخ

حیدر آباد: 4 مئی مرزا حامد علی بیگ متخلص حامد مغل سابق چیف اکاؤنٹس آفیسر محکمۂ اکاؤنٹس اینڈ ٹریژری

حکومت تلنگانہ کی چھٹی برسی کے موقعے پر ان کی یاد میں ایک شعری نشست کا انعقاد مرزا امان اللہ بیگ کی رہائش گاہ پیرا ماؤنٹ کالونی میں کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف شاعر ڈاکٹر رؤف خیر اور نظامت سلمان عنبر خانی نے کی۔ جس میں حامد مغل کی غزلیات کے مجموعہ 'گھٹا کا رخ' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی، مجموعہ کو ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی (علیگ) رجسٹرار آل انڈیا اردو تعلیم گھر لکھنؤ نے مرتب کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر مجید بیدار نے حامد مغل کو روایتی غزلیات کی پاسداری کرنے والا ایک منفرد شاعر بتایا جس نے غزل کے لغوی معنی محبوب کے ذریعے ہی اپنے تاثرات اور احساسات کو شعری قالب میں ڈھالا۔ جس کا محبوب تخیل کی پرواز نہیں بلکہ حقیقی دنیا کا واسی ہے۔ انھوں نے غزلیات میں دقیق اور مشکل الفاظ سے پرہیز کیا اور روزمرہ محاوروں و کہاوتوں کا برملا استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر رؤف خیر نے فرمایا کہ جناب حامد مغل سہل ممتنع کے شاعر تھے بلکہ بیشتر غزل، مسلسل سے اپنا ہنر دکھاتے تھے۔

پریس ریلیز: شاہد صدیقی علیگ، حیدر آباد، 12 اگست 2024

نصاب جمیل

میل وشارم: 8 اگست 2024 کو شعبۂ اردو، سی عبدالحکیم کالج، میل وشارم، تامل ناڈو میں میں نصاب جمیل کا رسم اجرا جناب ایس زیڈ ابرار احمد، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، اور ڈاکٹر ایس اے ساجد احمد نے انجام دیا۔

کرسپانڈنٹ جناب ایس زیڈ ابرار احمد نے کہا کہ نصابِ جمیل کی اشاعت سے نصابی ضرورت کی بروقت تکمیل ہوئی ہے۔ یہ نصابی کتاب نہ صرف معیاری ہے بلکہ اس میں اردو شعر و ادب کے اہم اصناف کے

علاوہ قواعد بھی شاملِ نصاب ہیں۔ انھوں نے اس امر پر اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ اس نصابِ جمیل کو پروفیسر ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، سابق صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی، چینائی اور ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ آرٹس کالج، کڈپہ دونوں نے بالاستیعاب اور بغور اس کتاب کو دیکھا ہے اور ان کی تجاویز اس کتاب میں شامل ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ بھی ان دونوں کا لکھا ہوا ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایس اے ساجد نے رسم اجرا پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر ایس محمد یاسر اور ڈاکٹر ایس محمد مدثر نیز ان کے معاون جناب سی فیضان احمد کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک معیاری اور شاندار نصابی کتاب بنام 'نصابِ جمیل' کی بروقت اشاعت قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ اس بہترین نصابی کتاب سے دوسرے کلیات اور جامعات بھی استفادہ کریں گے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد یاسر کے شکریے پر اس رسمِ اجرا کی کارروائی کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد یاسر، میل وشارم، 9 اگست 2024

طالب رامپوری: دانشوروں کی نظر میں

نئی دھلی: ادیب، صحافی اور شاعر طالب رامپوری کی ادبی اور صحافتی خدمات پر حال ہی میں ایم رئیس فاروقی ایڈووکیٹ کی مرتب کردہ کتاب 'طالب رامپوری: دانشوروں کی نظر میں' منظر عام پر آئی ہے۔ گزشتہ روز طالب رامپوری کے ایک شاگرد سریندر صفر نے لکشمی نگر میں اس کتاب کی اشاعت پر ایک تہنیتی پروگرام کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے آغاز میں شاعرہ سپنا احساس نے طالب رامپوری پر لکھا ہوا اپنا تاثراتی مضمون پڑھ کر سنایا۔ شاعر اور صحافی جاوید قمر نے طالب رامپوری کی ادبی اور صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ طالب رامپوری ایک اعلیٰ شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہترین صحافی بھی ہیں۔ نئے شعرا کی انھوں نے ہمیشہ رہنمائی کی ہے۔ شاعرہ ڈاکٹر انا دہلوی نے کہا کہ طالب رامپوری ایک صاحب طرز شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انسان بھی ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی شعر و ادب اور صحافت کی خدمت میں صرف کردی۔ معروف شاعر ضمیر ہاپوڑی نے کہا کہ طالب صاحب ایک استاذ شاعر ہیں اور ہم جیسے بہت سے شعرا کو ان سے شعرگوئی کی تحریک ملی۔ اس موقعے پر ضمیر ہاپوڑی کی نظامت میں ایک مختصر شعری محفل منعقد ہوئی جس میں شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 ستمبر 2024

کوئی ایک لمحہ رقم نہیں، احتجاج لفظوں کا

رانچی: انجمن فروغ اردو کے زیر اہتمام 31 اگست

2024 بروز سنیچر بمقام مسجد جعفریہ ہال و کرانت چوک رانچی میں جھارکھنڈ کے مشہور و معروف شاعر جناب دلشاد نظمی کی دو کتابوں 'کوئی ایک لمحہ رقم نہیں' (غزلیات) اور 'احتجاج لفظوں کا' (نظمیں) کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ سب سے پہلے معصومہ پروین نے دلشاد صاحب کی کتاب 'کوئی ایک لمحہ رقم نہیں' پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد شگوفہ تہذیب نے دلشاد نظمی کی غزلوں کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی۔ ڈاکٹر شاما پرساد مکھرجی یونیورسٹی کے طالب علم ابرار عالم نے دلشاد نظمی کی نظموں کے حوالے سے اپنی باتیں رکھیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالباسط شعبۂ اردو گوسنر کالج رانچی نے دلشاد نظمی کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے مفصل گفتگو فرمائی۔ جناب تکمل حسین نے دلشاد صاحب کی شاعری کے حوالے سے کہا کہ ان کو شاعری کی ہر صنف پر قدرت حاصل ہے۔ وہ لفظوں سے کھیلنے کا ہنر خوب جانتے ہیں اور ان کی شخصیت کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک شریف النفس شہسوار ادب اور فکر و فن کے جانباز مجاہد ہیں۔ جو ابھی بھی اپنی منزل مقصود کی تلاش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ رانچی شہر کے مشہور ناظم جناب سہیل سعید نے اپنے خطاب میں کہا کہ ادب کی ترویج و ترقی میں منافقت کا کوئی دخل نہیں۔ ڈاکٹر محفوظ عالم نے نظموں کے حوالے سے اپنی باتیں رکھتے ہوئے کہا کہ نظم گوئی میں دلشاد نظمی نے عصری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جدید اسلوب سے شعری پینٹنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو کے مخلص خادم وچھم اڈیشہ کے صدر عبدالودود اجنبی نے خطاب میں کہا کہ علم و عمل کی اہمیت کے حوالے سے اردو کی پرخلوص خدمت کرنے کی تلقین کی۔ پروگرام کی صدارت جناب سمیع آزاد نے فرمائی، صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ہم سب کو آگے آنا ہے اور دلشاد نظمی جیسے شعرا کی حوصلہ افزائی کی اشد ضرورت ہے۔ آخر میں دلشاد نظمی نے تمام معزز شرکا کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، یکم ستمبر 2024

روشن ستارے

نئی دھلی: 78 ویں یوم آزادی کے موقعے پر معروف ادیب و صحافی حبیب سیفی کی 12 ویں تصنیف اور ادبِ اطفال پر باقاعدہ چھٹی کتاب 'روشن ستارے' بچوں کے

لیے شاعری کی رسم رونمائی اور مذاکرے کی تقریب 14 اگست کو J4/68C کھڑکی ایکسٹینشن جنوبی دہلی میں منعقد ہوئی۔ مہمان خصوصی آئی پی ایس و سابق (ڈی جی پی) محمد وزیر عالم انصاری چھتیس گڑھ رہے۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر محمد معین الدین خان اسسٹنٹ پروفیسر ذاکر حسین دلی کالج دہلی اور بچوں کے ادیب محمد سراج عظیم تھے۔ فیروز احمد صدیقی رکن دہلی اردو اکادمی ایگزیکٹیو ممبر دہلی سرکار کے ذریعے مہمانوں کا خیر مقدم ہوا۔ تقریب میں شامل ہوئے مہمانان، مصنف حبیب سیفی، انصاری اطہر حسین ایڈیٹر صدائے انصاری، شاعر ہدایت حسین بدایونی، میزبان فیروز احمد صدیقی کے ہاتھوں 'روشن ستارے' کتاب کی رسم رونمائی عمل میں آئی۔ آئی پی ایس ایم ڈبلیو انصاری نے فرمایا کہ اس کتاب میں شہیدان وطن اور رہنمائے وطن کا تذکرہ منظوم کیا گیا ہے، یہ کام لائق ستائش ہے، اس کتاب کو دیوناگری رسم الخط میں بھی لائے جانے کی ضرورت ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر محمد معین الدین خان نے کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا میں امید کرتا ہوں کہ سرکاری، و نیم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے، جن کی زیر نگرانی نصاب تعلیم وضع کیا جا رہا ہے وہ حبیب سیفی کی بعض تخلیقات کو نیشنل ایجوکیشن پالیسی کے تحت جدید نصاب میں شامل کریں گے۔ محمد سراج عظیم، انصاری اطہر حسین اور ہدایت حسین بدایونی نے بھی اظہار خیال کیا۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 20 اگست 2024

اے مرے ابو

مئو: بچوں کے لیے مکالماتی انداز میں بہترین نظموں کا خوبصورت مجموعہ 'اے مرے ابو!' کی تقریب رونمائی

22 اگست 2024 بروز جمعرات بعد نماز مغرب جناب سمیع اللہ کے گھر پہ منعقد ہوئی، جس میں علمائے کرام اور شعرائے عظام نے کتاب کی رونمائی کر کے اس کا اجرا کیا۔ 'اے مرے ابو!' کتاب مولانا انصار احمد معروفی کی پندرہویں تصنیف ہے۔ اس کتاب کی تمام 63 نظمیں 'اے مرے ابو!' جملہ سے شروع ہوتی ہیں، اس پروگرام میں کتاب کے مصنف انصار احمد معروفی نے کتاب کے تعارف میں بتایا کہ بچوں میں سوال کرنے اور جواب معلوم کرنے کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ مختلف چیزوں کی حقیقت جاننے کے لیے بے چین رہتے ہیں، والدین سے طرح طرح کا سوال کرتے ہیں اور جواب ملنے پر پھر دوسرا سوال شروع کر دیتے ہیں، بچوں کی اسی نفسیات کی بھرپور عکاسی اس کتاب میں کی گئی ہے اور مختلف قسم کے سوال قائم کر کے ان کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے یہ کتاب بچوں کے لیے بہت دلچسپ اور پرکشش بن گئی ہے۔ مولانا انصار احمد معروفی نے وضاحت کی کہ اس سے پہلے اسی انداز کی ایک کتاب 'اے مری امی!' 2022 میں میری شائع ہو چکی ہے جسے بچوں نے بہت پسند کیا تھا۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے مولانا نوشاد احمد قاسمی نے کہا کہ مولانا کی جملہ کتابیں بچوں کی فہم اور شعور کے مطابق ہوا کرتی ہیں جن میں آسان جملے اور خوبصورت تعبیر کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تنوع بھی ہوتا ہے، ندرت بیان اور خوبصورت شاعری کی وجہ سے بچے انھیں بہت پسند کرتے ہیں اور بھائی بہنیں سب سے پہلے مطالعے کے لیے آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں۔ مولانا اسعد الاعظمی ریسرچ سعودی عرب سفارت خانہ نئی دہلی نے موبائل کے اس دور میں کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ بچوں میں کتابوں کے مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے، انھوں نے کہا کہ مولانا انصار احمد معروفی کی اس کے پہلے بچوں کے لیے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے سات عدد کتابیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔ اب اس نئی کتاب کی اشاعت پر ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

انصار احمد معروفی، مئو 23 اگست 2024

شہابِ معرفت

گلبرگہ: ڈاکٹر غضنفر اقبال نے کتاب شہاب معرفت تحقیقی نقطہ نظر، عرق ریزی اور سلیقے سے قلم بند کی ہے۔ اس خیال کا اظہار پروفیسر حمید سہروردی نے ڈاکٹر غضنفر اقبال

کی 23 ویں تصنیف شہاب معرفت: حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی رسم اجرا انجام دینے کے بعد کیا۔ تقریب رسم اجرا محبان اردو تنظیم برائے فروغ اردو زبان و ادب گلبرگہ کے زیر اہتمام 25 اگست 2024 کو منعقد کی گئی تھی۔ پروفیسر حمید سہروردی نے اپنی تقریر میں کہا کہ انھیں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے نسبت کے سبب اردو ادب میں عزت افزائی نصیب ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت شہاب الدین سہروردی دین اسلام کے شہاب ثاقب تھے۔ ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین (صدر، محبان اردو گلبرگہ) نے صدارتی تقریر میں کہا کتاب شہاب معرفت کو غضنفر اقبال نے محنت لگن و خلوص سے تحریر کیا ہے۔

تقریبِ اجرا کے مہمان عالی وقار مولانا محمد تنویر احمد اشرفی نے کہا کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کا فیضان پوری دنیا میں تا قیامت جاری رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر اقبال کی کتاب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی حیات اور خدمات پر تحریر کردہ ایک دل نشیں اور قابل مطالعہ تصنیف ہے۔ جس میں مصنف نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے اوراق حیات کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مولانا تنویر احمد اشرفی نے کہا کہ کتاب کے مطالعے سے علم ہوا کہ حضرت سہروردی صاحب کرامات بزرگ تھے اور اتباع سنت نبویؐ کے پابند تھے۔ مولانا شاہ محمد فخر الدین مانیال نے اس پرمسرت موقعے پر تقریر کرتے ہوئے کہا غضنفر اقبال نے عظیم صوفی بزرگ کے علمی کارناموں پر نہایت جامع اور کارآمد کتاب تصنیف کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ حضرت شیخ شہاب الدین کی حیات کا کوئی بھی پہلو اس کتاب میں تشنہ نہیں ہے۔ مولانا محمد

فخرالدین مانیال نے کہا کہ غضنفر اقبال کا قلم عصر حاضر کی ضرورت کو پورا کرتا ہے ان کی کتاب روحانی ارتقا کی ضامن ہے۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں تقریب کے مہمانان اور محبان اردو کے ارباب مجاز سے اظہار تشکر کیا اور کتاب کے مشمولات پر روشنی ڈالی۔ جناب خواجہ پاشاہ انعام دار (نائب صدر) نے مہمانان کا خیر مقدم کیا۔ نظامت کے فرائض انجینئر عارف مرزا نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر انیس صدیقی (معتمد) نے افتتاحی تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر شمس الدین چودھری کے اظہار تشکر پر یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ سہروردی شناس حضرات کی کثیر تعداد نے اس تقریب میں شرکت کی اور ڈاکٹر غضنفر اقبال کو مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر غضنفر اقبال، گلبرگہ، 26 اگست 2024

وفیات

رئیس نقوی

لکھنؤ: مختصر علالت کے بعد 78 برس کی عمر میں رئیس حسین نقوی کا ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ انھیں برین ہیمریج ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ کوما میں چلے گئے تھے۔ چار روز کوما میں رہنے کے بعد وہ دارفانی سے داربقا کی جانب کوچ کر گئے۔ ان کے پسماندگان میں دو دختران اور دو فرزند ہیں۔ انھیں تال کٹورہ کی کربلا میں ان کے والد کی ہی قبر میں سپرد خاک کیا گیا۔

رئیس حسین نقوی لکھنؤ کے ان باقی ماندہ چند ادبی سرمایہ داروں میں شامل تھے۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو علم و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ رئیس حسین نقوی ایک ایسے فنکار تھے جن کی اکتسابی تعلیم نصابی تعلیم سے کہیں زیادہ تھی۔ ان کی قلمی اور ادبی لیاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ نصابی تعلیم حاصل کرنے والے اردو کے بڑے بڑے اسکالرز اور ادیب ان سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔ ملک اور بیرون ملک کے موقر ادبی رسائل و جرائد میں ان کے سیکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ 'مضامین رئیس' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 اگست 2024

عبدالرشید اگوان

نئی دہلی: معروف مفکر، مصنف، اور سماجی کارکن عبدالرشید اگوان کا ان کے آبائی وطن راجستھان میں انتقال ہوگیا۔ نوجوانوں کو بااختیار بنانے، تعلیم اور سماجی اصلاحات کے لیے اپنی غیر متزلزل وابستگی کے لیے انھیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انھوں نے ان گنت زندگیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

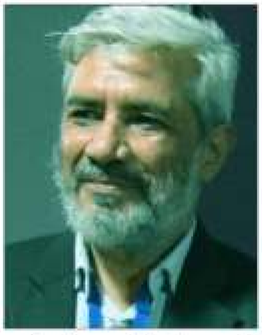

راجستھان میں پیدا ہوئے اگوان نے طویل عرصے تک دہلی کو اپنا مسکن بنائے رکھا، انھوں نے اپنی پوری زندگی تعلیم، ماحولیاتی بیداری، اور بین مذہبی ہم آہنگی کو فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ علمی ورثے کے طور پر انھوں نے ایک درجن سے زائد کتابیں، متعدد تحقیقی مقالے اور مضامین چھوڑے ہیں ان کا ناول، شاکا، گزشتہ ہفتے ہی دہلی میں ریلیز ہوا، جو ایک طویل اور پر اثر کیریئر میں ان کی آخری کامیابیوں میں سے ایک ہے۔ عبدالرشید اگوان علمی اور سماجی شعبوں میں اثر و رسوخ کے متعدد عہدوں پر فائز رہے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اینڈ ایڈوکیسی کے صدر رہے اور آل انڈیا ایجوکیشنل موومنٹ کے سکریٹری کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اگست 2024

اے جی نورانی

ممبئی: ملک کے بہترین ماہرین قانون میں شمار ہونے والے آئین سپریم کورٹ کے سینئر وکیل، سیاسی مبصر، اور متعدد مقبول کتابوں کے مصنف عبدالغفور مجید نورانی جو ملک میں اے جی نورانی کے طور پر معروف تھے۔ 93 برس کی عمر میں ممبئی میں واقع اپنی رہائش گاہ پر ان کا انتقال ہوگیا۔ ایڈوکیٹ اے جی نورانی کی ولادت 16 ستمبر 1930 کو اس وقت کے بامبے میں ہوئی تھی۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ میریز اسکول اور پھر قانون کی تعلیم گورنمنٹ لا کالج سے حاصل کی۔ وہ انتہائی ذہین طالب علم تھے۔ انھوں نے بامبے ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ دونوں عدالتوں میں بطور وکیل پریکٹس کی اور کئی اہم کیسز کامیابی سے لڑے۔

1960 کی دہائی کی ابتدا میں انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا اور ان کی تصنیف شدہ کتابوں میں 'کشمیر کا سوال، بدرالدین طیب جی، منسٹرس مسکنڈکٹ، بھگت سنگھ کا مقدمہ، ہندوستان میں آئینی سوالات و دیگر کتابیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انقلاب کے ساتھ ساتھ کئی ممتاز انگریزی اخبارات کے لیے کالم بھی لکھا کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اگست 2024

انور انصاری

مرادآباد: سینئر سماجی خدمت گار اردو صحافی انور انصاری کا حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔

ان کے انتقال کی خبر سے ان کے عزیز و اقارب میں رنج و غم چھا گیا۔ رات میں ہی لوگ ان کے گھر محلہ کچا باغ میں پہنچنا شروع ہوگئے اور اظہار افسوس کرتے ہوئے مرحوم کے لیے مغفرت اور ان کے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی۔ مرحوم کی نماز جنازہ کچا باغ کی مسجد میں عمل میں آئی اور تدفین کچہری والے قبرستان میں ہوئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 اگست 2024

3:00 PM
2024

TRUST, INDIA

00 PM
2024
TRUST, INDIA

उर्दू दुनिया, मासिक, अकतूबर-२०२४,वर्ष:२६, अंक:१०
URDU DUNIYA Monthly, October-2024, Vol.26, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/09/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6